ایڈونچر اور پُراسرار واقعات پر مبنی شاہکار ناقابل فراموش کہانیاں
مقدس نشان
ایم اے راحت
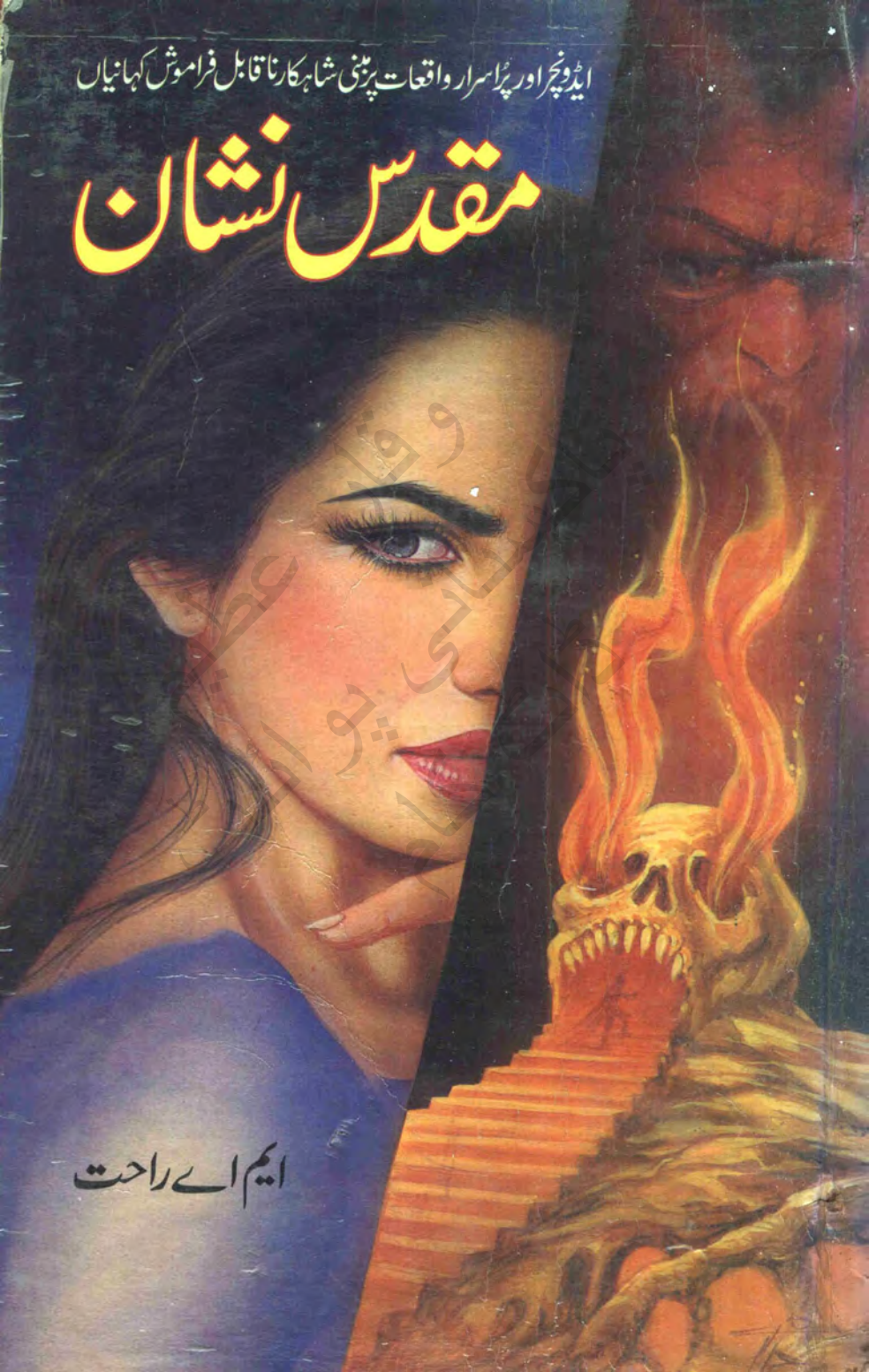
فہرست

آثارِ قدیمہ کی کھدائی کرنے والی فرم نے جب مصر میں اپنے کام کا آغاز کیا تو اسے قطعاً مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ فرم کے مالک پرنس علی رضا کی دولت نے اور تاریخ مصر پر عبور رکھنے والے دو بہترین دماغوں نے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر تمام رکاوٹوں کو دور کردیا۔ پرنس علی رضا ایک سرمایہ دار تھا جس کا منشاء آثارِ قدیمہ کے ان نوادرات سے دولت کمانا تھا' لیکن پروفیسر شہباز اور پروفیسر صمد بخاری کے پیش نظر یہ بات نہیں تھی انہیں ان اشیاء کے منہ مانگے دام ملنے یا انہیں کسی عجائب گھر کو تحفے میں دیئے جانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' وہ تو فراعنہ مصر کے بارے میں دنیا کی نامکمل معلومات کو مکمل کرنا چاہتے تھے اور ان کی یکے بعد دیگرے جانشینی کے درمیان گم گشتہ کڑیوں کو ملانے کے لئے کوشاں تھے' صدیوں کے ساتھ ساتھ بہت سارے بادشاہوں اور شہزادوں کی ممیاں مقبروں سے غائب ہوگئی تھیں' یا افتادِ زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہوگئی تھیں تاہم اب بھی بہت ساری ممیوں کے ملنے کا امکان تھا جنہیں دریافت نہیں کیا گیا تھا۔

شاہ شخرے شیرتائی کا جسد خاکی جس کی لاش کو کفن چوروں نے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ تھتموس چہارم بھی لاپتہ تھا اور اسی طرح بچپن میں ہی بادشاہ بننے والے طوطن فالن کی ممی بھی عجائب خانوں میں موجود نہیں تھی۔ مقبروں کی لامتناہی تلاش' سورج کی جھلسا دینے والی تپش اور اندرونی زہریلی ہوا۔ بڑی جان جوکھوں کی باتیں تھیں۔ کوئی سرپھرا ہی ان کاموں میں ہاتھ ڈال سکتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پروفیسر شہباز اور صمد بخاری دونوں ہی سرپھرے تھے۔

پروفیسر شہباز نے اپنی لڑکی روشی کو اپنا معاون بنا رکھا تھا اور پروفیسر صمد بخاری نے کیمرج سے فارغ التحصیل ایک اولوالعزم نوجوان کو جس کا نام علی اصغر تھا اپنا ساتھی بنالیا تھا۔ اس ٹیم نے پرنس رضا کو بڑا آرام دے رکھا تھا اور اب پرنس کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ ان لوگوں کے اخراجات اور دیگر معاملات کا خیال رکھے۔

یہ چاروں افراد پرنس علی رضا کے احسان مند تھے' وہ اس کے شکر گزار تھے' کیونکہ

چاروں ہی کو عجائبات سے دلچسپی تھی جبکہ پرنس علی رضا کے لئے موسم کی سختیاں برداشت کرنا ممکن نہیں تھا' وہ بہت کم وہاں آتا تھا جہاں آثارِ قدیمہ کی کھدائی کا کام ہو رہا تھا اور اگر کبھی آ بھی جاتا تو فوراً ہی قاہرہ کی پُرسکون اور طمانیت بخش ہواؤں میں لوٹ جاتا تھا۔

دس ماہ کی شدید جفاکشی کے بعد اس ٹیم کو زیر زمین پتھر کا ایک زینہ نظر آیا جو یقیناً دوسرے متلاشی مہم بازوں کی نظر سے اوجھل رہا تھا۔ پروفیسر شہباز اور صمد بخاری یہی توقع کرتے رہے کہ یہ کوئی نیا مقبرہ ہے' لیکن جوں جوں وہ کھدائی کرتے گئے ان پر ایک غیر متوقع انکشاف ہوتا گیا کہ یہ کوئی عام مقبرہ نہیں ہے' بلکہ کسی عظیم تاریخی شخصیت کا مدفن ہے۔

آٹھ ہفتوں کی کھدائی کے بعد انہیں ایک بہت بڑا دروازہ نظر آیا اور جب وہ اس میں داخل ہوئے تو وہاں گمشدہ صدیوں کی فضا ان کی منتظر تھی۔ سیلن زدہ ماحول' بوجھل ہوا اور گھٹن سے ان کا دم گھٹا جا رہا تھا لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ان کے حوصلے بہت بلند تھے' وہ ہر قیمت پر فراعنہ کے گمشدہ شہزادوں کو ڈھونڈنا چاہتے تھے۔

مقبرے میں مدفون فرماں روا کے استعمال کی اشیاء قیمتی پوشاکیں' اسلحہ' اجناس' نشست و برخاست کی جڑاؤ چیزیں اور زیورات سب ہی کچھ تھا' چاروں طرف زر و جواہر بکھرے پڑے تھے' دیواروں' کونوں کھدروں اور فرش پر ان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ پروفیسر شہباز اور پروفیسر صمد بخاری یہ سب کچھ دیکھ کر سکتے میں رہ گئے پھر ان کی فطری صلاحیت عود کر آئی اور وہ ان زیورات کی مدد سے تاریخ کی گمشدہ کڑیاں جوڑنے بیٹھ گئے۔

البتہ روشی اپنے حواس پر پوری طرح قابو نہیں پاسکی تھی' جب مقبرے کا اندرونی دروازہ کھلا تھا تو وہ باپ کے پیچھے کھڑی تھی اور اس دم اسے وہاں سے بھاگ نکلنے کا شدید احساس ہوا جیسے اس سے کوئی کچھ کہنا چاہ رہا ہو اور وہ ان الفاظ کو سننا نہیں چاہتی تھی۔

کسی شدید خطرے کا احساس اس کے ذہن پر چھا گیا اور اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا کہ وہ لوگ ان چیزوں کی طرف پیٹھ کئے ہوئے فوراً اس جگہ سے نکل جائیں۔ تاہم باپ کی تربیت نہایت پختہ تھی اور وہ اپنے حواس کو قابو میں کر کے بھاگ نکلنے کی خواہش کو دبا گئی۔ اس روشنی میں جو اس مقبرے میں شاید صدیوں کے بعد کی گئی تھی وہ بڑی بے چینی سے وہیں کھڑی ہوئی اندر پھیلی ہوئی بے نام بو کو' مٹی کی دبیز تہہ کو اور پُراسرار سکوت کو برداشت کرتی رہی اور اسے خیال آ رہا تھا کہ وہ ان اذیت ناک لمحات کو زندگی بھر نہ بھلا

سکے گی اور مزید یہ کہ ان مقبروں میں داخل ہونے والے اپنے ساتھ کوئی ایسا مرض لے کر لوٹیں گے جو لاعلاج ہوگا۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ تینوں آدمی بڑے انہماک سے اشیاء کی فہرست تیار کر رہے تھے لیکن روشی اس طرح کی یکسوئی سے کوسوں دور تھی۔ شدید گرمی میں بھی وہ اپنے جسم میں کپکپاہٹ محسوس کر رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی تپش یا ممی کا انتقام اسے جلا کر خاکستر کر دے گا اور اس کی راکھ صحرا کے بگولوں کے ساتھ اڑا دے گا۔ اس نے بڑی ہمت کر کے اپنے باپ سے کہا کہ وہ اس جگہ سے نکل چلے لیکن اس نے دیکھا کہ پروفیسر شہباز کو اس کی اس بات سے مایوسی ہوئی تھی اسے اپنی لڑکی پر ہمیشہ سے بھرپور اعتماد رہا تھا اور اس نے اس کی صلاحیتوں پر تکیہ کر رکھا تھا وہ اس کی ذہین و فطین شاگرد تھی اور اب ایک پریشان حال سی عورت بن کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔

شہباز نے اسے وہاں سے ہٹا دیا اور جا کر اس غار میں بیٹھنے کو کہا جسے عارضی ہیڈ کوارٹر بنایا گیا تھا اس کی جگہ ان کا ریکارڈ رکھا تھا اور روشی بڑی عمدگی سے اسے سنبھال سکتی تھی چنانچہ وہ فائلوں اور کاغذوں کو درست کرنے لگی۔ شروع شروع میں جب کھدائی جاری تھی تو اسے یہ جگہ بڑی رومینٹک لگی تھی اور اب مقبرہ کھل جانے کے بعد اسے کاٹنے کو دوڑ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد علی اصغر مٹی میں اَٹے ہوئے ہاتھ پاؤں دھو کر اس کے پاس آیا تو روشی نے اس سے پوچھا کہ وقت کیا ہوا ہے۔ یہ سوال وہ اس سے کئی بار پوچھ چکی تھی۔ علی اصغر نے ایک مصنوعی ٹھنڈی آہ بھر کے جیب سے گھڑی نکالی اور بتایا۔

"پچھلے وقت سے ٹھیک دس منٹ اوپر ہوئے ہیں۔"

"معاف کرنا۔" روشی جھینپ کر بولی۔ اور بات بنانے کے لئے کہنے لگی کہ اس کا باپ اور صمد بخاری ابھی تک لوٹے کیوں نہیں ہیں۔

"ہو سکتا ہے پروفیسر کے ہاتھ کوئی خاص چیز لگی ہو۔" علی اصغر نے سرسری طور پر کہا۔

"ہاں وہ کام میں کھوئے ہوئے ہوں گے۔" روشی نے کہا اور ہنس پڑی۔ وہ دل کھول کر ہنسنا چاہتی تھی۔ ماحول کو پھر اسی لطیف شگفتہ رنگ میں دیکھنا چاہتی تھی۔

گزشتہ بارہ مہینوں میں ایک ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے انہیں اب یہ بات طے شدہ لگتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ روشی کو معلوم تھا کہ علی اور

اس کی شادی سے اس کے باپ کو بے حد خوشی ہوگی اور انکل صمد کی طرف سے بھی مبارک باد ملے گی اسے علی بہت پسند تھا۔ دونوں کی طبیعتیں ملتی تھیں اور زندگی گزارنے کے بارے میں بھی ان کے خیالات یکساں تھے۔ علی پر اعتبار کیا جاسکتا تھا اس میں تخلیقی صلاحیتیں تھیں اس کا ساتھ دل میں امنگیں اور ولولے پیدا کرسکتا تھا اور ایک دن شہرت اس کے قدم چومے گی اسے پورا یقین تھا۔

غار سے باہر اچانک ڈھول اڑنے لگی اور مقامی لوگوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی جسے انکل صمد کی آواز نے بند کرادیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غار میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ کچھ شکستہ سا بیدم سا دکھائی دیتا تھا اس کے چہرے پر مردنی دیکھ کر روشی چونکی اور اس کے قریب آنے سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"روشی۔ میری بیٹی۔" انکل صمد نے کچھ کہنا چاہا۔

"میرے ابو کہاں ہیں؟" روشی جلدی سے بول پڑی۔

انکل صمد ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت ناصر جمال جو حکومتِ مصر کا نمائندہ تھا اور کام کے آغاز سے ان لوگوں کے ساتھ تھا' اندر داخل ہوا اس کے پیچھے دو قلی اسٹریچر اٹھائے ہوئے آئے۔ روشی کو اسٹریچر پر پڑے ہوئے شخص کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا اسے یہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی وہ جان چکی تھی۔

دونوں قلی غار کے وسط میں پہنچ کر رک گئے اور جیسے پہلے سے طے شدہ ہو۔ انہوں نے اسٹریچر کو زمین پر پٹخ دیا۔ پروفیسر شہباز کے چہرے پر پڑا ہوا کپڑا ہٹ گیا علی نے آگے بڑھ کر سامنے والے قلی کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا اور زمین پر گر پڑا۔

"علی!" بخاری نے اس کا بازو تھام کر کہا۔

"اس نے جان بوجھ کر اسٹریچر کو گرایا ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے۔" علی نے غصے سے آگ بگولہ ہو کر کہا۔ ناصر جمال آگے بڑھ کر کہنے لگا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے مرنے والوں کی بے حرمتی ہمارا شیوہ نہیں ہے۔"

"میں تمہارے سارے طور طریقے جانتا ہوں۔" علی گرجا۔ "حالیہ چند مہینوں میں میں نے ان کے کئی مظاہرے دیکھے ہیں۔ ہمارے اسٹور سے چیزوں کی چوری ہمارے مزدوروں کو کام چھوڑنے پر اکسانا۔" اس کا پارہ چڑھتا گیا۔ "پہلے تم ہمارے ممنون تھے ہمارے پاس خرچ کرنے کے لئے پیسہ تھا اور تم اپنے ہاتھ رنگ کر خوش تھے پھر ہم نے

راغشیف کا مقبرہ دریافت کرلیا اور تم نے اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کرلیا اور اب۔" اس نے پروفیسر کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے پروفیسر کے ساتھ یہ کیا۔ تم ہمیں خوفزدہ کرکے یہاں سے بھگانا چاہتے ہو یہی بات ہے نا۔"

"ایسے الزامات لگانے کی آپ کو جرأت کیسے ہوئی میری حکومت اور میں نے آپ لوگوں سے ہر ممکن تعاون کیا ہے۔" ناصر جمالی نے ترکی بہ ترکی کہا۔

"تم نے ہمیں کوئی سہولت نہیں پہنچائی۔" علی بولا۔

"حضرات حضرات۔" صمد بخاری نے مداخلت کی۔ "پروفیسر کی یاد کو تازہ رکھنے کا یہ کوئی طریقہ نہیں ہے" اس نے قلیوں کو اسٹریچر اٹھانے کا اشارہ کیا اور وہ سہمی سہمی نظروں سے علی کو دیکھتے ہوئے اسٹریچر اٹھا کر غاروں کے اندرونی حصے میں لے گئے اس تمام عرصے میں روشی بت بنی کھڑی رہی۔

"میں آپ سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اپنے الفاظ واپس لے لیں۔" ناصر جمالی نے کہا۔

"ہم کل اپنا کیمپ اٹھا رہے ہیں۔" پروفیسر صمد بخاری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ہم قاہرہ واپس جارہے ہیں۔" وہ ناصر جمالی کی طرف گھوم کر اس سے بولا۔

"لیکن ابھی یہاں آپ کا کام ختم نہیں ہوا۔"

"نوادرات اور اپنے تحفظ کے لئے ہم باقی کام شہر جاکر کریں گے۔" صمد بخاری نے جواب دیا۔ علی غرا کر بولا۔

"ایسا لگتا ہے تمہارے حربے کارگر ہوئے ہیں ناصر جمالی' ہم اپنا بوریا بستر سمیٹیں گے اور بھاگ کھڑے ہوں گے۔"

"تم بھاگ کر نہیں جاسکتے۔" ناصر جمالی نے زیر لب کہا اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "ممی کے مقبرے کے عذاب سے چھٹکارہ ممکن نہیں ہے۔" ایک سرد لہر روشی کے رگ وپے میں دوڑ گئی۔ وہ واہمہ بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندگیا جو متعدد لوگوں کی زبان پر تھا۔ فراعنہ مصر نے اپنی قبروں کو اندر سے موم لاکھ یا کسی دھات کے ذریعہ نہیں بلکہ اپنی تباہ کن دائمی پوشیدہ طاقت سے بند کر رکھا ہے یہی بات اس نے مقبرے میں داخل ہوتے وقت محسوس کی تھی۔

"بکواس مت کرو ناصر جمالی۔" علی نے اسے ڈانٹا۔

"موت ہمارا مقدر بن چکی ہے۔" ناصر جمالی نے سر یوں جھکا لیا جیسے دعا مانگ رہا ہو۔ "میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہوں' کیونکہ میں آپ کے ساتھ ملوث رہا۔ ہمیں

قبروں کی بے حرمتی کی سزا ہلاکت کی شکل میں ملے گی۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ ان قصے کہانیوں سے میری آنکھوں میں دھول جھونکو گے تو......."

"یہ دھول نہیں ہے جس نے آپ کو دیکھنے سے محروم رکھا ہے بلکہ اس کی وجہ آپ کا اندھا پن ہے۔" علی اصغر نے دھیمی آواز میں کہا۔ پھر بولا۔

"راغشیف کا مقبرہ کوئی عذاب نہیں دے سکتا جمالی۔ اس میں ایک بادشاہ کی ہڈیوں اور اس کے سازو سامان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس دریافت سے فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے نقصان نہیں۔"

روشی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باپ کی لاش کے پاس آگئی اور اس پر جھک گئی پھر اس نے ایک بھیانک چیخ مار دی۔ پروفیسر شہباز کا ایک بازو اسٹریچر پر پھیلا ہوا تھا دوسرا بازو اس کے سینے پر رکھا تھا اور لاش کے قریب ہی ایک کٹا ہوا بازو اور خنجر جس پر خون جم گیا تھا قریب قریب پڑے ہوئے تھے۔

روشی کی چیخ سن کر صمد بخاری دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اسے پیچھے سے تھام لیا۔ علی بھی لپک کر آگیا اور اسٹریچر پر نظر پڑتے ہی بولا۔ "ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل جائیں بہتر ہے۔"

وہ ہفتہ بڑی عجلت سے انہوں نے رخصت کی تیاری میں گزارا۔ جلدی جلدی سامان کی فہرست مکمل کی ہر چیز کو چیک کیا مقبرہ کا نقشہ بنایا۔ نوادرات کا محلِ وقوع نوٹ کیا اور جگہوں کی پیائش کی تاکہ مستقبل یہ نہ کہے کہ اے آر ٹریڈرس نے کھدائی کا کام جدید اور سائنٹیفک طریقوں سے نہیں کیا تھا۔ لکڑی کی بڑی بڑی پیٹیاں پہلے ہی قاہرہ سے منگوالی گئی تھیں اور جمالی اپنی حکومت اور قاہرہ میوزیم کے حکام سے روانگی کے لئے بھاگ دوڑ کر رابطہ قائم کرتا رہا۔ اس کے بارے میں علی کا شبہ اب کچھ ہلکا پڑتا جارہا تھا۔ وہ بڑی تندہی سے ان کی روانگی میں مدد کر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ جلد از جلد ان کی پشت دیکھنا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ قاہرہ سے واپسی پر وہ اپنے ساتھ میوزیم کے دوسرے ملازم لے آیا جو اتنی عجلت سے ساتھ لائے جانے پر بڑبڑا رہے تھے لیکن مقبرے کی اشیاء دیکھتے ہی ان کی بڑبڑاہٹ ختم ہوگئی انہوں نے بلا تاخیر میوزیم کی طرف سے ان کے لئے ایک لاکھ پونڈ کی پیشکش کردی۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ کھدائی کے سارے اخراجات بھی پورے ہوجاتے

اور فرم کو خاصا منافع بھی ہوتا۔

اس گراں بہا پیشکش سے صمد بخاری خوش ہوگیا اور جان نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ البتہ اس نے یاد دلایا کہ سودا کرنے کا اختیار صرف پرنس علی رضا کو ہے۔

"آپ پرنس علی رضا کو آمادہ کرلیں۔" جمالی نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "پھر یہ نوادرات یہیں رہیں گے ہمارے ملک سے باہر نہیں جائیں گے۔"

"میرے خیال میں مناسب یہی ہے کہ تمہارے میوزیم میں ان کی نمائش کی جائے........." پروفیسر صمد بخاری نے کہا۔ ہاشمی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اگر ایسا ہوجائے تو عذاب دور ہوجائے گا۔" علی کے ماتھے پر بل پڑ گئے اس نے چاہا کہ جمالی کی اصل نیت کا پتا چلائے لیکن بخاری نے آنکھ کے اشارے سے منع کردیا۔

ہفتے کے آخری دو روز اشیاء چیک کرنے اور انہیں مقبرے سے نکلوانے میں گزرے اور علی خوش تھا کہ سارے نوادرات بحفاظت میدان میں پہنچا دیئے گئے تھے اور قلیوں نے کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی تھی۔ علی نے فہرست کو آخری مرتبہ چیک کیا اور اسے روشی کے حوالے کردیا کہ سنبھال کر رکھ لے۔ وہ بخاری کے ساتھ خوش گپیاں کر رہا تھا کہ جمالی نے آکر پرنس علی رضا کی آمد کی اطلاع دی' بخاری اور علی اس کی غیر متوقع آمد پر حیران رہ گئے۔

"چلو اچھا ہے اس کے سامنے سارا کام ہوجائے گا۔" بخاری نے بالآخر کہا۔

"وہ غار میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" ناصر جمالی نے کہا اور وہ دونوں پرنس علی رضا سے ملنے گئے تو روشی پہلے ہی وہاں پر پہنچ چکی تھی۔

"تمہارے لئے میں ایک چھوٹا سا تحفہ لایا ہوں۔" جب وہ غار میں داخل ہوئے تو پرنس روشی سے کہہ رہا تھا' اور اس کا تحفہ مٹھائی کی صورت میں تھا' روشی نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا کر منہ میں رکھا اسی اثناء میں پروفیسر بخاری اور علی اصغر غار میں داخل ہوگئے پرنس علی رضا نے ان دونوں کو آتے دیکھ کر کہا۔

"آپ بھی شوق کریں حضرات۔" پروفیسر صمد بخاری نے مٹھائی کا ٹکڑا چکھا اور پھر توصیف میں سر ہلانے لگا۔

"کام تو ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہے نا۔" پرنس نے پوچھا۔

"میں تمہیں ایک شاندار خبر سنانا چاہتا ہوں مسٹر علی رضا۔" صمد بخاری نے کہا۔

"وہ کیا؟" علی رضا نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے یقین ہے یہ خبر تمہارے لئے نہایت دل خوش کن ہوگی۔ ناصر جمالی ہمارے نوادرات کے لئے قاہرہ میوزیم سے بڑی زبردست رقم کی پیشکش لایا ہے' اتنی بڑی رقم ہے کہ اس سے ہمارے سارے اخراجات پورے ہوجائیں گے اور اس کے بعد بھی آپ کو زبردست منافع ہوگا۔"

"خوب بہت خوب۔ یہ رقم کتنی ہے؟"

"ایک لاکھ پونڈ۔" پروفیسر صمد بخاری نے جواب دیا اور پرنس علی رضا کا فلک شگاف قہقہہ غار میں گونج اٹھا۔

"ایک لاکھ پونڈ' تمہارا دماغ چل گیا ہے کیا۔" اس نے اپنی ہنسی روک کر کہا۔

پروفیسر بخاری کے چہرے پر تاؤ آگیا' وہ ایسی طرزِ گفتگو کا عادی نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کے لئے کپکپائے لیکن پھر وہ رک گیا۔ وہ پرنس علی رضا سے کچھ سننا چاہتا تھا۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں صمد بخاری۔" پرنس علی رضا نے شگفتگی سے کہا۔ "میں ساری دنیا میں گھوم پھر کر اس ممی اور نوادرات کی نمائش کروں گا اور اس سے آمدنی ایک لاکھ پونڈ سے زیادہ ہی ہوگی۔"

"آپ ایسا نہیں کرسکتے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ یہ ممی اور نوادرات یہیں عجائب خانہ میں جمع کرادیں۔" ناصر جمالی نے غرا کر کہا۔

"نہیں کرسکتے سے کیا مراد ہے تمہاری' آئندہ مجھ سے بات کرنی ہو تو پہلے غور کرنا مسٹر ناصر جمالی۔ سن لیا۔" پرنس علی رضا نے سردمہری سے کہا' پھر پروفیسر بخاری اور علی اصغر سے کہنے لگا۔

"تم دونوں اگر چاہو تو میرے ساتھ شامل ہوجاؤ اور پھر دیکھو کہ میں پیسہ کیسے کماتا ہوں۔"

"لیکن ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔" بخاری نے گلا صاف کر کے کہا۔

"یقیناً نہیں ہوا۔"

"اتنی اہم اور تاریخی چیزوں کا عام شو نہیں دکھایا جاسکتا۔" صمد بخاری نے کہا۔

"ہاں یہ مقدسات کی بے حرمتی ہے۔" ناصر جمالی احتجاجاً چیخا۔

"مسٹر ناصر جمالی' دولت کمانے سے کسی کی کوئی بے حرمتی نہیں ہوتی۔" پرنس علی رضا ڈھٹائی سے بولا۔

"اگر آپ کا سنجیدگی سے یہی ارادہ ہے تب اس سلسلے میں' میں اپنے اعلیٰ حکام سے بات کرنے پر مجبور ہوں۔" ناصر جمالی نے کہا۔

"تمہارا جو دل چاہے وہ کرسکتے ہو' میں نے تمہیں منع تو نہیں کیا۔" پرنس علی رضا نے جواب دیا اور ناصر جمالی اسے گھورنے لگا۔ پھر وہ پروفیسر صمد بخاری کی طرف مڑا۔

"پروفیسر بخاری' مجھے یقین ہے کہ آپ کا وقار اور ذوق آپ کو اس طرح کا کوئی کام کرنے کی اجازت نہ دے گا۔" اس نے کہا۔

"مسٹر ناصر' پروفیسر بخاری میری فرم کے لئے کام کررہے ہیں۔" پرنس علی رضا نے تنبیہاً کہا۔

"ٹھیک ہے۔" ناصر جمالی نے مایوسی سے سرہلایا اور سر جھکا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "مجھے چند اقدام کرنا پڑیں گے' اور ان کے لئے میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد پرنس علی رضا نے غرا کر کہا۔ "یہ سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں' ہمیشہ کسی نہ کسی چکر میں رہتے ہیں' وہ جو چاہتا ہے کرنے دو' آؤ ہم تفصیلات طے کرلیں۔"

"کیسی تفصیلات؟" بخاری نے پوچھا۔

"اپنی نوادرات کی نمائش کے سلسلے میں' میں نے سوچا ہے کہ ہم سب سے پہلے لندن چلیں گے۔"

"کیا تم سنجیدہ ہو پرنس۔"

"ہاں۔" پرنس علی رضا نے اطمینان سے کہا۔ "میں ان چیزوں کو ایک چھوٹے سے شہر کے میوزیم میں رکھوانے کی بجائے دنیا بھر میں ان کی نمائش کرنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں پرنس رضا۔ یہ ممکن نہیں ہے اور اگر تم اپنی اس بچکانہ خواہش پر مصر ہو تو میرے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ میں اپنی ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوجاؤں۔ میں اس کام میں شریک نہیں ہوسکتا۔" پروفیسر بخاری نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

تھوڑی دیر کے لئے غار میں سکوت چھا گیا' پرنس علی رضا کچھ دیر تک جنبش کئے بغیر بیٹھا رہا۔ پھر وہ علی اصغر کو دیکھنے لگا۔ معاً پرنس نے کہا۔

"مسٹر علی اصغر کیا تم میرا ساتھ دینا پسند کروگے؟"

علی اصغر سٹپٹا گیا' شہرت' دولت اور نمایاں مقام ساری چیزیں ذہن میں آ گئیں پھر اس کی نظر پروفیسر بخاری کی طرف اٹھی۔ اس نے اپنے ذہن میں آئی ہوئی ساری باتیں جھٹک ڈالیں۔ پروفیسر بخاری اس کا استاد تھا' اس نے رک رک کر کہا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے پروفیسر بخاری بدستور انچارج ہیں۔"

"پروفیسر بخاری تو ہمیں چھوڑ رہے ہیں علی اصغر۔" پرنس علی رضا نے کہا۔

پروفیسر بخاری تیزی سے مڑ کر بولا۔ "یہ ٹھیک ہے علی' تم نے پرنس علی رضا کی بات بھی سن لی اور میری بھی۔ میں استعفیٰ دے چکا ہوں۔"

"لیکن سر؟"

"نہیں علی' میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم اپنے بہتر مستقبل کے لئے پرنس کی پیشکش قبول کر لو۔"

"لیکن اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو اپنے فیصلے پر کیوں اڑے ہوئے ہیں؟" علی اصغر نے پوچھا۔

"بس میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے۔ البتہ تم کر سکتے ہو۔ میں تمہارے راستے میں حائل نہیں ہوں گا۔"

علی اصغر نے مشورہ طلب نظروں سے روشی کی طرف دیکھا اور روشی نے سر ہلا دیا۔

"آج رات کھانا تم لوگ میرے ساتھ کھاؤ۔" پرنس نے اس گومگو کی کیفیت کو ختم کرنے کے لئے کہا۔

علی اصغر اور روشی پرنس کے ساتھ جس جگہ کھانا کھانے گئے' وہ قریبی بستی میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ کھانا بھی بس ٹھیک ٹھاک تھا کھانے کے دوران اس نے اچانک علی اصغر سے پوچھا۔

"تم نے میرے ساتھ رہنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا؟"

"میں آپ کے ساتھ ہوں پرنس۔" الفاظ خود بخود ہی علی اصغر کے ہونٹوں سے پھسل گئے۔

"مجھے بڑی خوشی ہوئی مسٹر علی۔" روشی نے بھی بے ساختہ کہا۔ پھر وہ مستقبل کے بارے میں باتیں کرنے لگے' کچھ دیر بعد ایک آدمی بھیڑ بھاڑ میں سے راستہ بناتا ہوا علی اصغر کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا۔

"سر آپ کو آپ کا مالک بلا رہا ہے اس نے کہا ہے کہ جلدی سے آ جاؤ۔"

"اوہ' کیا پروفیسر بخاری نے؟" علی نے پوچھا۔

"جی ہاں جناب۔" اس شخص نے جواب دیا اور علی پُرخیال نگاہوں سے پرنس رضا کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ "میرا خیال ہے کہ کوئی اہم بات ہو گی پرنس' ورنہ وہ ہمیں ہرگز نہ بلاتے۔ معاف کیجئے' ہم ابھی آتے ہیں۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں علی۔" پرنس رضا نے کہا۔

غار میں پہنچ کر انہیں ایک نظر میں یہ احساس ہو گیا کہ کوئی خاص بات ہو گئی ہے' پروفیسر احمد بخاری کا چہرہ اس کی چغلی کھا رہا تھا۔

"کیا بات ہے پروفیسر!" پرنس رضا نے پوچھا۔

"یہاں کچھ لوگ آئے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ کچھ لوگوں نے یہاں خاصی دھا چوکڑی مچائی ہو' تمام چیزیں اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہیں اور' اور......"

"ہاں اور کیا؟"

"ایک لاش بھی موجود ہے لیکن یہاں سے کچھ فاصلے پر۔"

"اوہ' کس کی لاش ہے؟" پرنس علی رضا نے خوفزدہ انداز میں پوچھا۔

"شاید قلی کی۔ میرا مطلب ہے اس شخص کی جسے ہم نے یہاں پہرے پر معمور کیا تھا۔"

"کہاں ہے اس کی لاش؟" علی رضا نے سوال کیا اور علی اصغر کے اشارے پر وہ لوگ وہاں سے آگے بڑھ گئے۔ غار سے کچھ فاصلے پر ایک شخص اوندھے منہ ریت پر پڑا ہوا تھا اس کے سینے میں گھسے ہوئے خنجر کا پھل اس کی پشت سے باہر نکلا ہوا تھا اور وہاں خون کے کچھ قطرات جمے ہوئے تھے۔ علی رضا نے بوجھل نگاہوں سے اسے دیکھا اور پُرخیال انداز میں گردن ہلاتے ہوئے واپس غار کی جانب چل پڑا۔

"تمہیں اچھی طرح یقین ہے کہ غار سے کوئی چیز غائب نہیں ہوئی ہے۔"

"ہاں بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے لیکن غار میں تلاشی لینے والے کیا چاہتے تھے۔"

"ہم اس کے بجائے اس بات پر کیوں نہ غور کریں کہ اس عظیم نوادرات کے ذخیرے میں ہمارے علاوہ کوئی اور بھی بھرپور دلچسپی لے رہا ہے۔" سب لوگ پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگے تھے۔

☆------☆------☆

رات کا وقت تھا تاریک سمندر پُرسکون صحرا کی مانند بے کنار نظر آتا تھا لیکن

اس کی سطح سے ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے لطیف جھونکے اٹھ اٹھ کر جہاز کے عرشے پر پھیل رہے تھے۔ روشی محسوس کر رہی تھی جیسے وہ تاحیات اس طرح جہاز کی ریلنگ پر جھکی رہے گی اور نیچے گہرے پانی کی سرگوشیاں سنتی رہے گی۔ دور سے آرکسٹرا کی مدہم خوابناک آواز آرہی تھی' عرشے پر سکوت پھیلا ہوا تھا۔ دفعتاً اسے اپنے قریب ہی قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر علی اصغر کی آواز ابھری۔

"کتنی حسین رات ہے' تمہارا کیا خیال ہے روشی۔" روشی کو ایک لمحے کے لئے انبساط کا احساس ہوا۔ علی رضا کا قرب اسے ہمیشہ فرحت میں مبتلا کر دیتا تھا۔ وہ اس کی قربت کی خوشبو سے بہت مسحور ہو جاتی تھی۔ علی اصغر اس کے نزدیک ہی کھڑا ہو گیا اور روشی کی خوابناک آنکھیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔

"مجھے یہاں اس ماحول میں اس پُرسکون اور حسین ماحول میں ایک کمی محسوس ہو رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ کمی پوری ہو جائے۔ وہ کمی یقیناً تمہاری ہی تھی علی اصغر۔"

"شکریہ روشی۔ میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں' کیا تم یقین کرو گی کہ مجھے بھی نیچے ایک شدید سی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔" علی اصغر نے کہا اور دونوں ہنس پڑے۔

"مجھے کیبن میں پڑی ہوئی ممی کا خیال آرہا ہے۔" چند لمحات کے بعد روشی نے کہا۔

"اس کی فکر کیوں کرتی ہو اسے بڑی حفاظت سے بند کیا گیا ہے۔" علی رضا نے اسے اطمینان دلایا۔

ابھی وہ لوگ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک ہیولہ ان کی طرف آتا دکھائی دیا اس کے قدموں میں ڈگمگاہٹ تھی لیکن جب وہ قریب آیا تو انہوں نے اسے پہچان لیا۔ وہ صمد بخاری تھا۔

"کیا ہو رہا ہے بچو! کیا ہو رہا ہے؟" صمد بخاری کی لڑکھڑائی ہوئی آواز سنائی دی اور وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ عام حالات میں صمد بخاری ہوش و حواس میں رہنے والا آدمی تھا لیکن اس وقت اس کی زبان کی لڑکھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ اس نے بے تحاشہ پی لی ہے۔ وہ متحیرانہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگے۔

"میں۔ میں تم لوگوں.......... میں تم لوگوں کو اس حسین اور پُرسکون رات کی مبارکباد دیتا ہوں۔" صمد بخاری نے کہا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

"یہ۔ یہ کیا ہو گیا۔ صمد بخاری تو پینے کے عادی نہیں تھے۔"

"مجھے خود حیرت ہے لیکن بہت سے معاملات ایسے ہو رہے ہیں جن سے ہم پہلے کبھی روشناس نہیں ہوئے تھے۔ تم مصر کے پُراسرار ماحول سے متاثر نہیں ہو علی اصغر۔"

"مصر میرا پسندیدہ ترین موضوع رہا ہے۔ اہرامین اور فراعون کے مقبرے ہمیشہ میرے لئے پُراسرار و دلکش رہے ہیں یہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" علی اصغر نے جواب دیا۔ روشی پانی کی طرف دیکھنے لگی' اسے اپنے باپ کی موت کا سخت صدمہ تھا لیکن بہرطور وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی' تعجب کی بات یہ تھی کہ پروفیسر بخاری شراب کے نشے میں نظر آیا تھا ویسے علی رضا نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا ممکن ہے اس کا اس پر شدید ردعمل ہوا ہو اس سے بڑا صدمہ مصر کی حکومت کی طرف سے ملا تھا۔ صمد بخاری کو حکومتِ مصر کی طرف سے حکم ملا تھا کہ وہ آئندہ اس سرزمین پر قدم نہ رکھے اور اگر اس نے ایسا کیا تو اسے شدید نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ابھی وہ خاموش کھڑے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے کہ دفعتاً ایک دلخراش چیخ سنائی دی اور پھر یوں لگا جیسے کسی کو چیخنے سے روک دیا گیا ہو۔ یہ چیخ اگر ان کا وہم نہیں تھا تو پروفیسر بخاری ہی کی تھی۔ علی اصغر اچھل پڑا۔

"تم یہیں رکو روشی میں دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا اور اس دروازے کی طرف دوڑا جو دو کیبنوں کے درمیان راہداری میں کھلتا تھا روشی نے لحہ بھر توقف کیا اور پھر خود بھی اسی طرف دوڑ پڑی۔ شاید کسی اور نے چیخ نہیں سنی تھی کیونکہ اطراف کا ماحول بدستور پُرسکون تھا اور کہیں ہلچل نہیں تھی۔ عرشے پر صرف ایک لمبا تڑنگا آدمی ٹہل رہا تھا۔

روشی جب دروازے کے قریب پہنچی تو ایک شخص تیزی سے باہر نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ اس نے گرنے سے بچنے کے لئے اس شخص کا بازو پکڑ لیا تھا اور دوسرے لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے خنجر کی دھار چمکی' روشی نے گھبرا کر اس کا بازو چھوڑ دیا اور ساتھ ہی لڑکھڑا کر قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر گر گئی۔ وہ شخص خنجر بلند کر کے اس پر جھپٹا اسی وقت ایک دھمک سی ہوئی عرشے پر ٹہلنے والا اجنبی حملہ آور کے پیٹ میں دو زوردار گھونسے لگا چکا تھا۔

وہ چاروں شانے چت گر پڑا لیکن فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور لمبے تڑنگے شخص سے

گتھم گتھا ہوگیا۔ دونوں لڑتے ہوئے عرشے کے وسط میں پہنچ گئے تھے۔ اندھیرے میں معلوم کرنا مشکل تھا کہ کس کا پلہ بھاری ہے۔ دفعتاً روشی پر حملہ آور ہونے والا شخص چکراتا ہوا جہاز کی ریلنگ پر جاگرا اور پھر اس کے بعد سمندر میں۔ روشی کو اس مصیبت سے نجات دلانے والا اپنا لباس ٹھیک کرتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ دروازے سے آنے والی روشنی میں پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا اسے نوجوان نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن وہ درمیانی عمر کا بھی نہیں تھا چہرہ کچھ عجیب سا تھا۔ روشی اس سے خاصی مرعوب ہوئی اس نے روشی کے سامنے گردن خم کرکے کہا۔

"سوری ڈیئر۔ اس نے تم پر دہشت طاری کردی تھی۔"

"پتا نہیں۔ وہ کون تھا اور کیا چاہتا تھا۔" روشی بولی اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "علی اصغر کہاں ہے؟" ان الفاظ کے ساتھ ہی وہ راہداری میں دوڑ پڑی۔ پروفیسر بخاری کا کیبن چھٹے نمبر پر تھا اس کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور اس کی دہلیز پر علی اصغر اوندھے منہ پڑا ہوا تھا۔ جب وہ علی اصغر کے پاس پہنچی تو وہ کراہتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ روشی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ علی اصغر نے ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا اور ہاتھ سے کیبن کی طرف اشارہ کیا۔

اندر پروفیسر بخاری بھی اسی انداز میں اٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام رکھا تھا تب روشی نے بے قراری سے پوچھا۔

"اوہ ڈیئر! کیا ہوا؟ کیا ہوا؟"

"ایک آدمی نے پہلے پروفیسر بخاری اور پھر مجھ پر حملہ کردیا۔" علی اصغر نے سر کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ پروفیسر بخاری بہ دقت تمام اٹھ کر کھڑا ہوا اور آہستہ سے چلتا ہوا کیبن میں بنی ہوئی الماری کے پاس پہنچ گیا۔ اس میں سے بوتل نکالی اور اسے علی اصغر کی طرف کرکے ہلایا۔ علی اصغر نے نفی میں سرہلا دیا تھا۔

"میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں بیٹے؟" پشت سے آواز سنائی دی۔ وہی لمبا تڑنگا اجنبی سامنے کھڑا ہوا تھا۔

"میں آپ کی شکر گزار ہوں۔ جناب علی اصغر........... یہ صاحب میرے اوپر احسان کرچکے ہیں۔ مگر افسوس میں ان کا نام نہیں جانتی ہوں۔"

"تم لوگ مجھے سلاما کہہ سکتے ہو۔" اجنبی نے بتایا۔ علی اصغر نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ پروفیسر بخاری ان تمام باتوں سے بے نیاز بستر میں بیٹھا غٹاغٹ پی رہا تھا۔

"کوئی نقصان تو نہیں پہنچا آپ لوگوں کو؟" سلاما نے پوچھا۔

"نقصان۔ یہاں نقصان کی کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔" پروفیسر بخاری نے اپنی جیبیں بجاتے ہوئے کہا۔ دفعتاً علی اصغر نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس سوال سے اسے نوادرات کا خیال آگیا تھا اس کے کیبن میں ممی اور نوادرات رکھے ہوئے تھے کہیں کہیں' اس کے کیبن پر بھی تو کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ روشی نے کہا۔

"لیکن ہم اسے اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ یقیناً پروفیسر بخاری پر حملہ کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔ مسٹر خان سلاما' میں آپ کو بتاؤں کہ دراصل ہم لوگ......."

"نہیں بے بی۔ مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں' آپ لوگوں کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے۔ البتہ پروفیسر بخاری نے کوئی قیمتی چیز اپنے کیبن میں نہیں رکھی ہوگی ورنہ یہ لوگ نقصان کرجاتے۔"

"آپ کا خیال درست ہے۔ نوادرات جہاز کے سامان کے کمرے میں زبردست پہرے میں ہیں۔" علی اصغر نے صاف جھوٹ بولا تھا۔

"تمہارا کیا پروگرام ہے نوجوان دوست۔"

"کس سلسلے میں؟"

"میرا مطلب ہے کہ اب تم ان نوادرات کا کیا کروگے؟"

"ہم ان چیزوں کو لندن لے جارہے ہیں۔ ہمارے مالک مسٹر علی رضا ان کی نمائش کی ابتدا لندن سے کرنا چاہتے ہیں" علی اصغر نے جواب دیا۔

"لندن۔ واہ خوب۔ تم وہاں کہاں ٹھہروگے؟" خان سلاما نے دوسرا سوال کیا۔

روشی نے محسوس کیا کہ علی اصغر خان سلاما سے جان چھڑانا چاہ رہا ہے اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ وہ اپنے کیبن میں جاکر چیزوں کی جانچ پڑتال کرنا چاہتا تھا کہیں کوئی چیز چوری تو نہیں ہوئی اس کے بعد آرام کرنا ضروری تھا اس کے لئے روشی نے علی اصغر کی مشکل حل کرتے ہوئے دروازے کا رخ کیا تو دونوں آدمی بھی اس کے پیچھے چل پڑے۔

"وہاں مسٹر علی رضا نے کسی ہوٹل میں کمرے بک کرائے ہیں ہم لوگ وہیں قیام کریں گے۔"

"اوہ ہوٹل زیادہ بہتر نہیں ہوتے۔" خان سلاما کہنے لگا اس وقت روشی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ علی اصغر کے ماتھے پر بھی بل پڑ گئے تھے اسے اس اجنبی کی یہ بے تکلفی کچھ چبھ سی رہی تھی۔ اس نے بظاہر خود کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔

"علی رضا جس کا نام ہے وہ اس قسم کے بہت سے نوادرات کی نمائش دنیا کے مختلف ممالک میں کر چکے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ کس طرح کون سا کام بہتر ہوتا ہے۔"

"اس کے باوجود اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہیں ایک پیشکش کر سکتا ہوں میرا اکثر لندن میں قیام رہتا ہے چونکہ میں ایک کاروباری آدمی ہوں اور یورپ کے مختلف ممالک میں میرا کاروبار پھیلا ہوا ہے لندن میں بھی میرے پاس ایک خوبصورت مکان ہے اگر تم لوگ چاہو تو میں تمہیں تمہارا میزبان بننے کی پیشکش کر سکتا ہوں۔" روشی نے دیکھا کہ علی اصغر اس پیشکش سے چونک سا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ خان سلاما سے ان لوگوں کا تعلق ہی کیا تھا۔ اس دعوت کا کوئی معقول جواز نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں روشی کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس پیشکش کو قبول کر لیا جائے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ عجیب بات ہے لیکن خان سلاما کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی قوت تھی جو روشی کو ایسا سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"سوری مسٹر خان سلاما۔ میرا خیال ہے ہمارے دوست پرنس علی رضا اس بات کے لئے تیار نہیں ہوں گے' لیکن اس کے باوجود میں آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"کوئی بات نہیں' ویسے میرے دل میں یہ خواہش رہی ہے کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت آرٹ کی خدمت میں صرف کروں۔"

"لیکن آثارِ قدیمہ کا معاملہ آرٹ نہیں سائنس سے تعلق رکھتا ہے۔" علی اصغر نے پُراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے یہ سُن کر حیرت ہوئی۔" خان سلاما بولا۔ "کیا نوادرات جو زمین میں سے برآمد ہوتے ہیں ان کا تعلق آرٹ سے نہیں ہے یا پھر انہیں ہم سائنس سے متعلق قرار دیتے ہیں یا اگر........ تم دونوں میرے ساتھ چلو تو مجھے تم سے بہت مدد ملے گی۔"

"میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں مسٹر سلاما۔ افسوس ہم اپنے پروگرام میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔" علی اصغر نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ سلاما نے روشی کی طرف دیکھا لیکن روشی کچھ بے تعلق سی ہو گئی تھی۔ بہرطور کسی بھی طرح وہ علی اصغر سے ہٹ کر فیصلہ نہیں کر سکتی تھی حالانکہ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خان سلاما کی بات مان لی جائے۔

"آؤ اگر مناسب سمجھو تو میرے ساتھ ایک ایک پیالی چائے پیو۔" خان سلاما نے پیشکش کی۔

"اوہ۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" روشی جلدی سے بول پڑی لیکن جان کی ترش نگاہوں نے اسے دیکھا اور پھر آہستہ سے بولا۔

"تم جانتی ہو روشی ہمیں کچھ اور کام بھی ہیں' ہاں اگر تم چاہو تو خوشی سے یہ پیشکش قبول کر سکتی ہو۔" اس نے کہا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔ روشی ایک لمحے کے لئے ہکا بکا سی رہ گئی تھی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ علی اصغر نے یہ بات پسند نہیں کی ہے لیکن بڑی عجیب سی پوزیشن ہو گئی تھی وہ چونکہ خان سلاما کی پیش کش قبول کر چکی تھی اور علی اصغر اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اس لئے اب یہ ممکن بھی نہیں تھا کہ وہ علی اصغر کے پیچھے پیچھے لپک جائے یہ انتہائی بدتہذیبی کی بات ہوتی۔ چنانچہ وہ آہستہ قدموں سے خان سلاما کے ساتھ ہوٹل کے کیفے کی جانب چل پڑی اور علی اصغر پھرتی سے اپنے کیبن کی جانب چل پڑا۔ وہ یہ اندازہ کر لینا چاہتا تھا کہ ساری چیزیں محفوظ ہیں یا نہیں۔

لیکن اپنے کیبن میں پہنچ کر ہر چیز کا جائزہ لینے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہاں سب کچھ جوں کا توں موجود ہے' چنانچہ اب اس کے دل میں روشی کا خیال آیا اسے تنہا چھوڑ کر اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ چیزوں کی طرف سے تو اسے اطمینان ہو ہی گیا تھا چنانچہ آہستہ آہستہ وہ بھی کیفے کی جانب چل پڑا۔

☆------☆------☆

سفر کے بقیہ دنوں میں خان سلاما کچھ اس طرح ان کے ساتھ چپکا رہا کہ بالآخر وہ اس کے رویے سے متاثر ہو گئے۔ وہ ایک منکسرالمزاج شخص تھا اور اس طرح ان لوگوں میں گھل مل گیا تھا جیسے انہی کے خاندان کا ایک فرد ہو' البتہ کبھی کبھی علی اصغر کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا تھا کہ خان سلاما کی ان سے اتنی زیادہ یگانگت کیا معنی رکھتی ہے؟ روشی سے اس نے اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ہم لوگوں کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا ہے لیکن روشی کے پاس اس بات کا کوئی جواب موجود نہیں تھا وہ صرف یہی کہہ پائی کہ خان سلاما ایک پُرخلوص اور مخلص شخص ہے لیکن خود اس کے ذہن میں کبھی کبھی یہ کلبلاہٹیں سی پیدا ہوتی تھیں کہ خان سلاما کی آنکھوں میں ایک ایسی کشش ہے کہ کم از کم وہ خود اس کی کسی بات سے انحراف نہیں کرتی جب وہ کوئی بات کہتا ہے تو روشی اپنے دل میں محسوس کرتی تھی کہ وہ اس بات کو ماننے کے لئے مجبور ہو گئی ہے۔ بالآخر سفر ختم ہو گیا اور جہاز لنگر انداز ہوا تو علی اصغر

اور دوسرے لوگوں کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

کچھ قانونی نکتے اس قسم کے تھے کہ انہیں لندن میں قیام کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی تھی۔ ایسے موقع پر خان سلاماہی ان کے کام آیا اس نے تمام معاملات بڑی خوش اسلوبی سے طے کرلئے تھے۔ یہاں تک کہ ایسے معاملات بھی جن میں پرنس علی رضا مکمل طور پر ناکام رہا تھا۔

وہ اپنے طور پر ہر قسم کی بھاگ دوڑ کررہا تھا لیکن اس کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئی تھیں جبکہ خان سلامانے اس سلسلے میں قدم ڈالا تو پھر کوئی 'مشکل ہی نہ رہی اور اس کے بعد یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ خان سلاما کی اپنے گھر قیام کی پیش کش کو مسترد کردیتے۔

سب ہی اس سے متاثر ہوگئے تھے خاص طور سے پرنس علی رضا خان سلاما کی یہ پوزیشن دیکھ کر اس سے بہت متاثر ہوا تھا اور جب اس نے اس سلسلے میں آخری فیصلہ دے دیا ہو کہ قیام خان سلاماہی کے گھر کیا جائے گا تو پھر بھلا کون اس سے انحراف کرسکتا تھا۔

چنانچہ یہی ہوا وہ لوگ سرسبز درختوں میں گھرے اس کے خوبصورت و پُرسکون کشادہ مکان میں پہنچ گئے جس کا سامان آرائش شاہانہ تھا۔ مکان کے گردوپیش میں سناٹا طاری تھا روشی کو اور علی اصغر کو واقعی یہ جگہ بہت ہی حسین لگی۔ ایک پُروقار سنجیدہ ماحول۔

خان سلامانے انہیں ان کے کمرے دکھائے وہاں کا خوابناک ماحول دیکھ کر وہ دونوں جیسے خود کو جنت میں محسوس کرنے لگے روشی کی اپنی نشست گاہ بھی بہت خوبصورت تھی جسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ اس نے گھوم پھر کر سجاوٹ کی چیزوں کو دیکھا۔ ایک قیمتی شوکیس اس کے سامنے تھا جس میں زیورات رکھے ہوئے تھے ان پر بڑی نفاست و نزاکت سے کام کیا ہوا تھا۔ ان سے ان کے مالک کی بلند ذوقی کا بھی احساس ہوتا تھا اور ایسے زیورات کسی شاہی محل ہی میں ہوتے تھے۔ دفعتاً اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی خان سلامانہ جانے کب وہاں آکر کھڑا ہوگیا تھا۔

"کیا آپ کو یہ زیورات پسند آئے مس روشی۔"

"ہاں۔ بہت ہی خوبصورت ہیں" خان سلامانے شوکیس کا ڈھکن اٹھا کر ایک چھوٹا سا لاکٹ نکالا جس کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہی تھی اس نے اسے

روشی کے گلے سے لگایا تو روشی کا دل بڑی تیزی سے دھڑک اٹھا۔

"یہ ہار ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے اور میں نے اسے کسی ایسے ہی تاریخی حسن کے لئے سنبھال کر رکھا تھا جو اس کا اہل ہو' دیکھئے کیسا ہے؟" اس نے لاکٹ روشی کے گلے.......... لگاکر دکھایا۔

"بے حد خوبصورت بے حد خوبصورت۔" روشی کی آواز آہستہ سے ابھری۔

"تو پھر میں یہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔" خان سلاما آہستہ سے بولا اور روشی جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے کسی نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ اتار دیا ہو پھر اس نے چونک کر کچھ سوچا اسے خیال آیا کہ خان سلاما ہر چند کہ عمر رسیدہ ہے لیکن.......... جو کچھ ہو رہا ہے اس کی رفتار بہت تیز ہے۔ اس نے بمشکل تمام کہا۔

"یہ انمول ہے مسٹر سلاما شاید میرے قابل نہیں۔"

"اگر یہ تمہارے قابل نہیں تو مجھے اس کا افسوس ہوگا' پھر اس کی چمک' اس کی خوبصورتی اور اس کی قیمت بے مصرف ہے میں اسے کسی گندے نالے میں پھینک دوں گا۔"

"ارے نہیں نہیں کیسی باتیں کررہے ہیں آپ؟"

"یہ میری حسرت تھی اس سے پہلے میں نے کبھی کسی خاتون کو اس قابل نہیں سمجھا کہ یہ ہار اسے پیش کرسکوں۔" روشی نے پریشان نگاہوں سے خان سلاما کو دیکھا۔ اس کی خود اعتمادی خان سلاما کی نگاہوں سے نگاہ ملتے ہی ختم ہونے لگی تھی' کتنا بھرپور انسان ہے وہ' کتنا شاندار' کتنا عظیم۔ اس کے ذہن سے آواز ابھر رہی تھی اور پھر اس کے ذہن میں علی اصغر کا خیال آیا۔

خان سلاما اور علی اصغر' علی اصغر اور خان سلاما دونوں تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے گڈمڈ ہونے لگیں۔ خان سلامانے کہا۔

"اسے قبول کرلو روشی۔ یہ تمہارے لئے ہے۔" روشی مسحور ہوگئی۔ خان سلاما نے اپنے ہاتھ سے وہ حسین لاکٹ اس کی گردن میں پہنادیا تھا۔ روشی جیسے خواب کے عالم میں تھی پھر خان سلامانے اسے ایک صوفے پر بٹھایا اور اس کا شانہ تھپک کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

روشی تھوڑی دیر بیٹھی عجیب سے انداز میں اس ہار کو اپنی گردن میں محسوس

کرتی رہی اور پھر اس کے قدم اپنی جگہ سے اٹھے اور نرم و آرام دہ بستر پر پہنچ گئے۔ وہ تھکن سے نڈھال تھی اس لئے وہ آرام کرنا چاہتی تھی چنانچہ بستر پر لیٹتے ہی وہ نیند کی آغوش میں پہنچ گئی۔

اگلے روز وہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ پرنس علی رضا نے ایک مخصوص علاقے میں ایک لمبا چوڑا شامیانہ لگالیا تھا اس پر کچھ سرکاری اعتراضات بھی ہوئے، لیکن بالآخر تمام کام ہموار ہوگئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی علی رضا جانتا تھا کہ کسی چیز کی نمائش کرنے کے لئے کیا کیا انتظامات کرنا ہوتے ہیں اور پبلسٹی کیا چیز ہوتی ہے۔

چنانچہ کرائے کے چند افراد نے علی رضا کی طرف سے یہ افواہ پھیلادی کہ اگر اسے ان نوادرات کی نمائش کی اجازت نہ ملی تو وہ ساری چیزیں فوراً امریکہ بھجوا دے گا اور انگلینڈ کے رہنے والے ان صدیوں پرانی تاریخی چیزوں کی ایک جھلک تک نہ دیکھ سکیں گے۔ اس کا یہ حربہ کارگر ہوا اور عوامی دباؤ سے حکومت اسے اجازت دینے پر مجبور ہوگئی۔ علی رضا نمائش کے انتظامات میں مصروف ہوگیا اور علی اصغر نے نوادرات کو احتیاط سے سنبھالے رکھنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔

بالآخر نمائش کا وقت قریب آگیا تھا علی رضا نے نمائش میں بڑی ترتیب رکھی تھی شامیانے کے اندر اس نے مقبرے کا سا ماحول بنانے کی کوشش کی تھی۔ بڑے بڑے پوسٹروں پر قدیم فراعون اور ان کے خاندان کے حالات کے علاوہ نوادرات کے کوائف بھی درج تھے۔ ساری چیزیں اس نے بڑی مناسب جگہوں پر رکھی تھیں۔ ٹھیک وسط میں ایک اونچے چبوترے پر وہ ممی رکھی ہوئی تھی۔ اس ممی کی کہانی پوسٹروں میں بڑی تفصیل سے درج کی گئی تھی اور اس کا متن کچھ یوں تھا۔

راعمیس ہفتم کے دو جڑواں بیٹے تھے دونوں کا اٹھان ہوا تو وہ مختلف کردار کے مالک تھے ایک مفکر تھا جو سچائی اور ابدیت کا متلاشی تھا اس کے برعکس دوسرا دنیاوی دلچسپیوں کا قائل تھا اور وہ دنیا کے رنگ و بو کو متاعِ حیات سمجھتا تھا۔

دوسرے کو بھائی کے مقام اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے حسد ہونے لگا، اور اس نے اپنے سازشی مشیروں اور ہم مشرب ساتھیوں کی مدد سے اس کے خلاف محاذ بنالیا۔ بوڑھے راعمیس ہفتم نے اپنے وزیروں اور مدبروں کی مدد سے دونوں بھائیوں کی آپس کی چپقلش سے بچنے کے لئے اپنے محبوب بیٹے کو جنگل کی سمت روانہ

کردیا۔ جو اپنے گنے چنے وفاداروں کے ساتھ صحرا میں پھرتا رہا، اور طویل عرصے کے بعد صحرا نشینوں کے ایک قبیلے نے اسے پناہ دے دی، وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کے فلسفے اور کردار سے متاثر ہوگئے تھے اور اسے اپنا حکمران منتخب کرلیا۔ اس نے اپنے وطن واپس جانے کی ٹھانی، تاکہ وہاں کے حالات درست کرے۔ اس کی بھنک دوسرے کے کانوں میں پڑی تو وہ بھائی کی جان لینے پر تُل گیا اور اسے قتل کرنے کے لئے اس نے اپنے آدمی بھیج دیئے، بڑی خونریزی ہوئی اور پہلا اپنے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے ساتھ مارا گیا۔ قاتلوں نے اس کا بایاں بازو کاٹ لیا، جس کی انگلیوں میں اس کی انگوٹھیاں پڑی ہوئی تھیں اور اسے بطور نشانی اس کے بھائی کے پاس لے گئے، اس کی لاش بڑی بے سروسامانی سے دفن کی گئی، لیکن راعمیس نے مرنے سے پہلے اس کی لاش کو اس کے مدفن سے نکلوایا اور اسے ایک شاہانہ مقبرے میں دفن کردیا۔"

یہ کہانی بڑی تفصیل سے درج کی گئی تھی اور اس سلسلے میں جو پروگرام بنائے گئے تھے وہ بڑے دلچسپ تھے۔

خان سلامانے اس سلسلے میں علی اصغر اور روشی سے ایک سوال کیا۔

"کیا اس تابوت کو کھول کر رکھا جائے گا۔"

"کیوں نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو دیکھنے والے اس ممی کو کیسے دیکھیں گے۔" علی رضا نے کہا۔

"تو بہتر ہے یہ کام میں انجام دوں۔" خان سلاما بے اختیار آگے بڑھا، وہ لوگ اس کی بے اختیاری کا اندازہ بھی نہ لگاپائے تھے کہ خان سلامانے تابوت کے گرد لپٹا ہوا فیتہ کاٹا اور اس کا ڈھکن اٹھادیا۔

راغشیت کی ممی اپنا دیدار کرانے کی منتظر پڑی تھی۔ تابوت کے کھولنے کے بعد خان سلاما ایک لمحے کے لئے ساکت وجامد ہوگیا۔ وہ ممی کو عجیب وغریب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا پھر وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ روشی بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی چلی تھی۔ اس نے آگے بڑھتے ہوئے علی اصغر سے پوچھا کہ کیا وہ بھی ان کے ساتھ آنا پسند کرے گا؟

"مجھے تھوڑا سا کام ہے میں اس کام کو اطمینان سے انجام دے کر واپس آؤں گا۔" علی اصغر نے جواب دیا۔

"تو پھر ہم لوگ گھر جارہے ہیں۔ ہم تمہارا وہیں انتظار کریں گے۔"

روشی خان سلاما کے ساتھ گھر واپس آگئی۔ تھوڑی دیر تک وہ کھانے پر اس ک
انتظار کرتے رہے اور اس کے بعد کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ روشی نے لباس تبدیل کر لیا
تھا' اپنے بکس میں سے دوسرا جوڑا نکالتے ہوئے اس کی نگاہ سونے کی طرح کی دھات
کے اس گول ٹکڑے پر پڑی جو وہ مصر سے اپنے ساتھ لائی تھی' یہ چھوٹا سا تحفہ اس کے
باپ نے کھدائی کے دوران ایک روز اسے دیا تھا' اس پر قدیم مصری زبان کے کچھ
الفاظ کندہ تھے جن کے بارے میں پروفیسر شہباز نے کہا تھا کہ یہ چیز اس نے کہیں پڑی
پائی تھی اور اس کا تعلق مقبرے سے نہیں ہے' روشی نے اسے باپ کی نشانی کے طو
پر سنبھال کر رکھا تھا' اب جو اس پر نظر پڑی تو باپ کی یاد شدت سے اس کو تڑپا گئی او
اس نے اس نقش کو ایک پتلی زنجیر میں ڈال کر گلے میں پہن لیا' جب وہ کھانے کی میز
بیٹھے تو خان سلاما کی نگاہ اس نقش پر پڑی اور وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ا
کے دیئے ہوئے لاکٹ کے سامنے ہیچ نظر آرہا تھا۔

"کیا تم نے یہ نیا خریدا ہے۔" اس نے روشی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بہت پرانا ہے۔" روشی نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا تم مجھے اپنے بارے میں بتانا پسند کرو گی روشی۔" خان سلاما بولا اور رو
کھانے کے دوران اسے اپنی زندگی کے حالات سناتی رہی۔
ان حالات میں علی اصغر کا تذکرہ بھی آیا تھا جب اس نے اپنی کہانی ختم کی تو خا
سلاما اچانک پوچھ بیٹھا۔

"تو تم علی اصغر سے شادی کرو گی؟" روشی نے فوراً ہاں میں جواب دینا چاہا' لیکن
نہ جانے کیوں اس کی زبان میں کچھ اینٹھن سی ہونے لگی' بمشکل تمام اس کے منہ
نکلا۔

"یقین سے نہیں کہہ سکتی ویسے۔" وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ الفاظ اس نے کیو
کرادا کئے' کیونکہ اس سے پہلے تو علی اصغر اس کی زندگی کا پہلا اور آخری فیصلہ تھا۔

"میرا خیال ہے اس سلسلے کو آگے بڑھانے سے پہلے خود کو اچھی طرح یقین دلا
زندگی معمولی چیز نہیں ہے اور اس کے لئے فیصلہ کرتے ہوئے انسان کو بہت سوچ
کر کام کرنا چاہئے۔"

"خان سلاما میں۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہو گیا ہے' اس سے قبل میں نے
علی اصغر کے بارے میں اس سے ہٹ کر نہیں سوچا' لیکن نہ جانے کیوں

کل.......... آج کل۔"

"اس کی وجہ ہے۔ اس کی وجہ ہے روشی۔" خان سلاما نے اس کے دونوں
شانوں پر ہاتھ رکھ دیئے.......... عین اسی وقت علی اصغر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ
ان دونوں کو دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا تھا لیکن دوسرے لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا اور
پھر بولا۔

"معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی۔"

"اوہ ڈیئر علی اصغر تم بہت زیادہ تھکے ہوئے محسوس ہوتے ہو اگر تم چاہو تو میں
تمہارا کھانا کمرے میں بھجوا دوں۔" خان سلاما نے کہا۔

"نہیں میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔" علی اصغر نے جواب دیا اور شاید یہ کوئی غلط
بات نہیں تھی وہ علی رضا کے ساتھ تھوڑا بہت کھا پی کر آیا تھا۔

بہر طور وہ اپنی رہائش گاہ میں واپس آگیا۔ خان سلاما اور روشی کی قربت کو اچھی
طرح محسوس کر چکا تھا اور اس کے ذہن میں عجیب عجیب سے خیالات آرہے تھے' لیکن
کشادہ ذہن کا مالک تھا۔ کسی پر بھی اپنی ذات کا تسلط پسند نہیں کرتا تھا' چنانچہ جب شام
کو اس کی ملاقات روشی سے ہوئی تو اس نے آہستہ سے نرم لہجے میں اس سے سوال
کیا۔

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے روشی' جیسے تم بھی مجھ سے دور ہوتی جارہی ہو۔ اگر
یہ حقیقت ہے تو کم از کم مجھے تم سے اس بارے میں سوال کرنے کا حق ضرور ہے اور
اس حق کی ادائیگی کے بعد میرے تمام حقوق ختم ہو جاتے ہیں۔"

☆------☆------☆

"تو پھر تفصیلی معائنے تک کے لئے اپنے فیصلے کو محفوظ کیوں نہیں رکھتے۔" خان
سلاما نے کہا اور اپنا ہاتھ نقش کی طرف بڑھا دیا جیسے اسے لینا چاہتا ہو لیکن علی اصغر نے
اسے پیچھے ہٹا کر کہا۔

"روشی یہ تمہاری ملکیت ہے۔"

"ہاں ہاں کیا مطلب؟" روشی حیرت سے بولی۔

"صرف ایک ہی شخص ہے جو ہر عہد کی پوری معلومات فراہم کر سکتا ہے اور وہ
ہے پروفیسر بخاری۔ میں یہ نقش اسے دکھاؤں گا۔"

خان سلاما نے بدستور شائستگی سے کہا۔ "میرا خیال ہے اس وقت تو بہت دیر

ہو گئی ہے' کل سہی۔"

"نہیں ابھی اور اسی وقت۔" علی اصغر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

کمرے سے نکلتے ہوئے علی اصغر خوش ہو رہا تھا کہ اس نے ان دونوں کو الجھن میں ڈال دیا ہے اور اس کی عدم موجودگی سے وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے جیسا کہ اس کا خیال تھا پروفیسر بخاری اپنے کمرے میں پہنچ چکا تھا اور جاگ رہا تھا' وہ لائبریری میں بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کی صحت کافی خراب ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی' علی اصغر نے کسی تمہید کے بغیر نقش اس کے سامنے کر دیا اور صمد بخاری چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ بخاری نے کوئی خاص بات اس نقش کے بارے میں نہیں کہی تھی تب علی اصغر نے اس سے کہا۔

"میں اس نقش کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں اسے شناخت کریں' اس کا تاریخی زمانہ اور اس کی اہمیت بتائیں۔"

صمد بخاری نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نقش پر نظر جما کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس میں کامیاب نہ ہوا اور کتابوں کے شیلف کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"وہاں کوشش کر دیکھو' چوتھے شیلف میں بیرونی' بینز ونی اور ڈی مورگان کی کتابیں رکھی ہوئی ہیں' ذرا ان کتابوں کو نکال لاؤ اور ان میں اس نقش کی تفصیل تلاش کرو۔"

علی اصغر نے اس بات سے انحراف نہ کیا اور کتابوں کو کھنگالنے لگا' اس دوران پروفیسر بخاری بدستور گہری سوچ میں ڈوبا رہا تھا' وہ پتہ نہیں کسی ذہنی انتشار کا شکار تھا۔

علی اصغر کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا لیکن اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ پھر اس نے پروفیسر بخاری سے التجا کی وہ ہوش میں آئے اور اس کی مدد کرے۔

پروفیسر بخاری نے نقش علی اصغر کے ہاتھ سے لے لیا لیکن وہ میز پر رکھے ہوئے گلاس سے ٹکرا گیا اور گلاس ایک چھناکے کے ساتھ فرش پر گر گیا۔

"اوہ مسٹر صمد بخاری آپ اس سے قبل تو ایسے نہ تھے۔" علی اصغر نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ پروفیسر بخاری کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔

"تو تم بھی اب میری عزت نہیں ـــــ" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"اوہ نہیں سر! میں بے حد شرمندہ ہوں میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" صمد بخاری کرسی سے اٹھ گیا۔ "جب کام ختم کر لو' تو باہر جانے کا راستہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔" صمد بخاری نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد علی اصغر دیر تک سناٹے میں رہا.......... پھر اس نے میز پر پڑا ہوا شیشہ اٹھا لیا اور اپنی سمجھ کے مطابق نقش کی پڑتال کرتا رہا۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھا کہ اسے اپنے عقب میں قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی اس سے پہلے کہ وہ سر گھما کر دیکھ سکے' اس کے سر پر ایک ضرب لگی اور وہ کرسی سمیت فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

☆------☆------☆

نمائش کے افتتاح کا وقت آ چکا تھا اور اب کچھ ہی دیر میں نمائش شروع ہونے والی تھی۔ دفعتاً ناصر جمالی خیمے میں داخل ہوا اور علی رضا کو تلاش کرتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ علی رضا اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر روشی اور خان سلاما ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ روشی نے ناصر جمالی کو دیکھا اور چونک کر بولی۔

"ارے یہ یہاں۔ آؤ ذرا چلیں۔" اور خان سلاما اس کے ساتھ ساتھ ان دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ناصر جمالی کہہ رہا تھا۔

"ایک لاکھ.......... دو لاکھ پونڈ کی رقم کچھ کم نہیں ہوتی مسٹر علی رضا' بہتر یہ ہو گا کہ تم یہ پیش کش قبول کر لو۔"

"علی رضا کو جانتے ہو؟" علی رضا نے تلخ لہجے میں کہا۔ "دو لاکھ پونڈ کی رقم رضا کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں یہ ساری چیزیں لاد کر جہاز پر واپس چھوڑ آؤ۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے تو میں تمہارے احمق ہونے پر شبہ نہیں کرتا۔"

"میری حکومت ٹرانسپورٹ کی ساری ذمہ داری قبول کر لے گی اور اس کے علاوہ تمہیں وہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں' تم یہیں وصول کرو اور اس نمائش سے دستبردار ہو جاؤ۔" ناصر جمالی نے کہا۔

"نہایت ہی احمقانہ بات ہے میرے دوست۔ میں پبلسٹی کرا چکا ہوں' کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنی ساکھ خراب کر لوں۔ ہرگز نہیں یہ میرے لئے ممکن نہیں ہے۔"

"مگر میں تمہیں تمہاری بہتری کے لئے مشورہ دے رہا ہوں علی رضا۔ میری حکومت کی پیش کش قبول کرلو۔" ناصر جمالی نے کہا اور علی رضا ہنسنے لگا۔

"میں اپنی بہتری کو خود ہی سمجھتا ہوں۔"

"تو پھر نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" ناصر جمالی نے کہا۔

"جاؤ میرے دوست واپس جاؤ۔ میں غصے میں نہیں آتا۔ ویسے مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ اس موقع پر علی اصغر نہیں ہے ورنہ وہ تمہیں مناسب جواب دیتا۔" علی رضا نے کہا اور جمالی ہونٹ کاٹتا ہوا وہاں سے پلٹ پڑا۔

روشی اور خان سلامایہ گفتگو سن رہے تھے دفعتاً علی رضا نے چونک کر انہیں دیکھ اور بولا۔

"کیا حال ہے علی اصغر کا۔ وہ ہوش میں آیا یا نہیں؟"

"وہ ہوش میں آچکا ہے۔ مگر ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اسے خاموشی سے آرام کرنے د جائے۔"

"مگر قصہ کیا تھا۔ وہ کیا نقش تھا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوا۔"

روشی اسے تفصیل بتانے لگی اور پھر آخر میں بولی۔ "اب وہ نقش غائب ہو ہے۔" تینوں باتیں کرتے رہے اسی اثناء میں اخباری رپورٹر شامیانے میں آنا شرو ہو گئے۔ علی رضا نے کھانے پینے کا معقول بندوبست کیا تھا' اس کے نزدیک کامیاب بزنس کا ایک گر یہ بھی تھا۔ بہرحال سب لوگ اِدھر اُدھر پھیل کر کرسیوں پر بیٹھ اور علی رضا نے نمائش کا آغاز کردیا۔

اس نے ایک ڈائس پر کھڑے ہو کر افتتاحی تقریر شروع کی۔ ممی کا تابوت و رکھا ہوا تھا۔ نمائش گاہ میں پروفیسر بخاری بھی موجود تھا اور بے چینی سے پہلو بدل تا روشی ایک کونے میں کھڑی حاضرین کے چہروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ دفعتاً اس نگاہ ناصر جمالی پر پڑی جو بت کی طرح ساکت بیٹھا تھا اور اس کی نگاہیں علی رضا پر ہوئی تھیں۔

پھر علی رضا نے کہا۔

"میرے معزز دوستو! آپ کے سامنے میں پہلی بار اس تابوت کو کھول ہوں۔" اس نے کہا اور چاقو سے تابوت کے گرد لپٹا ہوا فیتہ کاٹ دیا۔ پھر آہستہ آ اس کا ڈھکن اٹھانے لگا' بہت سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور گردن اٹھا اٹھا کر تابو

کے اندر موجود ممی کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ علی رضا کی آواز ابھری۔

"میں نوادرات کی دنیا کا ایک معمولی سا رکن آپ کے سامنے ممی پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہوں۔" اس نے کہا اور تابوت کا ڈھکن پوری طرح کھول دیا۔ مجمع میں بڑبڑاہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ کرسیاں آگے پیچھے سرکنے لگیں' پھر چند دبے دبے قہقہے ابھرے تابوت خالی تھا۔

روشی دوڑ کر شامیانے سے باہر نکل گئی اور وہاں تعینات پولیس پارٹی کے انچارج کو بلا لائی۔ اس نے شامیانے میں داخل ہوتے ہی حکم دیا کہ کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ کیونکہ ممی اتنی چھوٹی چیز نہیں تھی جو بغل میں دبائی جاسکتی یا جیب میں چھپائی جاسکتی۔

اخباری رپورٹروں نے اس کے حکم پر احتجاج کیا اور کچھ بے دھڑک شامیانے سے باہر نکل گئے تاکہ خبر بنا سکیں۔

"اتنی بڑی ممی کو کون چرا سکتا ہے؟" ایک رپورٹر نے علی رضا سے پوچھا۔

"میرا کوئی حریف' کوئی ایسا شخص جو مجھے تباہ کرنا چاہتا ہے۔"

"گویا تمہارے یہاں کوئی دشمن بھی ہیں۔"

"یقیناً ہیں۔ آخر میں کاروباری آدمی ہوں' میرا کوئی بھی دوست اندر سے میرا دشمن ہو سکتا ہے اور پھر یہ شخص.........." اس نے ناصر جمالی کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ "اس نے مجھے آج ہی دھمکی دی تھی۔"

"کیا یہ سچ ہے؟" انسپکٹر نے ناصر جمالی کی طرف رخ کر کے کہا۔

"میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں نے علی رضا سے اس بارے میں کچھ گفتگو کی تھی لیکن اس گفتگو کے دوران ممی تابوت سے نکال کر غائب کی جاسکتی ہے اور کوئی اس کا عملی مظاہرہ کر سکتا ہے میں اپنے آپ کو مجرم سمجھنے کے لئے تیار ہوں۔" ناصر جمالی نے جواب دیا۔

"کچھ بھی ہو میں ممی کا حصول چاہتا ہوں انسپکٹر ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔" انسپکٹر نے علی رضا کو یقین دلاتے ہوئے کہا کہ وہ ممی کی چوری کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہے اس سے دریغ نہیں کرے گا۔

علی رضا کا چہرہ اتر گیا تھا وہ دم بخود رہ گیا تھا۔ پھر وہ بڑبڑانے لگا۔ "ہرگز نہیں' یہ ممکن نہیں ہو سکتا.......... یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ ناممکن ہے یہ' ممی کی پوری پوری

حفاظت کی گئی تھی اسے چرانا آسان کام نہیں تھا لیکن لیکن۔"

روشی بھی افسردہ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

"میرا خیال ہے آپ تھوڑا سا آرام کرلیں۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔"

"اگر میں آپ کی کوئی خدمت کرسکتا ہوں تو حاضر ہوں۔" خان سلامانے کہا۔

"ہاں اگر تم میری کوئی خدمت کرسکتے ہو تو صرف یہ کرو کہ اپنے بدن پر بہت سے کپڑوں کی پٹیاں لپیٹ لو اور تابوت میں لیٹ جاؤ۔" علی رضا دانت پیس کر بولا اور خان سلامانے مسکراتے ہوئے روشی کا بازو پکڑ لیا۔

"آؤ روشی۔ میرا خیال ہے مسٹر رضا عقل عقلیات کی تمام حدوں کو عبور کرگئے ہیں۔" وہ روشی کا بازو پکڑے ہوئے شامیانے سے باہر نکل گیا تھا اسی وقت علی اصغر آہستہ آہستہ چلتا ہوا شامیانے کے اندر داخل ہوا۔ پولیس والوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن ممی کی چوری کا سن کر وہ رہ نہ سکا اور سر میں شدید چکر اور کمزوری کے باوجود وہاں سے چل پڑا۔ راستے بھر اس کی حالت غیر رہی تھی پولیس والوں نے اسے روکا تو اس نے کہا۔

"مجھے مسٹر علی رضا سے ضروری ملنا ہے۔"

"اندر کوئی نہیں ہے۔" ایک پولیس والے نے کہا۔

"کیا واقعی علی رضا اندر نہیں ہے؟"

"اوہ! علی اصغر یہ تم ہو۔" اس کی آواز سن کر اندر سے علی رضا نے چیخ کر کہا۔ اور پولیس والوں کو اسے چھوڑنا پڑا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور تابوت کے نزدیک پہنچ گیا۔ "تو کیا واقعی وہ غائب ہوگئی؟" اس نے تردد سے کہا۔

"تم بستر سے کیوں اٹھے۔" علی رضا نے آہستہ سے کہا۔

"میں جانتا ہوں یہ کیوں ہوا ہے۔" علی اصغر نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے اس نقش پر کندہ الفاظ کے معنی پائے ہیں اور اس کی طاقت کا زور بھی لیکن وہ نقش مجھ سے ہتھیا لئے گئے۔" علی اصغر نے بے چارگی سے کہا۔

پرنس علی رضا ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھ رہا تھا اس کی سمجھ میں علی اصغر

کی بات نہیں آئی تھی۔

"جس نے یہ ممی چرائی ہے اس کا مقصد دوبارہ اسے زندہ کرنا ہے۔" علی اصغر نے کہا۔

"تمہاری دماغی کیفیت متاثر ہوگئی ہے شاید۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"فی الحال تم بیمار ہو علی اصغر۔ میں تمہارے لئے گاڑی منگواتا ہوں۔" علی رضا نے کہا اور ایک پولیس والے سے کہا کہ براہ کرم کسی گاڑی کا بندوبست کیا جائے۔

"اچھا میں چلتا ہوں لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے اسے آپ نظر انداز نہ کریں۔ ممی زندہ ہوجائے گی اور اس کے بعد جو کچھ ہوگا اس کا آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ میں صمد بخاری کا خاص شاگرد ہوں اور ان تحریروں سے اچھی طرح واقف ہوں جو قدیم تحریریں ہوتی ہیں اگر آپ نے میری بات پر عمل نہ کیا تو نقصانات اٹھائیں گے۔"

اسی اثناء میں ایک پولیس والے نے علی رضا کو بتایا کہ گاڑی آگئی ہے۔ علی رضا نے پولیس والے کو اشارہ کیا اور انسپکٹر علی اصغر کا بازو پکڑ کر باہر نکل گیا۔ علی رضا واپس پلٹا تو وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ ناصر جمالی بھی اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ شاید وہ جاچکا تھا۔

پرنس علی رضا بری طرح تھک گیا تھا شدید غصے کے عالم میں اس کی اندرونی کیفیت بہتر نہیں تھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ممی اتنی شاندار نگرانی کے باوجود کس طرح سے غائب ہوگئی لیکن یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت تھی کہ ممی اب اس تابوت میں موجود نہیں تھی اور وہ خواہ اس تابوت کے گرد کتنے ہی چکر لگائے' اس کی واپسی ناممکن تھی۔ لندن میں پولیس اس کی ممی کی چوری کا سراغ لگانے کے لئے کیا کچھ کرے گی اس کا اندازہ پرنس علی رضا کو نہیں تھا لیکن اتنی بات وہ ضرور جانتا تھا کہ اس کی بہترین ساکھ متاثر ہوگئی ہے اور اب اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں مذاق کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چند لمحات کے بعد وہ شامیانے سے باہر نکل آیا پولیس والے وہاں موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے گردن خم کرکے کہا۔

"ہمارے لئے کوئی خدمت جناب۔"

"نہیں شکریہ!" اس نے جواب دیا اور خاموش سڑکوں پر سبک خرامی سے چل پڑا۔ ذہن و دل بے کار ہوئے جارہے تھے ممی کی گمشدگی کا اسے دلی رنج تھا۔ باقی

نوادرات شامیانے میں موجود تھے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے وہاں پولیس والے کافی تعداد میں موجود تھے نہ بھی ہوتے تو پرنس علی رضا کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا وہ تو اس وقت اپنے دل و ذہن کو قابو میں کرنے کے لئے پیدل ہی چل رہا تھا۔ سڑک سے کہر کی چادر اٹھ اٹھ کر دیواروں سے لپٹ رہی تھی۔ بجلی کے کھمبوں سے لٹکے ہوئے بلب دھندلا گئے تھے اور بہت دور کہیں کسی گھڑیال کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کہر کافی گہری تھی اور تھوڑے فاصلے کا آدمی بھی صاف طور پر نظر نہیں آتا تھا۔ البتہ تیز روشیاں جب گزرتیں تو تھوڑی دیر کے لئے ماحول منور ہو جاتا۔ پرنس علی رضا بڑھتا رہا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ کافی دور چلنے کے بعد وہ یوں ہی بے خیالی کے انداز میں ایک تنگ سی گلی کی جانب مڑ گیا دل نہیں چاہتا تھا کہ کسی اور جگہ جاکر آرام کرے۔ بس ان سڑکوں پر وہ اپنی ان بے چینیوں کا حل تلاش کرنا چاہتا تھا۔ خیالات میں ڈوبا ڈوبا نہ جانے وہ کتنی دور نکل گیا۔ لندن اس کے لئے اجنبی نہیں تھا لیکن ممی کا تصور کچھ اس طرح اس کے ذہن پر چھایا تھا کہ اسے احساس نہیں ہوا کہ اس کے قدم کس سمت اٹھ رہے ہیں۔ ایک موڑ پر رک کر دفعتاً وہ چونکا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن اب بھی اس کا ذہن صاف نہیں تھا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح یہ ممی اسے واپس مل جائے تو لطف آجائے گا اس کی گمشدگی سے جو پبلسٹی ہو چکی ہے وہ مزید کار آمد ہوگی اور لوگ نمائش گاہ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا' ممی کو تلاش کرنا بہت ضروری ہے اس کے بغیر ان نوادرات کی نمائش بے مقصد ہوگی لوگ تو پُراسرار راغشیف کے اس بھائی کو دیکھنا چاہتے تھے جو تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے جو کہانی راغشیف کے بارے میں لوگوں کو خود اس نے سنائی تھی وہ لوگوں کے لئے باعثِ دلچسپی تھی اور سب کے سب راغشیف کی پُراسرار زندگی کے بارے میں مزید جاننے کے خواہاں تھے کاش وہ مل جائے۔ اس نے قدم آگے بڑھائے سڑک کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کون سی سڑک ہے۔ بالآخر اس نے یہ سڑک پار کرلی اور ایک محرابی دروازے کے پاس پہنچ گیا جو شاید کسی طویلے کے احاطے کا تھا لیکن اچانک اس کے کانوں میں پانی بہنے کی آواز سنائی دی ایک عجیب سی آواز پتہ نہیں یہ آواز کیسی ہے پتہ نہیں وہ اس بے دھیانی میں کتنا فاصلہ طے کرچکا ہے۔ دفعتاً اسے ایک ہیولا نظر آیا اور وہ چونک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"میں راستہ بھٹک گیا ہوں یہ کون سی جگہ ہے؟" اس نے کہا لیکن پھر ہیولے کی

ہیئت اسے نظر آگئی۔ اس کے پورے بدن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ اس کی ممی کی شکل میں نظر آرہا تھا۔

ایک لمحے میں اس کے ذہن میں متعدد خیالات گردش کر گئے کیا یہ شخص پرنس علی رضا سے واقف ہے اسے علم ہے کہ ممی غائب ہوگئی ہے اور اس نے بطور مذاق اس کے لئے یہ روپ دھارا ہے.......... یا پھر.......... یہ گمشدہ ممی ہے لیکن.......... چلتی پھرتی حالت میں.......... یہ کیسے ممکن ہے' یہ کیسے ممکن ہے۔ نہیں! یہ اسے بیوقوف بنانے کی کوشش ہے ضرور ایسی ہی بات ہے۔

"تم۔ تم کون ہو دوست؟ میں تمہارے مذاق سے محظوظ ہو رہا ہوں لیکن آپ میری رہنمائی.........." ابھی اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلے تھے کہ دفعتاً ممی نے ہاتھ بڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ پرنس علی رضا بدحواس ہوگیا.......... لیکن دوسرے لمحے ممی نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے بلند کرلیا۔ پھر وہ اسے گھمانے لگی۔ علی رضا کا سر چکرا گیا تھا محراب لیمپ پوسٹ ساری چیزیں گھوم رہی تھیں اور یہ گردش اتنی برق رفتار تھی کہ علی رضا کی آنکھیں بند ہوگئیں پھر اسے محسوس ہوا جیسے وہ کسی تیز رفتار گاڑی میں بیٹھ کر ایک طرف روانہ کر دیا گیا ہو۔ ہواؤں کا بے پناہ شور اس کے کانوں سے ٹکرایا اور اس کے بعد.......... اس کے بعد وہ کسی دیوار سے ٹکرایا لیکن کرب واذیت کا وہ احساس ایک لمحے میں فنا ہو گیا۔ اس کے بدن کی تمام ہڈیاں گوشت کے لوتھڑوں میں گھس کر دیوار سے چپک گئیں۔ ایک بلند وبالا عمارت کی پانچویں منزل کی دیوار سے اور اب نمائش کی ضرورت نہیں تھی۔ علی رضا کو نوادرات کی نمائش سے وہ شہرت حاصل نہیں ہو سکتی تھی جو اس کی لاش کی اس کیفیت سے ہوئی۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ والے دوسری صبح اپنی زندگی کے انوکھے مذاق سے دوچار ہوں گے۔ قتل تو ہوتے ہیں دریاؤں میں سمندروں میں۔ لاشیں مختلف جگہوں اور کنوؤں میں ملتی ہیں لیکن ایک عمارت کی سپاٹ دیوار پر چپکی ہوئی یہ لاش پوری دنیا کے لئے عجوبہ بن جائے گی کوئی نہیں بتا سکے گا کہ اس انسان نے خلا کے کون سے سیارے سے کود کر خودکشی کی؟

☆------☆------☆

علی اصغر پرنس علی رضا کے پاس سے بددل لوٹا تھا۔ یوں بھی اس کی زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ روشی اب اس کی زندگی سے نکل گئی ہے وہ پوری طرح خان سلاما کی طرف متوجہ ہے۔

پروفیسر شہباز کی بیٹی تعلیم یافتہ تھی اپنے اچھے بُرے کو بخوبی سمجھ سکتی تھی ممکن ہے اسے زندگی کی بہتری اس شکل میں نظر آئی ہو کہ وہ خان سلاما کو زندگی کا ساتھی بنالے اسے روشی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ یہ تو خوشی کے سودے ہیں انسان ہمیشہ اپنی بہتری کا خواہاں ہوتا ہے۔

لیکن ممی کی گمشدگی اس کے لئے بہت دکھ کی بات تھی اور اسے یقین تھا کہ ناصر جمالی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا جس نے ممی چرائی ہے۔ یہ شخص ابتدا ہی سے ممی غیر لوگوں کے قبضے میں دینے کے خلاف تھا۔ چنانچہ زخمی اور کمزور ہونے کے باوجود اس نے اپنی آرام گاہ کا رخ کرنے کی بجائے ہوٹل فزارہ جانا ضروری خیال کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ فزارہ میں داخل ہو رہا تھا۔ کاؤنٹر پر اس نے ناصر جمالی کے بارے میں معلوم کیا اور اسے اس کے کمرے کا نمبر معلوم ہوگیا چنانچہ وہ کمرے کی طرف چل پڑا۔

کمرے میں اس نے دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا.......... دوسری اور پھر تیسری دستک کے بعد اس نے دروازے کو کھول کر دیکھنے کی کوشش کی اور دروازہ بہ آسانی کھل گیا۔ اندر روشنی تھی لیکن کمرہ خالی نظر آرہا تھا البتہ ناصر جمالی کے چند لباس بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔

"ناصر جمالی کہاں ہے؟" اس نے سوچا۔ دفعتاً کسی خیال کے تحت اس نے ناصر جمالی کے لٹکے ہوئے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لینا شروع کردی اس نے یہ سوچ کر جیبوں میں ہاتھ ڈالا تھا کہ ممکن ہے گمشدہ سنہرا نقش اس کی جیب میں موجود ہو لیکن کوٹ کی جیبیں خالی تھیں پھر اس نے بستر کے تکیے کے نیچے دیکھا پتلون کی جیبیں تلاش کیں اور ابھی وہ اس تلاش سے فارغ نہیں ہوا تھا کہ دفعتاً اسے اپنے پیچھے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی پلٹ کر دیکھا تو ناصر جمالی ایک لمبے پھل کا کھلا چاقو لئے کھڑا تھا۔

"کیوں علی اصغر۔ تمہیں جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ علی اصغر سیدھا کھڑا ہوگیا اور اس نے کہا۔

"نہیں! وہ مجھے نہیں ملی لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔"

"ہوں میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔" ناصر جمالی چاقو لہراتا ہوا آگے بڑھا۔

"تم اس کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہو اس لئے تمہارے علاوہ اور کون بتا

سکتا ہے۔" وہ پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"وہ میرے پاس موجود ہے اگر تم چاہو تو مجھ سے حاصل کرسکتے ہو۔"

"مگر اسے تم نے کیوں چرایا ہے؟" ناصر جمالی اسے چند لمحات غور سے دیکھتا رہا پھر اس نے چاقو اچھال کر پیچھے پھینک دیا اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کردیا۔

"تم اس نقش کا کیا کرنا چاہتے ہو' جانتے ہو وہ کیا چیز ہے؟ وہ راغشیف کا مقدس نشان تھا جسے اس کا بھائی قبضے میں نہیں کرسکا تھا.......... کرائے کے قاتلوں نے راغ کا کام تمام کردیا اور اس کے قتل ہونے کا ثبوت ساتھ لائے تھے لیکن انہیں راغشیف کی سب سے بڑی ملکیت کا ذرا بھی علم نہیں تھا۔"

"خوب! گویا میرا اندازہ درست تھا تم اس نقش کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔ تمہیں شروع ہی سے اس کے بارے میں علم تھا اور جب میں حقیقت کے قریب پہنچا تو تم نے اسے غائب کردیا۔" علی اصغر نے کہا۔

"بے وقوف ہو تم احمق ہو!" ناصر جمالی چیخ کر بولا۔ "اگر میں مُردوں کو زندہ کرنے کے راز سے واقف تھا تو کیا اسے اس طرح احمقانہ طریقے سے غلط استعمال کرتا؟ علی اصغر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ واقعات کی ان کڑیوں کا پس منظر جانے بغیر وہ ناصر جمالی یا کسی اور کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کرسکتا تھا۔

"اس کے باوجود ناصر جمالی تمہیں میرے ساتھ پولیس کے پاس چلنا پڑے گا۔" علی اصغر نے کہا۔

"بڑی خوشی سے۔" ناصر جمالی نے جواب دیا۔ "مجھے مزید تباہی سے بچانے کے لئے تمہارے ساتھ تعاون کرنے میں بے حد مسرت ہوگی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میرے ساتھ آؤ۔" علی اصغر نے کہا۔ دروازے پر پہنچ کر ناصر جمالی نے کہا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو دوست کہ ان سارے معاملات میں کس کا ہاتھ ہے؟"

"میں گو صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ کچھ پُراسرار طاقتیں کام کر رہی ہیں جنہیں اعلیٰ ترین سائنسی دماغ بھی نہیں سمجھ سکتے بس اس کے علاوہ میں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔" ناصر جمالی پُرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا تھا۔

☆------☆------☆

پروفیسر بخاری نے الماری سے برانڈی کی بوتل اٹھائی اور گلاس لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن پھر پتہ نہیں کس خیال کے تحت اس نے بوتل وہیں رکھ دی اور گلاس اس کی جگہ واپس رکھ دیا۔ اس وقت اس کے ذہن کا بالکل صاف ہونا ضروری تھا بہت سے کام کرنے تھے اسے۔ علی اصغر اس سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔ اس نے اس سنہرے نقش کے بارے میں اپنے شبہات کا اظہار کیا تھا۔ پروفیسر بخاری جانتا تھا کہ وہ نوجوان لڑکا صحیح سمت میں جا رہا ہے اور اب اس کا کام تھا کہ اس کا تعاقب کرے۔

علی اصغر نے سر پر چوٹ کھاتے ہوئے میز پر چند کاغذات چھوڑے تھے جنہیں پروفیسر بخاری پڑھ چکے تھے۔ اس نے جو پوائنٹ لکھے تھے۔ انہیں ایک دوسرے سے مربوط کر کے ان کا مطلب نکالنے کی کوشش کی۔ ایک جملہ اس کی سمجھ میں آگیا۔ (زندگی میں مقدس الفاظ) چنانچہ پروفیسر بخاری اس جملے کو پڑھنے کے بعد ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہوگیا۔ اسے برانڈی کی طلب شدت سے محسوس ہونے لگی لیکن اسے ترغیب کو دبانا تھا وہ اپنے مخالفوں پر ایک بار پھر اپنی اہمیت واضح کرنا چاہتا تھا۔ وہ بتانا چاہتا تھا کہ وہ خود ہی یہ سب کچھ کر سکتا ہے ابھی وہ اسی کوشش میں مصروف تھا کہ دفعتاً دریچے کے شیشے ٹوٹنے کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا اور اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ دریچے کا شیشہ ٹوٹا اور پھر چوکھٹ بھی باہر نکل آئی لیکن جو کوئی اس سے اندر داخل ہو رہا تھا اسے دیکھ کر پروفیسر بخاری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کپڑوں میں لپٹی ہوئی ممی تھی۔ پروفیسر بخاری ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور پھرتی سے باہر کی میز پر رکھا ہوا پستول نکال لیا۔ اس نے سائلنسر لگے ہوئے پستول سے ممی پر گولی چلادی۔ پہلی گولی دوسری اور پھر تیسری، ممی لمحے بھر کو رکی اور پھر آگے بڑھ کر پروفیسر بخاری کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ دوسرے ہی لمحے پستول ٹیڑھا ہو کر ایک طرف گر پڑا تھا اور اب پروفیسر بخاری کو اس ممی سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا تھا۔ اس نے پروفیسر بخاری کو پوری قوت سے اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا اور وہ اس کے ہاتھوں پر سر سے بلند ہونے لگا۔

دفعتاً پروفیسر بخاری کے منہ سے آواز نکلی۔ "میں ان لوگوں میں سے تھا جنہوں نے اس کھدائی کی مخالفت کی تھی کیونکہ اس کے راز میرے سینے میں موجود تھے۔ میں تجھے مقدس نقش کا واسطہ دیتا ہوں جو تجھے تیرے والد کا عطیہ تھا۔"

ممی کے بدن میں تھرتھری دوڑ گئی۔ اس نے پروفیسر بخاری کو نیچے اتار دیا۔

"ہاں تیرے مجرم دوسرے لوگ ہیں۔ اگر تو میری زندگی بخش دے تو میں تجھے ان سے آگاہ............ کر سکتا ہوں۔"

ممی خاموش کھڑی ہوئی تھی۔

"پہلا مجرم۔ ناصر جمالی جو ان مقبروں کی نشاندہی کا ذریعہ بنا تھا............ اور اس کے بعد تیرے نوادرات مجرمانہ طور پر اپنے قبضے میں رکھنے کا خواہاں تھا پر اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اور تیرا دوسرا مجرم۔"

ممی کی سوالیہ نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ "تیرا دوسرا مجرم خان سلاما ہے اور مقدس راز تو جانتا ہے کہ وہ کون ہے۔"

ممی دفعتاً پلٹ گئی۔ ممی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ تب پروفیسر کے چہرے پر گہرے سنجیدگی کے آثار پھیل گئے۔

"تاریخ میں ایسا ممکن نہیں ہے کاش میری کوئی کوشش انہیں بچا سکتی لیکن یہ بات صرف میں جانتا ہوں کہ میں مجبور ہوں۔"

خان سلاما اپنی خوبصورت رہائش گاہ کے حسین ترین کمرے میں بیٹھا روشی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی انوکھی چمک روشی کو مسحور کئے ہوئے تھی۔ دفعتاً اس نے کہا۔

"موت سے میرے پیار کی سچائی مشکوک ہوتی ہے کیونکہ اسے زندگی کی ایک ضرورت بھی تصور کیا جاسکتا ہے لیکن موت کے بعد جو پیار ہو وہ سچائی کا عطیہ ہوتا ہے۔"

"کیا موت کے بعد پیار کا تصور رہ جاتا ہے؟" روشی نے پوچھا اور خان سلاما چونک پڑا۔

"تم نے کچھ کہا؟"

"تم کہاں گم تھے؟"

"پتہ نہیں میں الجھن میں ہوں۔ پریشان ہوں۔"

"کیوں؟"

"تمہارے لئے۔"

"میرے لئے کیوں؟"

"مجھے لندن سے جانا پڑ رہا ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"کاش میں بتا سکتا لیکن تم فکر نہ کرو۔ تم لوگوں کے قیام کے لئے یہ جگہ موزوں ترین ہے۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"مگر میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"دوسروں کے بغیر رہ سکتی ہو..........؟" خان سلاما نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں سب کے بغیر رہ سکتی ہوں سوائے تمہارے۔" روشی آہستہ سے بولی۔

"روشی تم بھی میرا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاؤ لیکن دوسرے لوگوں کو اطلاع نہ دوں گی؟"

"مجھے اب کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تمہارے علاوہ اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم انہیں اطلاع ضرور دے دو.........."

"کس طرح؟"

"بہتر ہے کہ ایک تحریر ان کے لئے چھوڑ دو۔ اوپر کے کمرے میں ڈرائنگ ٹیبل موجود ہے تم انہیں لکھ دو کہ باپ کی موت کے بعد تم کسی کو اپنا ہمدرد نہیں سمجھتیں چنانچہ اپنی زندگی کے لئے تم ایک بہتر فیصلہ کر رہی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" روشی نے کہا اور اوپری منزل کی طرف چل پڑی۔ ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس نے قلم ہاتھ میں پکڑا اور لکھنے لگی۔ اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لئے رکا۔ علی اصغر اسے یاد آیا۔ دل میں ایک عجیب سا احساس ابھرا نفرت کی ایک لہر خان سلاما کے لئے دل میں جاگی یہ کیا ہو رہا ہے میں.......... میں علی اصغر کو کیسے چھوڑ سکوں گی؟

دفعتاً نچلی منزل سے ایک دھماکے کی آواز ابھری اور پھر اس کے ساتھ ہی فرنیچر ٹوٹنے کی آوازیں۔ ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہ آپس میں لڑ پڑے ہوں۔

وہ برق رفتاری سے اپنی جگہ سے اٹھی اور نیچے کی سمت دوڑی لیکن ابھی زینے پر ہی تھی کہ اس نے نیچے ہال میں ایک خوفناک منظر دیکھا۔ خان سلاما اور.......... اور کپڑوں میں لپٹی ممی ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ ممی کے ہاتھوں کا شکنجہ خان

سلاما کے حلق پر تنگ ہوتا جا رہا تھا اس کے حلق سے ایک بے اختیار چیخ نکل گئی۔

اور اس آواز پر ممی اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ پھر اس نے خان سلاما کے نیم مردہ بدن کو چھوڑ دیا اور اسے اپنے پیروں سے کچلتی ہوئی زینے کی طرف چل پڑی۔ روشی نے دوبارہ اوپر دوڑ لگادی تھی اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ دروازہ بند کرلے۔ اس نے ایسا ہی کیا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک تڑاخہ ہوا اور دروازہ ٹوٹ کر زمین پر آپڑا۔ ممی کمرے میں داخل ہوگئی تھی روشی دیوار سے آلگی۔ اس کی دہشت سے پھٹی ہوئی آنکھیں ممی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پُراسرار انداز میں آگے بڑھ رہی تھی لیکن اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی جس کو روشی سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس وقت خان سلاما جو زخمی ہوا تھا مرا نہیں تھا اوپر آگیا۔ کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہونے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔

دفعتاً وہ چیخا۔ زبان ایسی عجیب اور ناقابلِ فہم تھی کہ روشی کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا لیکن ممی رک گئی خان سلاما آگے بڑھا تو ممی نے اسے زور سے دھکا دے دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا دور جا گرا لیکن باہر سے دھینگا مشتی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ خان سلاما اپنی جگہ سے اٹھا اس نے روشی کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

باہر پولیس کے بے شمار جوانوں نے مل کر ممی کو رسیوں کے ایک مضبوط جال میں جکڑ رکھا تھا ممی کو اس حال میں دیکھ کر دفعتاً خان سلاما کی حالت بدل گئی۔ اس کے منہ سے ایک غراہٹ نکلی۔

"اسے چھوڑ دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے چھوڑ دو اسے۔" جال کی رسیاں خود بخود ٹوٹ گئیں تب خان سلاما آگے بڑھا۔ "تیرا قاتل میں ہوں راغشیث ہاں مجھے پہچان مجھے زندہ رہنے کی بددعا ملی تھی۔ میرا خون تیرے ہاتھوں ہو سکتا ہے صرف تیرے ہاتھوں میں تجھ سے موت مانگتا ہوں میرے بھائی مجھے صرف موت درکار ہے۔" ممی کھڑی ہوگئی تھی۔

"میں تیرا بدنصیب بھائی ہوں۔ تیرا قاتل تجھے ہلاک کرنے والا۔"

ممی خاموش کھڑی تھی۔ اس وقت ناصر جمالی علی اصغر کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ وہاں کی صورت حال دیکھ کر وہ بے قابو ہوگیا تھا۔

"آہ! تو وہ وقت آگیا جسے پانے کے لئے میں کوشاں تھا۔ یہ لوگ یہاں دوبارہ آگئے.......... لیکن تمہارے عقیدوں کی بے حرمتی کرنے والا میں ہوں اس لئے

موت سب سے پہلے مجھے آنی چاہئے۔" اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ ممی اس کی طرف گھومی اور اس نے جمالی کی گردن گرفت میں لے لی۔ جمالی کا بدن اس کی گرفت میں پھڑک رہا تھا دفعتاً پولیس انسپکٹر چونک کر سنبھلا اور اس نے نشانہ باندھ کر.......... پورا پستول ممی پر خالی کردیا لیکن ممی کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ پھر اس نے خان سلاما کی طرف رخ کیا اور اس بار خان سلاما اس کی گرفت میں تھا۔ پولیس کی کوئی کوشش کارگر نہ ہوسکی تھی۔ خان سلاما کا بے جان بدن اب ممی کے ہاتھوں میں جھولنے لگا۔ پھر اس نے سلاما کے بدن کو دونوں ہاتھوں میں اٹھالیا اور ایک کھلی ہوئی کھڑکی کی طرف چل پڑی۔

پولیس والے بے بس کھڑے ہوئے تھے۔ ممی کھڑکی سے دوسری طرف کود گئی اور سب اس طرف دوڑ پڑے لیکن نیچے کا منظر پُرسکون تھا۔ وہ نیچے نہیں آئے تھے۔

ہاں بہت دور.......... فضاؤں میں ایک نقطہ سا نظر آیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ سب بت کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ تب پروفیسر بخاری کی آواز ابھری۔

"کئی نسل کے لوگ تاریخ میں تحریف نہیں کرسکتے۔ جو گزر گیا اس میں تبدیلی کیسے ممکن ہے۔ ہاں مستقبل اور حال انسان کے قبضے میں ہے لیکن ماضی تو کسی کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ یہ صدیوں پرانی کہانی ہے۔ ہزروں سال پرانی۔ ہم اس میں تبدیلی نہیں کرسکتے۔"

"لیکن میں اب کس پر کیس بناؤں؟ اتنے قتل ہوگئے اور قاتل کوئی نہیں ہے۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ہم میں سے جو بھی اس قابل ہو اسے گرفتار کرلو انسپکٹر۔" علی اصغر نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا اور انسپکٹر شانے جھٹکنے لگا۔ روشی علی اصغر سے کہہ رہی تھی۔

"کیا ہوگیا کوئی خاص بات ہے کیا' سب لوگ یہاں کیوں جمع ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ صرف تمہاری واپسی ہوئی ہے۔ آؤ۔" پھر اس نے روشی کا بازو پکڑا اور ایک طرف چل پڑا۔

☆------☆------☆

کوشش ناتمام

ویران حویلی میں بند انتقام کی پیاسی ایک بدروح کی پُراسرار داستان جسے زندہ دفن کردیا گیا تھا۔

ایک ہوس کار مرد کا قصہ عبرت۔

وہ حسینوں کا شکاری تھا۔

حیرت وتحیر سے بھرپور انوکھی کہانی۔

میں نے لندن کی پُر رونق فضاؤں میں زندگی کے اٹھارہ برس گزارے تھے۔ یہا
کی حسین زندگی نے کبھی مہلت ہی نہیں دی کہ اپنے وطن کے بارے میں سوچتا۔

والدہ بچپن میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔ والد صاحب نے ایک طویل عرصہ تجرد
عالم میں گزارا۔ لوگوں نے عزیز واقارب نے بہت مجبور کیا تھا کہ دوسری شادی کرلی
لیکن والد صاحب کا خیال تھا کہ میری دوسری ماں میری زندگی کے لئے قہر بن جائے گی
چنانچہ ایک طویل عرصہ تک وہ انہیں ٹالتے رہے۔ پھر کسی نے ایک خوبصورت لڑکی
والد صاحب پر مسلط کردیا۔ تجرد کی زندگی گزارنے والے غفور احمد صاحب اس لڑکی
جال میں پھنس گئے لیکن اس وقت بھی انہوں نے میری بہتری کو نظرانداز نہیں کیا تھا
انہوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے مستقل لندن میں رکھا جائے اور وہیں میری تعلیم وتربیت
بندوبست کردیا جائے۔

کچھ ہمدردوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ نئی بیوی کی اولاد بالآخر میری اہمیت ختم کرد
گی اور جائیداد وغیرہ اس کے نام ہوجائے گی۔ والد صاحب نے بھی اس حقیقت کو تسلی
کرتے ہوئے فیصلہ کیا کہ جائیداد اور کاروبار کا ایک بڑا حصہ میرے نام کردیا جائے اور میر
کاروبار اس کاروبار سے الگ ہوجائے جو والد صاحب کررہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ا
پر عمل کیا اور میں گیارہ سال کی عمر میں ہی صاحبِ جائیداد اور صاحب کاروبار بن گیا۔ ا
کاروبار کا مکمل انتظام ایک نیک نفس شخصیت ظُہیر علی کے سپرد کردیا گیا جو پوری محنت او
جانفشانی سے اسے ترقی دینے میں کوشاں ہوگئے۔

بارہ سال کی عمر میں، میں لندن آگیا اور ایک ہندوستانی شہزادے کی مانند زندگ
گزارنے لگا۔ یہ عمر چھوٹی تھی لیکن لندن کی آزاد فضاؤں نے مجھے چھ سال کے عرصے م
جوان کردیا۔ اٹھارہ سال کی عمر تھی جب ایک اٹھائیس سالہ خادمہ جوزیفائن نے جو میر
کوٹھی کی نگراں تھی، مجھے عورت سے روشناس کرایا اور اس ناتجربہ کاری کی عمر م

عورت اتنی دلکش محسوس ہوئی کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

جوزیفائن نے اسی پر اکتفا نہ کی۔ بلکہ چند ہی ماہ کے بعد وہ کیتھرائن کو لے آئی جو
صرف انیس سال کی تھی لیکن یہ جوزیفائن کی حماقت تھی کہ اس نے اپنی تباہی کا سامان
کیا۔

کیتھرائن نے جوزیفائن کی حیثیت ختم کرادی اور اس کے بعد آٹھ ماہ تک وہ میری
ذات پر نگراں رہی لیکن اب مجھ پر زندگی کے رموز کھلتے جارہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوگیا
تھا کہ دنیا صرف جوزیفائن یا کیتھرائن ہی تک محدود نہیں ہے اور بھی بہت کچھ ہے اس
سنسار میں۔ چنانچہ میں خود آگے بڑھ کر یہ سب کچھ حاصل کرنے لگا اور لندن کے فراخ
ماحول میں کچھ حاصل کرلینا مشکل کام نہیں تھا۔ دولت کی فکر نہیں تھی میرا اپنا کاروبار
بہت وسیع تھا۔ والد صاحب دوسری شادی کرکے مطمئن ہوگئے تھے۔

پھر میرے منیجر ظہیر علی صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ میری دوسری ماں کا بھی انتقال
ہوگیا اور والد صاحب شدید بیمار ہیں لیکن یہ اطلاع میرے لئے کیا دلچسپی رکھتی۔ میں نے
اسے پڑھا اور ضائع کردیا۔ دوسری ماں سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی اس لئے جائیداد کا
کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔ اب تو میں والد صاحب کو بھی تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ کمی کس چیز
کی تھی جو فضول باتوں کو یاد رکھا جائے۔ مجھے تو اس وقت بھی کوئی احساس نہیں ہوا جب
مجھے والد صاحب کے انتقال کا تار ملا۔

میں اس وقت مَیری کے ساتھ محوِ عیش تھا۔ پرتگال کی قیمتی شراب کے دو جام اور
اسپینی لڑکی ڈیلا شاہم کے آتشیں بدن کے جام ہی جام۔ میں نے تار پھاڑ کر پھینک دیا اور
ڈیلا کے بدن کے پیچ وخم شمار کرنے لگا۔ بس اتنی سی بات۔

یوں اٹھارہ سال گزر گئے۔ ہرچند لندن کی زندگی کو میں دن رات اپنے بدن کا خون
دے رہا تھا لیکن خون کی کمی پوری کرنے کے لئے بے انتہا دولت تھی اور دولت خون کم
نہیں ہونے دیتی۔ اب تو میں جوان ہوا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ تو بچپن کی بات تھی ابھی تو
جوانی کے قصے باقی تھے۔

لیکن واقعات کے بھنور انسانی قوت کے تابع نہیں ہوتے بالآخر مجھے اپنے وطن
واپس آنا پڑا۔ ظہیر علی صاحب کا بھی انتقال ہوگیا تھا اور انہوں نے اپنا کاروباری نظام اپنے
بیٹے منور علی کے سپرد کردیا تھا۔ منور علی نے مجھے لکھا کہ چند قانونی پیچیدگیاں ہوگئی ہیں
جنہیں دور کرنے کے لئے میری وطن واپسی ضروری ہوگئی ہے۔

مجھے یہ بات پسند نہیں آئی تھی لیکن میرے ہندوستانی دوست حامد رضا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا:

"آخر تمہیں وطن سے اتنی الجھن کیوں ہوتی ہے۔"

"یہ رنگ رلیاں وہاں کہاں۔" میں نے کہا۔

"گدھے ہو بالکل؟" حامد رضا ہنس کر بولا۔

"وہ کیوں؟"

"کیا تمہیں ہندوستان بالکل یاد نہیں رہا؟"

"کسی حد تک۔"

"بیوقوف آدمی۔ جو لطف وہاں کی فضاؤں میں ہے یہاں کہاں' حسین اور الھڑ کنواریاں ایک نیا جہاں رکھتی ہیں۔ تم لندن بھول جاؤ گے۔ یہاں کی لڑکیوں میں کیا رکھا ہے۔"

"میں بیوقوف نہیں ہوں بلکہ اب تم مجھے بیوقوف بنا رہے ہو۔"

"چل کر دیکھ لو واپس بھی آ سکتے ہو۔"

"ہوں' لیکن ایک شرط پر۔"

"وہ کیا ہے؟"

"تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"بھئی اگر تم تسلیم کرو تو ایک بات کہوں۔" حامد رضا بولا۔

"ضرور کہو۔"

"میں تو یہاں بھی تمہارے ہی ٹکڑوں پر پل رہا ہوں۔ وہاں بھی میرا بوجھ تمہیں اٹھانا پڑے گا سوچ لو۔ یہ مت کہنا کہ میں تمہیں بیوقوف بنا کر کھا رہا ہوں۔" حامد رضا نے کہا اور میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"بس اتنی سی بات۔ تو میرا دوست ہے حامد اور خدا کا شکر ہے کہ میرے پاس دولت بہت ہے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

"بات تو ہے۔ یہاں تمہیں سمجھانے بجھانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہاں تمہارے عزیز و اقارب ہوں گے۔"

"تو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے لیکن یار تجھے میرا ایک کام کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟"

"میری زمینوں اور جائیداد کے جھگڑے تمہیں نمٹانے ہوں گے۔ یوں سمجھ لے تو میرا قائم مقام ہوگا اور میں صرف آزادی پسند کروں گا۔"

"مجھے منظور ہے لیکن اس کے لئے تمہیں مجھے ملازم رکھنا ہوگا تاکہ میری ایک قانونی حیثیت بھی ہو جائے۔"

"اگر تو اس میں خوش ہے تو ٹھیک ہے مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا اور پھر دو تین دن کے اندر رضا کو میں نے وہ حیثیت دے دی جس کا اس نے اظہار کیا تھا اس کے بعد ضروری تیاریاں کر کے ہم چل پڑے۔

اٹھارہ سال کے بعد وطن کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ بچپن کی بہت سی یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ عزیز و اقارب کی ایک فوج نے میرا استقبال کیا تھا۔ رشتے گنوائے گئے تھے۔ میں نے اخلاقاً ان سب باتوں کو برداشت کیا اور کئی دنوں تک ان کے ہاتھوں میں کھلونا بنا رہا۔ شہر میں میری ایک عظیم الشان کوٹھی تھی اور اس کے اطراف میں میرے عزیزوں کے مکانات پھیلے ہوئے تھے جو دن رات حملہ آور رہتے تھے۔

چند روز تو میں نے انہیں برداشت کیا اور پھر اس کے بعد ان سے خشک رویہ اختیار کر لیا۔ میں نے ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں اب اپنی کاروباری مصروفیات میں توجہ دینا چاہتا ہوں اس لئے وہ لوگ مجھے تنہا چھوڑ دیں۔ طرح طرح کی باتیں ہوئیں لیکن مجھے ان کی پرواہ کب تھی۔

ظہیر علی کے بیٹے منور علی نے مجھ سے ملاقات کر کے کاروباری تفصیلات بتائیں اور میں نے حامد رضا کو پیش کر دیا۔ "ان کی حیثیت میری مانند ہے جو کچھ کرنا ہے ان سے مدد لو۔ میں ذرا آزادی پسند ہوں۔"

"بہتر جناب۔"

"جہاں میری ضرورت پیش آئے میں ساتھ ہوں۔ تم اپنی ساری الجھنیں ان سے کہہ سکتے ہو۔" میں نے اپنا بوجھ حامد رضا کے کندھوں پر رکھ دیا۔ ان سارے کاموں سے نمٹ کر میں نے حامد رضا سے کہا۔

"یار یہ تو سب کچھ ہو گیا لیکن اب میرے لئے بھی تو کوئی بندوبست کرو۔"

"صبر کرو میرے دوست۔ ذرا سے حالات تو قابو میں آ جائیں۔ باقی بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تم ایسا کرو اپنی جاگیر گھوم آؤ۔"

"ہوں۔ مشورہ تو ٹھیک ہے منور علی سے کہہ کر میرے لئے بندوبست کر دو۔ میں

عدل پور جاؤں گا۔" میں نے کہا اور حامد رضا نے گردن ہلادی۔ عدل پور مجھے یاد تھا۔ پ
ہم وہیں رہتے تھے۔ ضروری تیاریوں کے بعد میں عدل پور روانہ ہوگیا۔ وہاں
کارندے کو میری آمد کی اطلاع دے دی گئی۔

سیدھے سادے قصبے کے ماحول میں رہنے والوں نے مجھے خوش آمدید کہا اور مجھ
بچپن کے واقعات یاد آنے لگے۔

"ہماری ایک حویلی بھی تو تھی یہاں۔" میں نے دلاور خاں سے پوچھا۔

"پہلی کوٹھی کی بات کر رہے ہیں سرکار۔"

"ہاں۔"

"وہ جوں کی توں ہے۔ اب تو اس کے قریب بھی کوئی آبادی نہیں ہے۔" دلاو
خان نے بتایا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"سرکار بھول گئے۔ بچپن کی بات ہے۔ وہ حویلی آسیب زدہ ہے۔"

"آسیب کیا چیز ہوتی ہے؟"

"جن بھوت سرکار۔ یہ بات تو آپ کے دادا کے زمانے سے مشہور تھی۔ پہلی حویلی
تو سو سال سے ویران پڑی ہے۔"

"اوہ لیکن میں ان چیزوں کا قائل نہیں ہوں۔"

"کیا مطلب ہے سرکار کا؟"

"مجھے تنہائی پسند ہے۔ اگر حویلی پسند آئی تو ممکن ہے میں وہیں قیام کروں۔"

"ارے نہیں سرکار۔ ہمارے بڑے پاگل تو نہیں تھے جو پہلی حویلی کو اس طرح
چھوڑ دیتے۔ ہمیں آپ کی زندگی عزیز ہے۔"

"دلاور خاں۔ میں اس حویلی کو دیکھوں گا۔"

"مگر کوئی آپ کے ساتھ وہاں جانے کو تیار نہیں ہوگا سرکار۔"

"کیا مطلب؟"

"بڑے ڈراؤنے قصے ہیں وہاں کے۔ سالہا سال ہوگئے۔ لوگ وہاں سے گزرتے
نہیں ہیں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" میرے ذہن میں حویلی جانے کا بھوت سوار ہوگیا
لیکن دلاور خان نے کہہ دیا کہ وہ میرے لئے وہاں کسی کو جانے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اد

میں نے فیصلہ کرلیا کہ خود ہی وہاں جاؤں گا۔

چنانچہ میں تیاریاں کرکے چل پڑا۔ بچپن میں ایک بار میں نے یہ حویلی دیکھی تھی اور میرے ذہن میں اس کے خدوخال جاگ رہے تھے۔ حویلی آبادی سے تقریباً تین میل دور تھی۔ میں یہ فاصلہ طے کرکے بالآخر پہلی حویلی کے پاس پہنچ گیا۔ میرے اجداد کی تعمیر کی ہوئی یہ پرشکوہ عمارت آج بھی جوں کی توں موجود تھی۔ اس کے بڑے دروازے پر ایک قفل پڑا ہوا تھا جس کی چابی بھی اس کے نزدیک ہی لٹکی ہوئی تھی تقریباً آٹھ انچ لمبی اس چابی سے میں نے تالا کھولا اور وزنی کواڑوں کو دھکا دیا تو وہ کھل گئے۔

اندر کی فضا میں کوئی سیلن کوئی گھٹن نہیں تھی۔ انتہائی مضبوط پائیدار اور وسیع حویلی تھی۔ میں اس کے ایک ایک کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ بلاشبہ یہ ویران حویلی ہیبت ناک تھی۔ اسے دیکھ کر عجیب سی کیفیت کا احساس ہوتا تھا تاہم میں خوفزدہ نہیں تھا۔

پوری حویلی کا جائزہ لینے میں کافی وقت صرف ہوگیا۔ پھر میں اس کے عقبی باغ کی طرف نکل گیا۔ اجاڑ باغ میں بہت سے درخت تھے لیکن خشک اور سوکھے ہوئے، کسی درخت میں نئی کونپلیں بھی پھوٹ رہی تھیں۔ اسی سمت ملازموں کے مکانات بھی تھے۔

لیکن ایک مکان کی چمنی سے دھواں نکلتے دیکھ کر میں چونک پڑا۔ اس ویران حویلی میں کسی کا وجود میرے لئے حیرت ناک تھا۔ اگر میں نے مشرق کی فضا میں زندگی گزاری ہوتی تو ممکن ہے یہ قصے میرے لئے بھی اتنے ہی ہیبت ناک ہوتے جتنے مقامی لوگوں کے لئے لیکن میں ان فضولیات سے دور ہی رہا تھا۔ اس لئے مجھے ان سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ چنانچہ میں اس چھوٹے سے مکان کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے مکان کے بند دروازے پر دستک دی اور چند ساعت انتظار کرتا رہا۔ دوسری بار دستک دینے پر اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو۔" میں نے بھاری آواز میں کہا اور چند ساعت کے بعد دروازہ کھل گیا۔ بدبو کا ایک بھپکا باہر نکلا تھا اور اس کے بعد درمیانے قدوقامت کا ایک دیہاتی جس کے خدوخال سادہ سے تھے۔ وہ معصوم نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"جی سرکار۔" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

"لالو ہے ہمارا نام سرکار۔"

"اس ویران حویلی میں تنہا رہتے ہو؟"

"ہاں سرکار۔"
"کس کی اجازت سے یہاں رہتے ہو؟"
"اجازت تو کسی سے نہیں لی ہے مائی باپ اور کوئی ٹھکانہ نہیں ملا تو ہم یہاں ر
لگے پھر یہاں اور تو کوئی آتا ہی نہیں۔"
"کھاتے پیتے کہاں سے ہو؟"
"بس سرکار۔ سامان لے آتے ہیں بستی سے یہیں پکا کھا لیتے ہیں۔ پر آپ کون
سرکار؟" اس نے عاجزی سے پوچھا۔ مجھے اس کی سادہ نگاہیں اپنا جائزہ لیتی ہوئی محس
ہوئی تھیں۔
"میں اس حویلی کا مالک ہوں۔"
"آپ؟" اس نے حیرانی سے کہا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گ
"بڑے سرکار کے پوتے ہوں گے آپ؟"
"کون بڑے سرکار؟"
"سرکار حمید الدین خان صاحب۔" اس نے کہا اور میں نے گہری سانس لی۔
درحقیقت میرے دادا کا نام تھا۔
"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔"
"دھن واد سرکار۔ کسی نے اس حویلی کی خبر تو لی۔ ورنہ اس خاندان کے دوسر
لوگ تو اسے بھول ہی گئے تھے۔"
"تم انہیں کیسے جانتے ہو لالو؟" میں نے پوچھا۔
"ہم بھی پرکھوں سے یہاں رہتے تھے سرکار۔ ہمارے ماتا پتا بھی یہیں رہتے ت
ہم نے اسی حویلی میں جنم لیا تھا۔ سرکار کے خادموں میں سے ہیں۔" اس نے ہاتھ جوڑ
ہوئے کہا۔
"تمہارے ماتا پتا کہاں گئے؟"
"مر گئے بیچارے۔ اب اس سنسار میں ہمارا کوئی نہیں ہے۔ اکیلے رہ گئے ہیں۔
باپ۔ آپ مالک ہیں اگر آپ اجازت دیں گے تو یہاں پڑے رہیں گے ناراض ہوں گ
کہیں چلے جائیں گے۔"
"ہوں۔" میں نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی اور غور سے لالو کو دیکھنے لگا۔
میں نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور وہ چپ چاپ میرے ساتھ آگے بڑھ آ

میں اسے ایک صاف ستھرے کمرے میں لے گیا۔ "لالو۔ اگر میں یہاں رہنا چاہوں تو
تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔"
"ارے سرکار۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ مالک ہو کر نوکروں سے یہ سوال
کر رہے ہیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔
"تم یہاں میرے لئے ضروری چیزوں کا بندوبست کر سکتے ہو؟"
"جو حکم دیں گے سرکار۔"
"سوچ لو لالو۔ تمہیں میرے لئے بہت کچھ کرنا ہوگا۔"
"پرکھوں سے آپ کے غلام ہیں مائی باپ۔ یہ تو لالو کی خوش نصیبی ہوگی کہ اس کے
مالک اس سے پھر کوئی کام لیں۔" وہ بولا۔
"میرے کھانے پینے کا بندوبست۔"
"سب ہو جائے گا سرکار۔"
"اس کے علاوہ ایک کام اور۔" میں نے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا اور وہ
سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ "لالو تمہیں میرے لئے بستی کی خوبصورت لڑکیوں کا
بندوبست کرنا ہوگا اس کام کے عوض جو کچھ تم مانگو گے میں تمہیں دوں گا۔ وعدہ کرتا
ہوں۔"
لالو تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اور پھر اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا
ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "یہ بھی ہو جائے گا سرکار۔ وعدہ کرتا
ہوں۔"
"ارے جیتے رہو لالو۔ اگر یہ بات ہے تو تم میرے نوکر نہیں دوست ہو لیکن دیکھو
یہ کام رازداری سے چلنا چاہئے۔ میں تمہیں اس کی ترکیب بتاؤں گا۔ اب تم یوں کرو۔
اس حویلی میں ایک عمدہ سا کمرہ میرے لئے صاف کر دو۔"
"آیئے سرکار۔ ہم آپ کی آرام کی جگہ بتائیں۔ وہاں سب کچھ موجود ہے۔" لالو
نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔ اس آدمی کے مل جانے سے مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔
لالو جس کمرے میں مجھے لے گیا اسے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ایک خواب گاہ تھی
اس میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر موجود تھا۔ ہر چیز قرینے سے سجی ہوئی تھی۔ "بیٹھ جاؤ میرے
دوست۔ لو پہلے یہ پیسے رکھو اور میری ضروریات کا سامان خرید لاؤ۔ تمہیں میرے لئے
سب کچھ کرنا ہوگا۔ ہاں لالو یہ تو بتاؤ یہ حویلی بستی میں آسیب زدہ کیوں مشہور ہے؟"

"ویران جو پڑی رہتی ہے سرکار۔ لوگ ایسی جگہوں کو بھوت پریت کا گھر بتا
ہیں۔"

"تم نے کوئی آسیب یہاں دیکھا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں سرکار۔ یہاں ہمارے علاوہ کوئی نہیں آیا۔ لوگوں کا ک
جس کا جو دل چاہتا ہے کہہ دیتا ہے۔ ہاں یہ حویلی ہے بہت عرصے سے ویران اور
کوئی ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔"

"اتنی عالی شان حویلی خالی کیوں پڑی ہے لالو۔ کیا تمہیں اس بارے میں کچھ
ہے؟"

"ہاں سرکار ایک کہانی سنی تو ہے اس بارے میں۔ آپ کے خاندان کی کہانی
آپ نے نہیں سنی؟" لالو نے پوچھا۔

"نہیں۔ کیا کہانی ہے مجھے سناؤ۔"

"زیادہ تو نہیں معلوم سرکار بس اتنا سنا ہے کہ آپ کے خاندان کے کسی فرد کو
چمارن سے عشق ہو گیا تھا۔ بڑی سندر تھی وہ سسری بھی۔ نیچ ذات کی ہو کر اونچی بننے
خواب دیکھ رہی تھی۔ بہت عرصہ تک تو یہ عشق خاموشی سے چلتا رہا لیکن پھر آپ
خاندان کے اس مرد نے ایک دن اس خوبصورت چمارن کو اچھا جوڑا پہنایا اور گھر
آیا۔ اس نے کہا تھا کہ اس نے بڑے خاندان کی اس لڑکی سے شادی کر لی ہے چمارن
ایک بھائی تھا۔ جو بہن کے ساتھ اس حویلی میں آ گیا تھا۔

نہ جانے کس طرح تمہارے خاندان والوں کو پتہ چل گیا کہ وہ چمارن ہے۔ بس
کیا تھا۔ دونوں بہن بھائی کو زندہ اسی حویلی میں دفن کر دیا گیا۔ کسی کو کانوں کان خبر
نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے ہی اس حویلی کو آسیب زدہ قرار دے دیا گیا اور تمہار
خاندان کے لوگوں نے اسے خالی کر دیا۔"

"گویا یہ صرف ایک وہم کی کہانی ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں صاحب جی۔ ساری کہانی وہم کی ہے۔"

"لیکن ہم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں لالو۔"

"وہ کیسے سرکار؟" لالو نے پوچھا۔

"اس حویلی کو اب اور زیادہ آسیب زدہ ہونا چاہئے لیکن اس کے آسیب ہم اور
ہوں گے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ وہ گہری نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ "اور گاؤں

نواری لڑکیاں اٹھ کر یہاں آیا کریں گی۔ آسیب کی بات ہے کوئی کیا کر سکے گا۔"

"یہ میرا کام ہے سرکار۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

"بس ٹھیک ہے تم جاؤ اور پہلے کھانے پینے کا بندوبست کر لو۔ اس کے بعد ہم پہلا
کار کریں گے۔" میں نے کہا اور وہ خاموشی سے چلا گیا۔ رات میں نے اسی حویلی میں
گزاری مجھے تو کسی آسیب نے نہیں ستایا تھا۔ دوسری صبح لالو نے عمدہ ناشتہ پیش کیا۔ میں
س سلسلے میں ایک دلچسپ پروگرام بنا چکا تھا اور میں نے سوچا تھا کہ حامد رضا کو بھی اپنے
س پروگرام سے آگاہ نہیں کروں گا ممکن ہے اس پر شرافت کا بھوت سوار ہو جائے لیکن
مجھے کیا معلوم تھا کہ تقدیر میری برائی کے جواب میں میرے لئے برائی تجویز کر چکی ہے اور
یں اپنے ہاتھوں سے اپنے لئے گڑھا کھود چکا ہوں۔

دوسرے دن میں لوگوں کو دکھانے کے لئے واپس بستی پہنچ گیا۔ کارندے نے مجھے
یکھ کر شکر کا سانس لیا۔

"ہم نے ساری رات جاگ کر کاٹی ہے سرکار۔" کارندے نے کہا۔

"کیوں بھئی۔" میں نے ہنس کر پوچھا۔

"پوری بستی میں ایک بھی بانکا ایسا نہیں نکلے گا جو اس حویلی کی طرف جانے کی حامی
رلے۔ بس اسی لئے ہم پریشان تھے کہ خدا نہ کرے کہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔"

"کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی مجھے لیکن حویلی واقعی آسیب زدہ ہے۔ ایسے ایسے
اقعات پیش آئے کہ میں حیران ہوں۔"

"ہے نا سرکار۔ ہم نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔"

"اچھا اب تم میری واپسی کا بندوبست کردو میں جا رہا ہوں۔ میں نے کارندے سے
ہا اور ان لوگوں کو دکھانے کے لئے میں بستی سے واپس چل پڑا لیکن پھر ایک لمبا چکر
اٹ کر میں حویلی پہنچ گیا جہاں میرا دست لالو میرا انتظار کر رہا تھا۔

"دوپہر کا کھانا تیار ہے سرکار۔" اس نے کہا۔

"دوپہر کے کھانے کی چھوڑو رات کے کھانے کے لئے تُو نے کیا کیا ہے لالو؟" میں
نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور میرا مطلب سمجھ کر لالو کے ہونٹوں پر بھی
یک پُراسرار مسکراہٹ پھیل گئی۔

"رات کے لئے تو ایسے شکار کا بندوبست کیا ہے سرکار کہ روح بھی خوش ہو جائے
ی۔ رات تو آنے دو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی ٹھیک ہے۔ رات بھی کتنی دور ہے۔ دیکھ لیں گے۔" میں نے کہا اور حویلی کے مختلف گوشے دیکھنے لگا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ تھوڑے دن یہاں عیش کر کے بعد اس حویلی کی مرمت کرا کے اسے پھر آباد کروں گا اتنی عمدہ جگہ تھی کہ بس کہا نہیں جاسکتا۔"

شام ہوگئی۔ لالو اپنے مکان میں موجود نہیں تھا۔ شاید وہ شکار کی تلاش میں نکلا تھا۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ کیا تیر مار کر آتا ہے۔ ویسے گاؤں کی الہڑ دوشیزاؤں کو دیکھ کر منہ پانی تو بھر آیا تھا۔ طویل عرصہ کے بعد میری آرزو پوری ہونے جارہی تھی۔ ہندوستان آنے کے بعد تو تجرد کی زندگی بھی گزارنی پڑی تھی۔

بالآخر رات ہوئی۔ میں اپنے مخصوص کمرے میں بیٹھا لالو ہی کا منتظر تھا کہ وہ لے کر آگیا۔ "ارے تم کب واپس آئے؟"

"بہت دیر ہوگئی سرکار۔"

"اور میرے کام کا کیا ہوا؟"

"ہوگیا سرکار۔" وہ مسکرا پڑا۔

"اور تُو نے آکر مجھے بتایا بھی نہیں۔" میں نے بے صبری سے کہا۔

"رات تو ہوجائے سرکار ابھی کیا جلدی ہے۔ کھانا کھائیں اور پھر آرام سے اپنا دیکھیں۔" لالو نے کہا اور میں نے ایک طویل سانس لی۔ الٹا سیدھا کھانا کھایا اور پھر ہوگیا۔

تب لالو نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آیا۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"بس دوسرے کمرے میں سرکار۔ آیئے۔" وہ بولا اور میں اس کے ساتھ حویلی کے ایک کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ لالو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "اسے کھول لیجئے۔"

"یہ تابوت کہاں سے آیا؟" میں نے سوال کیا۔

"بس یہ میرا کام تھا سرکار۔ آپ اس کے بارے میں تفصیل نہ پوچھیں۔ اسے کھولیں پھر مجھے بتائیں کہ میں نے کیسا کام کیا ہے۔" لالو نے کہا اور میں نے آگے بڑھ کر تابوت کا قفل کھول لیا۔ اندر نگاہ ڈال کر میں ششدر رہ گیا تھا۔ سرخ لہنگے اور پیلی چولی

میں ایک آتشیں بدن محوِ استراحت تھا۔ اس کے خدوخال اتنے حسین تھے کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں بند تھیں اور ان پر پلکوں کی جھالر لہرا رہی تھی۔ چہرے پر ایسی آتشی ٹمٹماہٹ تھی کہ بس جان جاتی تھی۔ میں نے ایسا حسن اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

"کیسی ہے سرکار؟" لالو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا یہ سو رہی ہے؟"

"بے ہوش ہے۔ اسے ہوش میں لے آئیں۔ میں چلتا ہوں۔" لالو نے کہا اور باہر نکل گیا۔ میں نے اس کے لوچدار بدن کو تابوت سے باہر نکالا اور پھر اسے بازوؤں میں اٹھائے باہر نکل آیا اور چند ساعت کے بعد میں اپنے کمرے میں تھا۔ یہاں لاکر میں نے اسے بہ آہستگی بستر پر لٹا دیا اور پھر پانی کے چھینٹے اس کے چہرے پر مارنے لگا۔ میرا دل فرطِ مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اتنی حسین لڑکی اگر میرے وجود کو قبول کرلے تو لطف آجائے۔ میں سوچ رہا تھا۔

چند ساعت کے بعد اس کی پلکیں پھڑپھڑانے لگیں اور پھر اس نے اپنی گلابی آنکھیں کھول دیں۔ خدا کی پناہ کیا سحر تھا اس کی آنکھوں میں کیسی کشش تھی۔ میں دیوانہ ہوگیا۔ میں مسحور ہوگیا۔ تب اس کی آواز کا ترنم ابھرا۔

"تم کون ہو؟"

"میں، میں سلطان ہوں۔ میرا نام سلطان ہے۔"

"میں کہاں ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"میرے پاس، فکر مند نہ ہو۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ میں تمہیں چاہتا ہوں تم سے محبت کرتا ہوں۔" اور میرے ان الفاظ سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ایک عجیب سی مسکراہٹ۔ اب وہ پوری طرح جاگ گئی تھی۔

"مجھے یہاں کون لایا؟" اس نے پوچھا۔

"میں۔"

"اس لئے کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"ہاں۔"

"اور پھر چھوڑ دو گے؟"

"نہیں۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔"

"وعدہ کرو۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے کوئی تو نہیں کیا تھا۔ میں اس کے مخملیں ہاتھ کو سہلاتا رہا۔ پھر میں نے بڑے پیار سے اس سے پوچھا۔

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"نام؟" اس نے پُرخیال لہجے میں پوچھا اور پھر گردن جھٹک کر بولی۔ "مجھے نہیں۔ تم ہی مجھے کوئی نام دے دو۔"

"تمہاری یادداشت کو کیا ہوا؟"

"میں نہیں جانتی۔"

"اچھا میں تمہیں یاسمین کہوں گا۔ ٹھیک ہے۔"

"ہاں۔" اس نے محبوبانہ انداز میں گردن ہلادی اور پھر سہارے کے لئے ہا اٹھادیا۔ میں نے اسے سہارا دے کر بٹھادیا۔ اس کے انداز میں کسی قدر سوچ کا عنصر تھ پھر اس نے اپنے لباس کی طرف دیکھا اور بولی۔ "مجھے یہ لباس کس نے پہنایا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"یہ میرا لباس تو نہیں ہے۔ میں تو ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ میرا لباس۔ ا لباس سے تو دیہاتی پن جھلکتا ہے۔" میں اس کی ان باتوں پر حیران رہ گیا تھا۔ نہ جانے لڑکی کون ہے اور لالو کہاں سے اٹھالایا ہے۔

بہرحال اس کے حسن نے مجھے دیوانہ کردیا تھا۔ میں اسے دلاسے دیتا رہا اور پھر میں نے اس سے محبت بھری باتیں شروع کردیں۔ اس نے میری کسی بات کا برا نہیں مانا تھا اور نہ ہی اس جگہ کے بارے میں کسی تشویش کا اظہار کیا تھا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔

جب میں نے اس کے مرمریں بدن کو آغوش میں لیا تب بھی اس نے بڑی اپنائیت سے میری پذیرائی کی اور میری آغوش میں سماگئی مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ میں سرشار ہوگیا۔ ساری رات میں اسے سینے سے لگائے رہا تھا مجھے تو گویا ایک گوہرِ بے بہا مل گیا تھا۔ پھر صبح ہوگئی تھی۔

لالو نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا لیکن اب کھانے پینے کا معاملہ تھا۔ میں نے خود اسے تلاش کیا لیکن لالو کا پوری حویلی میں کوئی نشان نہیں تھا۔ پہلی بار میں اس کے کوارٹر میں گیا

لیکن یہاں کئی کئی انچ خاک پڑی ہوئی تھی لالو تو وہاں موجود نہیں تھا اور یوں لگتا تھا جیسے عرصہ سے کوئی یہاں نہ آیا ہو۔

یہ کمبخت کہاں اور کیوں بھاگ گیا۔ یہ تو بڑی تشویش کی بات تھی آخر وہ فرار کیوں ہوگیا۔ دوپہر تک انتظار کے باوجود وہ نہ آیا تو میں نے کچن خود تلاش کیا۔ لیکن کوئی چیز نہ ملی۔ میں پریشان ہوگیا تنہا ہوتا تو گزارہ بھی لیتا لیکن یاسمین کی موجودگی۔

"کیوں پریشان ہو سلطان؟" اس نے پوچھا۔

"یہاں ایک ملازم تھا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا۔"

"کیا ہم یہاں رہیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"اب نہیں۔ اب یہاں کیسے رہ سکتے ہیں لیکن کیا تم میرے ساتھ شہر جانا پسند کرو گی؟"

"ہاں۔ ہم شہر چلیں گے۔" وہ بولی اور میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ان آنکھوں میں پتلیوں کے عین درمیان مجھے دو سرخ نقطے نظر آئے تھے اور ان نقطوں میں ایسی کوئی بات تھی جو مجھے مسحور کردیتی اور یوں لگتا جیسے میں اس کے سامنے کوئی کمتر چیز ہوں۔ یا اس کی ذات مجھ پر حاوی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسے شہر لے جانے کی پیش کش بھی میری اپنی نہیں تھی۔ کسی غیرمرئی قوت نے میرے اندر سے یہ الفاظ ادا کرائے تھے جنہیں اس نے منظور کرلیا تھا۔ ان آنکھوں نے مجھے تحریک دلائی اور میں ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"ہمیں شہر میں ہی سکون نصیب ہوگا۔"

"شہر میں تمہاری رہائش گاہ ہے؟"

"ہاں ایک خوبصورت کوٹھی۔"

"تو پھر چلو۔ ہم وہاں چلیں گے۔ یہ ویران حویلی ہمارے قابل نہیں ہے۔ یہاں رہنا ٹھیک نہ ہوگا۔"

"کیا ہم ابھی چلیں گے۔"

"ہاں چلو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بادلِ ناخواستہ میں بھی تیار ہوگیا۔ سواری کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ مجھے اس کی نزاکت کا خیال تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ پیدل کس طرح سفر کرے گی لیکن اس کے باوجود میں باہر نکل آیا۔ حویلی کے بڑے پھاٹک سے نکلتے ہوئے

مجھے کمبخت لالو کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ جانے کہاں مرگیا تھا۔ نہ جانے کیوں بھاگ گیا تھا
پھر ایک احساس میرے ذہن میں ابھرا۔ یہ لڑکی ممکن ہے اسی بستی سے لائی گئی
کیا اس کے گھر والے اس کی تلاش میں نہیں ہوں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں را
میں دھر لیا جاؤں۔ کوئی نہیں مانے گا کہ میں کون ہوں۔ اچھی خاصی مصیبت بن جا
گی۔

اس احساس کے تحت میں نے اس کی طرف دیکھا اور وہ بھی میری طرف دیکھ
مسکرادی۔ آپ یقین کریں میرے ذہن سے وہ سوال ہی نکل گیا جو میں اس سے کرنا چ
تھا۔ عجیب طرح سے وہ میری سوچ پر حاوی ہوگئی تھی۔ ہم دونوں نے ایک طویل سفر
اور بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے شہر جانے کا بندوبست ہوسکتا تھا۔ اس
نزاکتیں آڑے نہیں آئی تھیں۔

عزیز و اقارب کے درمیان گھری ہوئی شہر کی کوٹھی میں پہنچ کر میں نے اطمینان
سانس لی۔ حسین یاسمین کو اس کوٹھی میں دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی اور میں اسے پور
کوٹھی دکھاتا پھرا۔

یاسمین اس کوٹھی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ "بہت خوبصورت کوٹھی
لیکن اس کے شایانِ شان لباس نہیں ہیں میرے پاس۔"

"لباس کا کیا ہے جانِ من۔ آج ہی بندوبست ہوجائے گا۔ یہ تمہاری بلکہ ہمار
خواب گاہ ہے آرام کرو۔ میں تمہارے لئے لباسوں کا بندوبست کرتا ہوں۔" میں نے
اور اسے خواب گاہ میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

لیکن جونہی وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہوئی دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ میر
ذہن سے جیسے مکڑی کا کوئی جالا سا ہٹ گیا ہے۔ اب میں اپنے طور پر سب کچھ سوچ سک
تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا۔ یہ سب کیا ہے۔ یہ اچانک میرے اوپر نیند کی سی کیفیت کیو
طاری ہوگئی ہے؟ میں کھویا کھویا سا کیوں ہوگیا ہوں۔ لڑکی بلاشبہ لاکھوں میں ایک ہے لیکن
حسیناؤں نے یوں میری کھوپڑی پر راج تو نہیں کیا ہے۔ میں تو عورت کو صرف عورت
سمجھنے کا قائل ہوں۔ اس حویلی سے اس طرح چلے آنے پر بھی مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے
تو کچھ اور ہی سوچا تھا۔ میں نے تو فیصلہ کیا تھا کہ اس 'بھوت گھر' میں بھوت بن کر
رہوں گا۔ ایک ایسا بھوت جسے نوجوان لڑکیوں سے دلچسپی ہو اور ہر رات ایک نوجوان
لڑکی اس بھوت گھر کی مہمان رہے گی۔

لیکن یہ سارا پروگرام نہ جانے کیوں میرے ذہن سے نکل گیا۔ یاسمین نے سارا
کھیل بگاڑ دیا تھا اور وہ کمبخت لالو نہ جانے کہاں فرار ہوگیا۔ مجھے یہ تو بتا دیتا کہ اسے کہاں
سے لایا ہے اور کہیں اس لڑکی کی گمشدگی کوئی بڑی مصیبت نہ کھڑی کردے۔ دیر تک میں
اس انداز میں سوچتا رہا اور پھر اچانک میری فطرت عود کر آئی۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔
خواہ مخواہ سوچوں کے جال میں پھنس گیا ہوں۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی ہے اور بس' اور
اتنی خوبصورت ہے کہ ایک آدھ ماہ بھی اس کے ساتھ گزارا جاسکتا ہے۔ پھر کیا پرواہ ہے۔
آنے والا وقت جیسا بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔

میں اس سے لباس کا وعدہ کرکے آیا تھا۔ اس کے لئے میں نے ایک ملازم کی ڈیوٹی
لگائی اور پھر یاسمین کے لئے بے شمار جوڑوں اور ساڑھیوں کا بندوبست ہوگیا۔ ایک حسین
ساڑھی زیب تن کرکے اس کی تو شخصیت ہی بدل گئی۔ ایسی حسین ایسی دلکش نظر آئی وہ
کہ میں دانتوں میں انگلی دبا کر رہ گیا۔ ایک الہڑ دیہاتی دوشیزہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بے مثال۔" میں نے بے اختیار جواب دیا۔ اور اس کے بعد میں نے اسے آغوش
میں گھسیٹ لیا۔

میں خود کو گھاٹے میں نہیں سمجھ رہا تھا۔ یاسمین جو لباس پہنتی سج کر رہ جاتی۔ میں
نے ملازموں سے منع کردیا تھا کہ کسی کو میری آمد کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ میں اس
کے ساتھ سکون کے لمحات گزارنا چاہتا تھا۔ اس شام میں اسے سیر کرانے بھی لے گیا
اردگرد کے بہت سے لوگوں کی نگاہوں نے ہمارا تعاقب کیا۔ یاسمین سرخ ساڑھی میں
شعلہ جوالا لگ رہی تھی۔

میں بہت خوش واپس آیا لیکن جب کوٹھی میں داخل ہوا تو ہمارے رشتے کے ایک
خالو صاحب مع اپنے خاندان کے موجود تھے۔ ان کی صاحبزادی جمیلہ خاتون بھی ان کے
ساتھ تھیں اور سترہ اٹھارہ سنگھار کرکے آئی تھیں۔ خالو صاحب مجھے دیکھ کر پرتپاک انداز
میں کھڑے ہوئے اور یاسمین کو دیکھ کر بیٹھ گئے۔ جمیلہ خاتون کی بھی مسکراہٹ سمٹ گئی۔

خالو جان نے البتہ فوراً زبان کھول دی۔ "کہاں رہتے ہو میاں۔ نظر نہیں آتے۔
اس خاندان میں رشتہ داروں سے ایسی بے اعتنائی تو نہیں برتی جاتی کہ ملنا جلنا بھی نہ ہو۔"

"اوہ۔ خالو جان میں یہاں نہیں تھا۔"

"پھر کہاں تھے؟"

"جاگیر پر گیا ہوا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تنہا گئے تھے سلطان کسی کو ساتھ لے لیا ہوتا۔" خالو جان نے کہا لیکن اس دورا وہ سب یاسمین کو گھورتے رہے تھے۔

"میں بچہ تو نہیں ہوں۔"

"سارے بچے یہی کہتے ہیں اور یہی ان کے بچپن کی علامت ہوتی ہے۔" خالو جا نے کسی قدر زہریلے لہجے میں کہا۔

"بہرحال مجھے وہاں کوئی دقت نہیں ہوئی۔"

"یہ کون ہیں؟" خالو جان سے بالآخر برداشت نہیں ہو سکا۔

"یہ یاسمین ہیں۔"

"کیا یہ بھی آپ کی جاگیر ہیں؟" اس بار جمیلہ خاتون نے لب کشائی کی اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کے اس سوال پر بہت غصہ آیا تھا لیکن میں نے برداشت کیا اور مسکرا کر بولا۔

"آپ یہی سمجھ لیں۔"

"مبارک ہو۔" جمیلہ خاتون نے کہا۔

"کوئی اعتراض تو نہیں ہے آپ کو؟"

"ہرگز نہیں۔ ہاں البتہ ابا جان کو ہوگا۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں ذرا اچھی طرح تیار ہو جاؤں۔ ایسا لباس استعمال کروں' ایسا سنگھار کروں کہ سلطان۔ سلطان شہید کہلائیں۔ اب ان بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ سلطان میاں پہلے ہی شہادت کے مرتبے پر فائز ہو چکے ہیں۔" جمیلہ نے کہا اور میں حیران رہ گیا۔ یہ لڑکی اتنی بیباک ہوگی میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

خالو جان منہ پھاڑ کر رہ گئے۔ پھر انہوں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "جمیلہ کیا بکواس کر رہی ہو؟"

"جھوٹ تو نہیں بول رہی ابا جان۔"

"میں کہتا ہوں بکواس بند کرو۔" خالو جان دہاڑے۔

"آپ ہی ان رشتہ داروں کو سمجھائیں سلطان بھائی۔ جو آپ کے آتے ہی اپنی اولادوں خاص طور سے لڑکیوں کے لئے وبال بن گئے ہیں۔ یوں سنگھار کرو یوں سلطان کو رجھاؤ کہ تمہارا مقدر کھل جائے۔ اللہ کے واسطے ان لوگوں کی زبان بند کرنے کے لئے

کوئی مؤثر اعلان کر دیں اس سے بہتوں کا بھلا ہوگا۔" جمیلہ نے کہا۔ اور خالو جان غصے سے کھڑے ہو گئے۔

"کیا بکواس کر رہی ہے ذلیل کمینی؟"

"ایک لفظ غلط کہا ہو تو جوتے ماریں ابا جان۔ سچ کو برداشت کرنے کی قوت پیدا کریں۔" جمیلہ بولی۔

"سنیئے۔" دفعتاً یاسمین کی آواز ابھری اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ دوسرے لوگ بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ "کیا آپ لوگ اپنے گھر جا کر نہیں لڑ سکتے؟ ہمیں آرام کرنے دیں۔"

"کیا کہہ رہی ہو بی بی۔ یہ میری بہن کا گھر ہے۔" خالہ جان اکڑ گئیں۔

"تو براہ کرم اپنی بہن کے پاس جائیں۔ ہمیں کیوں پریشان کر رہی ہیں۔" یاسمین تنک کر بولی۔

"چلو اٹھو یہاں سے چلو۔" خالو جان بولے اور وہ سب تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے باہر نکل گئے۔

"سلطان۔ چوکیدار سے کہہ دو کہ آئندہ ان لوگوں کو اندر نہ آنے دے۔ مجھے ایسے فضول لوگوں سے کوفت ہوتی ہے۔" ان کے جانے کے بعد یاسمین نے کہا اور میں نے گردن ہلا دی۔

مجھے خود بھی ان لوگوں سے دلچسپی نہیں تھی لیکن اس وقت میں نے صرف یاسمین کے حکم کی تعمیل کی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ میں اس کی ہر بات بے چوں وچرا مان لیا کرتا تھا۔ اس شام یاسمین بہت خوش تھی۔ وہ میری مے نوشی کے درمیان میرے پاس آ گئی۔

"تنہا تنہا؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم پیو گی یاسمین؟" میں نے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں تم کوئی کام تنہا نہ کرو۔ جو کچھ بھی کرو اس میں مجھے شریک رکھو۔"

اس نے گلاس اٹھا لیا اور پھر جو اس نے پینا شروع کیا تو میں دنگ رہ گیا۔ وہ ایک زبردست پینے والی ثابت ہوئی۔ دیر تک وہ میرے ساتھ پیتی رہی اور میں جو خود کو بہت دھاکڑ سمجھتا تھا اس کے آگے کان پکڑ کر رہ گیا لیکن اسے نشہ ہو گیا تھا۔

دوسری صبح حامد رضا اچانک کوٹھی پہنچ گیا۔ ملازم نے مجھے اس کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ میں یاسمین کو اطلاع دیئے بغیر ڈرائنگ روم میں اس کے پاس پہنچ گیا۔

"کب واپس آئے؟" حامد رضا نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بس دو تین دن ہوئے۔"

"مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی رضا بس وہ۔" میں نے کسی قدر بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"مجھے یہ بات پسند نہیں آئی ہے سلطان۔ ویسے تمہاری مرضی ہے۔ میں نے کچھ اور بھی سنا ہے۔"

"کیا؟"

"کوئی لڑکی ہے تمہارے ساتھ۔"

"کس نے اطلاع دی؟"

"تمہارے خالو جان نے۔"

"ہاں یاسمین ہے میرے ساتھ۔"

"یہ کون ہے؟"

"تفصیل دفتر میں آکر بتاؤں گا۔ یہاں مشکل ہے۔" میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ یاسمین اندر آگئی۔ وہ گہری نگاہوں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ "یاسمین اس سے ملو یہ حامد رضا ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہارے کوئی رشتے دار؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ دوست۔ گہرے دوست۔"

"اوہ۔ تب ٹھیک ہے۔ یہ ان لوگوں کی طرح بور نہیں ہوں گے۔" یاسمین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ حامد رضا نے یاسمین کو سلام کیا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھادیا۔

"نہیں خاتون۔ ممکن ہے آپ میری بھابی بن جائیں ہمارے معاشرے میں بھابی قابلِ احترام و عزت ہوتی ہے اس لئے میں آپ سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔" حامد رضا نے مسکراتے ہوئے کہا اور یاسمین بھی مسکرادی۔

"یہ فرسودہ باتیں ہیں تاہم میں تمہارے جذبات کا احترام کرتی ہوں۔" اس نے کہا اور ہاتھ گرادیا۔

"خاتون سے مکمل تعارف نہیں ہوا سلطان۔" رضا نے کہا۔

"یہ یاسمین ہیں۔"

"بھابی بن چکی ہیں یا بننے والی ہیں؟"

"بس درمیانی بات سمجھ لو۔" میں نے گول مول انداز میں کہا۔ حامد رضا سمجھ دار آدمی تھا اس لئے خاموش ہوگیا۔

یاسمین نے حامد رضا کی خوب خاطر مدارت کی۔ غالباً وہ حامد کو پسند کرنے لگی تھی۔ پھر اس نے حامد سے کہا کہ وہ میرے دفتر آکر ہمارا کاروبار دیکھے گی اور حامد نے خلوص سے اسے اجازت دے دی۔

چلتے وقت حامد نے کہا کہ اسے میری ضرورت ہے۔ کاروبار کی بہت سی فائلوں میں کچھ گھپلا نظر آتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں ایک نگاہ دیکھ لو۔ بشرطیکہ ہماری ہونے والی بھابی اجازت دے دیں۔

"میں کل آؤں گا۔"

"میں انتظار کروں گا۔" حامد نے کہا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے یاسمین کو حامد کے بارے میں تفصیلات بتائیں۔

"دلچسپ آدمی ہے۔ مجھے پسند آیا۔" وہ بولی۔ اور میں نے گردن ہلادی۔ دوسرے دن جب میں دفتر جانے کے لئے تیار ہوا تو یاسمین بولی۔ "واپسی کس وقت تک ہوگی سلطان۔"

"میں دوپہر کا کھانا تمہارے ساتھ ہی کھاؤں گا یاسمین۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔" اس نے کہا اور میں دفتر چل پڑا۔ وہی کیفیت اس وقت ہوئی تھی۔ بس یوں لگتا تھا جیسے میں کسی ذہنی قید سے آزاد ہوگیا ہوں۔ راستے بھر میں اس سلسلہ میں سوچتا آیا۔

دفتر میں حامد رضا میرا منتظر تھا اور بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ مجھے بالکل اندرونی کمرے میں لے گیا تھا۔ پھر ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ "کیا واقعی فائلوں میں کوئی گھپلا ہے۔"

"نہیں سلطان۔ البتہ میرے ذہن میں کچھ گھپلا ضرور ہے۔" حامد نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا اور حامد نے ایک کاغذ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے تعجب سے کہا۔

"پڑھ لو۔" حامد اسی طرح بولا اور میں نے کاغذ پر نگاہ ڈالی۔ حامد کا استعفیٰ تھا۔

"کیا بکواس ہے؟" میں نے شدید حیرانی سے کہا۔

"کچھ ایسی گفتگو کروں گا جو تمہیں ناگوار بھی گزر سکتی ہے۔ تمہیں میرے سوالات کے جواب دینا ہوں گے اور اگر جوابات نہ دینے ہوں تو اس استعفیٰ پر منظوری کے دستخط کر دینا۔ میں تمہارا دوست ہوں اور صرف ملازم بن کر نہیں رہ سکتا۔" حامد نے رو کھے لہجے میں کہا۔

میں نے کاغذ کے پرزے کردیئے۔ "کس ذلیل انسان نے تجھے ملازم رکھا۔ پوچھ جو دل چاہے۔"

"محترمہ یاسمین کے بارے میں تفصیل؟" حامد بولا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"مجھے خود بھی یہ احساس ہو رہا ہے حامد کہ میں کسی جنجال میں پھنس گیا ہوں۔ عجیب سی صورتِ حال ہے۔"

"صورتِ حال کیا ہے؟ یہی جاننا چاہتا ہوں۔" حامد نے کہا۔

"یہ بتاؤ لڑکی کیسی ہے؟"

"قابلِ تصور حد تک حسین اور یہی بات باعثِ تشویش ہے۔ مجھے یہ بتاؤ محترمہ سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی اور یہ تمہاری ذات پر اتنی حکمراں کیوں ہے۔ اگر تم لڑکیوں سے اس قدر متاثر ہو جانے والے ہوتے تو مجھے ذرا بھی تشویش نہ ہوتی لیکن محسوس کر رہا ہوں کہ تم اس سے دبے دبے سے ہو۔"

"یہ حقیقت ہے۔ وہ میرے ذہن پر حاوی ہے۔ میں تمہیں اس سے ملاقات کی تفصیل بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور پھر میں نے بے کم و کاست حامد کو پوری تفصیل بتا دی۔ حامد تعجب سے یہ کہانی سن رہا تھا۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔

"اور اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کون ہے؟"

"نہیں۔"

"تم نے پوچھا بھی نہیں؟"

"ہاں نہ جانے کیوں۔ ویسے اس نے تو اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ یہ نام میں نے اسے دیا تھا۔"

"کیا یہ پُراسرار بات نہیں ہے سلطان؟"

"ہے میرے دوست لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ جب میں اس کے پاس ہوتا ہوں تو میرا ذہن اس کے کنٹرول میں ہوتا ہے اور جب اس کے پاس سے ہٹتا ہوں تو ایک نشہ سا ذہن میں ٹوٹ جاتا ہے۔"

"ہوں۔" حامد رضا نے پُرخیال انداز میں کہا اور پھر وہ دیر تک سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر بولا۔ "ایک بات بتاؤ سلطان؟"

"ہاں پوچھو۔"

"جذباتی طور پر تم اس سے کس قدر وابستہ ہو؟"

"تم میرے بارے میں جانتے ہو حامد۔ لڑکیوں سے میں کبھی اتنا زیادہ متاثر نہیں ہوا لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ لڑکی مجھے کس حد تک پہنچا دے۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر میں اس سے پینگیں بڑھانے کی کوشش کروں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔" حامد نے پوچھا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔

"حامد جو حالات ہیں وہ مجھے خطرے کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر میں کسی قیمت پر اس لڑکی کو خود پر حکمرانی نہیں کرنے دوں گا۔ تم ایک کام کرو میرے دوست۔ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرو اور سنو میری ذہنی کیفیت سے متاثر مت ہونا۔ ممکن ہے میں اس کے زیر اثر رہ کر تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک کروں۔ تم میرے دوست ہو۔ نہ جانے کیوں میرا دل بھی یہی کہتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔"

"ٹھیک ہے سلطان۔ تم نے مجھے جو اختیارات دیئے ہیں مین ان سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ تم بے فکر رہو۔ تم نے ایک دلچسپ کام میرے سپرد کردیا ہے۔" حامد رضا نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر میں نے اس سے اجازت طلب کرلی۔

کوٹھی واپس آیا تو وہ میری منتظر تھی۔ "کام ہوگیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ میں نے تشویش کی نگاہ سے اس بوتل اور گلاس کو دیکھا جو خالی ہوگئی تھی۔ غالباً میری غیرموجودگی میں یاسمین پیتی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر نشیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

شام کو حامد رضا آیا اور یاسمین نے اس کا بہترین استقبال کیا۔ رات گئے تک وہ ہمارے ساتھ رہا اور مختلف تفریحات ہوتی رہیں۔ پھر یاسمین نے حامد سے کہا کہ وہ ہمارے ساتھ ڈرنک کرے اور وہ تیار ہوگیا۔ یاسمین بے تحاشہ پی رہی تھی۔ میں نے بھی کچھ زیادہ پی لی اور مجھے نشہ ہوگیا۔ میں ان دونوں کو پیتا چھوڑ کر سونے کے لئے چلا گیا لیکن

دوسری صبح حامد کو وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ حامد کسی قدر پریشان تھا۔

"تم گئے نہیں تھے حامد؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے روک دیا۔ یہ اس قدر نشے میں تھے کہ میں نے ان کی واپسی م
نہیں سمجھی۔" یاسمین نے حامد کی بجائے جواب دیا۔

"اوہ۔ اچھا کیا تم نے۔ یہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔"

"ہمیں بھی پیارے ہیں۔" یاسمین مسکرا کر بولی اور حامد گھبرا کر میری طرف
لگا۔

"ہاں تو حامد صاحب۔ ہمیں دفتر کب بلا رہے ہیں؟"

"میں تو آپ کا خادم ہوں یاسمین صاحبہ۔ جب دل چاہے تشریف لے آئیں۔
مجھے اجازت دیں۔ ہاں سلطان صاحب آپ آرہے ہیں دفتر۔ میرا خیال ہے آپ کو ا
لے لینی چاہئے۔ بہتر ہوگا میرے ساتھ چلیں۔"

"یہ تھوڑی دیر کے بعد آجائیں گے۔ آپ آرہے ہیں شام کو۔" یاسمین نے ک

"ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔" حامد بولا اور پھر وہ چلا گیا۔ میرے ذہن میں ایک
پیدا ہوگئی تھی لیکن میں نے یاسمین کے سامنے کوئی مظاہرہ نہیں کیا اور ہنستا بولتا رہا۔
مجھے آنے کا اشارہ دے گیا تھا اور میں جانے کے لئے بے چین تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد
دفتر پہنچ گیا۔

حامد بے چینی سے میرا منتظر تھا۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا لیکن حامد نے
کر دروازہ بند کر دیا تھا۔ "سلطان میرے دوست تم ایک آسیبی چکر میں پھنس گئے ہو
دیکھو اگر تم نے ہمت سے کام نہ لیا تو کسی خطرناک حادثے کا شکار ہو جاؤ گے بہت
داری سے کام لینا ہے۔"

"کیا مطلب حامد؟"

"مجھ سے پوچھو کہ میں نے رات کیسے گزاری؟" حامد نے کہا۔

"ہاں۔ میں منتظر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے دوست۔ میں تمہارے مزاج سے واقف ہوں لندن میں ہم نے جو و
گزارا ہے وہ میرے لئے اجنبی نہیں ہے لیکن یہاں کی صورتِ حال ذرا مختلف ۔
رات کو وہ پیتی رہی۔ اس طرح کہ میں یا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس نے جن کی
بوتلیں ختم کر لیں لیکن اس کے بعد اسے نشہ ہو گیا۔ نشے کے عالم میں اس نے م

تعریف کی اور میری قربت کے حصول کا بیباکانہ اظہار کیا۔ تب میں خود کو اس سے دور نہ
رکھ سکا۔ وہ ایک ہوس پرست عورت ہے۔ اس نے اس دوران کچھ بے ربط گفتگو بھی کی
جو میری یادداشت میں محفوظ ہے۔ اس نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا' حامد تمہارے
لئے یہی بہتر ہے کہ میری دوستی حاصل کرو۔ ہمیشہ فائدے میں رہو گے۔"

"میں تمہارا دوست ہوں یاسمین۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تمہیں اپنا رازدار بھی بنانا چاہتی ہوں۔"

"یہ میری عزت افزائی ہے۔"

"سنو۔ مجھے سلطان سے محبت نہیں ہے۔ ہاں مجھے اس خاندان کے کسی فرد سے پیار
تھا لیکن اس خاندان نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ میں آج تک بے قرار ہوں۔ طویل
عرصہ کے بعد مجھے رہائی ملی ہے۔ آہ لیکن اب میں بدل چکی ہوں۔ میں کچھ اور ہی بن گئی
ہوں۔ سلطان بہت جلد ختم ہو جائے گا لیکن جو میرے دوست ہوں گے وہ میرے ساتھ
رہیں گے۔ سنو حامد رضا۔ میرا ساتھ دو۔ خوش رہو گے اور اگر مجھ سے بغاوت کی
تو............ تو............"

"اور پھر وہ خاموش ہو گئی مجھے بتاؤ سلطان اس گفتگو سے تم کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو۔"
حامد نے پوچھا۔

میرا دل دھڑک رہا تھا۔ یہ الفاظ مجھے نہ جانے کس جہان کی سیر کرا رہے تھے۔
میرے کارندوں نے مجھے حویلی کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا اور ان کے الفاظ کی روشنی
میں یاسمین کے یہ الفاظ ایک معنی خیز حیثیت رکھتے تھے۔ دیر تک میرا ذہن چکراتا رہا۔ میں
جس بھی جنجال میں پھنس گیا تھا اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں لندن کی
آزاد فضاؤں میں پرورش پانے والا ایک آزاد منش شخص ہندوستان آکر کیسی کیسی
مصیبتوں میں پھنس گیا تھا' حالانکہ اگر میں چاہتا تو یاسمین کو کسی طور خود سے جدا کر سکتا تھا
لیکن ایک پُراسرار شخصیت کو ایک ایسی شخصیت کو جس کے بارے میں کوئی تعین بھی نہ کیا
جاسکے خود سے جدا کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اگر میں اس بات کا اظہار کرتا تو نہ جانے وہ
میرے ساتھ کیا سلوک کرتی۔ مجھے پوری دانشمندی اور ہوشیاری سے کام لے کر اس کے
ٹرانس سے نکلنا تھا اب یہ دوسری بات تھی کہ میں اس خطرناک عورت سے بچ پاتا یا
نہیں۔ سوچوں کی شدت نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس مسئلے
سے کیسے نمٹوں۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آسکا تو میں نے حامد رضا سے اس مسئلے میں پوچھنا

مناسب سمجھا۔

"کیا خیال ہے حامد' اگر میں اسے مار پیٹ کر کوٹھی سے نکال دوں تو۔" میں ۔ اور حامد رضا چونک پڑا۔ اس نے خوفزدہ انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔

"کیا بات کر رہے ہو سلطان' کیا یہ ممکن ہے؟" حامد رضا نے پوچھا۔

"کیوں ناممکن کیوں ہے۔"

"میں تمہیں ایک بات کی وارننگ دیتا ہوں سلطان! ایسی کوئی کوشش نہ کرنا' ا نے ایسی کوئی کوشش کی تو نتائج کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ ہے کہ تم اسے اس آسانی سے نکال باہر نہ کر سکو گے۔"

"آخر کیوں۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے' وہ مجھے بلیک میل بھی نہیں کر سکتی میں ان باتوں کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔"

"دیکھو سلطان اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو تمہیں خوفناک خطرہ مول لینا گا۔ تمہیں یہ نہیں کرنا چاہئے میرے دوست۔ بلکہ بہتر یہ ہے کہ میرے مشوروں پر کرتے رہو' میں کوئی بہت بڑا دانشمند نہیں ہوں لیکن میں کوشش کروں گا کہ تمہیں جنجال سے نکال سکوں۔ البتہ اگر تم نے اس دوران کوئی ایسی غلط حرکت کر ڈالی تو پھر میں بھی تمہارے لئے کچھ نہ کر سکوں۔" حامد رضا نے کہا اور میں ایک بار پھر پریشانی پھنس گیا۔

مجھے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیا کوئی عورت اس طرح کسی شخص ذات پر مسلط رہ سکتی ہے کہ وہ اس کے جنجال سے نکل بھی نہ سکے۔ میں تو اس زنا عادی نہیں تھا۔

بہرصورت دیر تک میں حامد رضا سے گفتگو کرتا رہا۔ حامد رضا نے میرے ایک پروگرام پیش کیا تھا۔

"ٹھیک ہے' پھر جیسی تمہاری مرضی تم کرو۔" اور حامد خاموش ہو گیا۔ میں بالکل الذہنی کے عالم میں کچھ سوچتا رہا تھا۔ پھر حامد رضا نے کہا۔

"تم سارے معاملات میرے اوپر چھوڑ دو میرے دوست اگر میں ناکام ہو گیا ت میں تمہیں خود مختاری دے دوں گا۔"

میں حامد کے پاس سے چلا آیا لیکن راستے بھر میرا ذہن پریشان خیالات میں الجھ

کیا میں واپس لندن چلا جاؤں۔ بلاوجہ میں اس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ بہتر تو یہ تھا کہ میں یہاں نہ ہی آتا لیکن تقدیر مجھے لے آئی تھی اور اب اس خوفناک جنجال میں پھنسا دیا تھا۔ چنانچہ میں پریشانی کے عالم میں سوچتا رہا اور جب ذہن میں کچھ نہ آسکا تو اٹھ کر گھر چلا آیا۔

یاسمین حسب معمول پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی شراب کی بوتل اس کی بائیں سمت رکھی ہوئی تھی پہلی بار میں نے اس سے اس سلسلے میں باز پرس کی۔

"یاسمین یہ شراب نوشی' سارا دن تو نہیں کی جاتی۔" میں نے غصے سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونک پڑی۔

"میں نے کل بھی تمہیں دیکھا تھا اور آج بھی بوتل تمہارے نزدیک رکھی نظر آرہی ہے۔"

"مجھے یہ شے بہت پسند ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم میری زندگی میں ایک نمایاں مقام حاصل کرنے والی ہو یاسمین' میں چاہتا ہوں لوگ تمہاری عزت کریں' تمہیں اچھا مقام دیں' ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہارے نام کے ساتھ غلط روایت منسوب کرے۔"

"کوئی۔" وہ ہنس پڑی۔ "اب بھی یہ کوئی مجھ پر مسلط رہیں گے۔ میں آزادی چاہتی ہوں سلطان اور میری خواہش ہے کہ تم میرے کسی سلسلے میں مداخلت نہ کرو۔ اگر تم نے ایسی کوئی کوشش کی تو تم فائدے میں نہ رہو گے۔" لیکن نہ جانے کیوں اس وقت میرا پارہ ضرورت سے زیادہ چڑھ گیا تھا۔ میں نے اس کے سخت لہجے کی کوئی پرواہ نہ کی۔

"لیکن یہ تو مناسب نہیں ہے یاسمین' تم یہاں کس حیثیت سے ہو تم جانتی ہو۔"

"ہاں اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں کے سرخ دھبے بڑے ہوتے چلے جارہے ہیں اور پھر یہ سرخ دھبے اس کی پوری پتلیوں پر چھا گئے۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں گہری سرخ تھیں اور مجھے کسی قدر خوف محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے جھرجھری سی لی اور بدستور سخت لہجہ روا رکھا۔ البتہ میں نے اس کی طرف ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

"میں تمہیں یہاں سے نکال بھی سکتا ہوں۔"

"اب یہ ممکن نہ ہوگا۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"کیوں ممکن نہ ہوگا کیا کرو گی تم میرا۔" میں نے بپھر کر کہا۔ میں اس کی آنکھوں میں

نہیں دیکھ رہا تھا۔ تب وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
"ذرا میری طرف دیکھو۔" اس نے کہا اور میری نگاہیں بے اختیار اس کی جانب گئیں۔ دوسرے لمحے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے میرا ذہن سو رہا ہو۔
"تم ایک مفلوج انسان ہو سلطان، تم اپنی مرضی سے ہل جل بھی نہیں سکتے۔" مکاری سے بولی اور میرے بدن میں سنسناہٹیں دوڑ گئیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے بدن سن ہو گیا ہو۔ یاسمین مسکراتی ہوئی مجھے دیکھتی رہی تھی۔ پھر اس نے میرے بازو ہاتھ ڈالا اور بولی۔
"آؤ اٹھو۔ تمہیں میرے سہارے کی ضرورت ہے۔" اور میں کھڑا ہو گیا۔ یا مجھے میرے کمرے میں چھوڑ گئی اور خود باہر نکل گئی۔ میرے حواس بحال ہو گئے تھے میرا بدن مفلوج تھا۔ درحقیقت میں ہل جل نہیں سکتا تھا۔ آہ۔ یہ کیا ہوا۔ میں نے رضا کی بات نہیں مانی تھی اور بالآخر میں مصیبت کا شکار ہو گیا۔ اب کیا ہو گا۔
پورا دن کمرے میں گزرا کسی نے میری کوئی خبر نہیں لی تھی۔ ہاں شام کو چار کے قریب حامد رضا اور یاسمین میرے پاس آئے۔ "ارے تم اس کمرے میں گھسے گھسے کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ میرے منہ سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ میں نے قہر آ نگاہوں سے یاسمین کو دیکھا اور وہ ہنس پڑی۔
"تمہارے دوست اچانک ایک بیماری کا شکار ہو گئے ہیں حامد۔ ان کی مزاج پُر کرو۔" اس نے کہا۔
"اس شخص کا خیال تھا یاسمین کہ ساری دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ دول کے بل پر اس نے ہر چیز کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ جانتی ہو تمہارے بارے میں ا کا کیا خیال ہے؟"
"کیا خیال ہے؟" یاسمین نے پوچھا۔
"اس نے مجھے ایک بدروح کی کہانی سنائی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تم کوئی بدرو ہو جو اس پر مسلط ہو گئی ہے۔" حامد نے کہا اور میں اچھل پڑا۔ میں نے حیران نگاہوں اسے دیکھا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ آہ حامد بھی اس کے سحر کا شکار ہو گیا۔ آہ میرا دوس بھی اس کی آنکھوں کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔
"کیا بک رہے ہو حامد؟" میں نے دہاڑ کر کہا۔
"اس کا کہنا ٹھیک ہی ہے حامد لیکن اب تو یہ اس بدروح کا شکار ہے۔ جب تک م

وجود ہوں یہ ٹھیک نہ ہو سکے گا۔ اس اپاہج کی بکواس پر تم توجہ نہ دو۔ آؤ ہم اپنا مستقبل تعمیر کریں۔ آؤ۔" یاسمین نے لپک کر حامد کے رخسار چوم لئے اور پھر وہ دونوں باہر نکل گئے۔
میرا دل خون ہو کر رہ گیا تھا۔ کاش میں حامد کی بات مان لیتا کاش میں اس کے ساتھ سلوک نہ کرتا۔ ہم چالاکی سے کام نکال سکتے تھے لیکن افسوس میرا دوست میرا ہمدرد بھی اب اس کے طلسم میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اب کوئی سہارا بھی نہیں رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
شام کو میرے لئے کھانا آ گیا لیکن دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے عزیز واقارب بھی اب اس کوٹھی میں نہیں آ سکتے تھے۔ عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ دوسری صبح بھی حامد مجھے ملا۔ وہ تنہا ہی میرے کمرے میں آیا تھا۔ میں اسے دیکھ کر چونک پڑا لیکن حامد کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
"کیا حال ہے سلطان؟"
"حامد۔ حامد تمہیں کیا ہو گیا۔ کیا تم بھی اس ناگن کے سحر میں گرفتار ہو گئے؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔
"نہیں دوست ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" حامد نے ہنس کر کہا۔
"تب۔ تم اسے فریب دے رہے ہو؟" میں نے خوش ہو کر پوچھا۔
"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔" حامد نے اسی انداز میں جواب دیا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "بلکہ بات یہ ہے سلطان کہ میں تمہاری طرح بیوقوف نہیں ہوں۔ انسان کو زندگی میں اگر کوئی موقع ملے تو اسے فضول اور جذباتی قسم کے احساسات کا شکار نہیں ہونا چاہئے میں نے کبھی اچھی زندگی نہیں گزاری۔ دولت کی خواہش کسے نہیں ہوتی میں بھی دولت مند بننا چاہتا ہوں۔"
"کیا مطلب حامد۔ کیا مطلب؟" میں نے رندھی آواز میں پوچھا۔
"یاسمین کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ تمہارے خاندان نے اس کے ساتھ وہ کچھ کیا ہے جو ایک انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ نہیں کر سکتا۔"
"کیا بکواس کر رہے ہو حامد؟"
"ہاں سلطان مجھ سے سنو۔ یاسمین کا اصل نام پلنا تھا۔ پلنا تمہارے خاندان کی پرانی خدمت گار تھی اس کے والدین نے تمہارے خاندان کی پُرکھوں سے خدمت کی تھی اور

ان کی موت کے بعد پلنا اور اس کا بھائی لالو تمہارے خاندان کی خدمت کرتے ر
تمہارے دادا نے ایک بار پلنا کو دیکھا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ تمہارے دادا اس سے
گئے۔ معصوم لڑکی نے ہمیشہ ان سے بچنے کی کوشش کی لیکن بالآخر تمہارے دادا نے
عصمت دری کردی اور وہ مجبور ہوگئی۔ تمہارے دادا نے اس سے وعدہ کیا تھا وہ ا
شادی کرلیں گے۔ یوں وہ پلنا کو لوٹتے رہے اور پھر بات کھل گئی۔

تمہارے خاندان نے لالو اور پلنا سے فوراً باہر نکل جانے کے لئے کہا لیکن
کے قدموں پر گر پڑی۔ اس نے رو رو کر کہا کہ وہ تمہارے دادا کے بغیر زندہ نہ
سکتی۔ پھر لالو نے تمہارے خاندان والوں کو دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اس کے
سلوک کیا تو وہ دنیا کو اس کی کہانی سنا دے گا اور تمہارے خاندان والوں نے ایک
کرلیا۔ لالو کو زہر دے کر مار دیا گیا اور پلنا کو بے ہوشی کی دوا دے کر ایک تابوت
کرکے اسے مار دیا گیا۔ یہ ہے ان بدنصیبوں کی کہانی۔ ان کی روحیں انتقام کی پیا
سرگرداں ہوگئیں لیکن پھر ان سے تنگ آکر حویلی خالی کردی گئی اور ان کے بعد
حویلی آسیب زدہ مشہور ہوگئی۔" حامد نے پوری تفصیل بتائی۔

میرے حواس گم تھے۔ تو لالو بھی بدروح تھا۔ وہ پلنا کا بھائی تھا۔ میں سوچ رہا
میں نے پوچھا۔

"تمہیں یہ کہانی کیسے معلوم ہوئی؟"

"پلنا یا یاسمین اب مجھ پر اعتماد کرتی ہے۔ لالو کسی طرح اسے اس تابوت سے
نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لئے کسی زندہ آدمی کی ضرورت تھی اور پھر تم اس کے پاس
گئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے لالو کو اعتماد میں لیا اور اس سے کسی لڑکی کی فرمائش کی۔ لالو کے لئے
سے بہتر موقع دوسرا نہیں تھا۔ اس نے پلنا کا تابوت تمہیں پیش کردیا۔ اب دونوں کو
خاندان سے انتقام لینے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں مل سکتا تھا اور تم نے ا
ہاتھوں سے پلنا کا تابوت کھول دیا۔ اب وہ آزاد ہے اور جس طرح چاہے تم سے انتقام
سکتی ہے اور اس نے اس کی ابتدا کردی ہے۔"

"لیکن حامد۔ تم میرے دوست ہو۔ کیا تم میری مدد نہ کرو گے۔" میں نے گھگھیا
ہوئے کہا۔ حامد مسکرانے لگا۔

"دیکھو دوست۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل
کرے۔ پلنا نے مجھے اس کی دعوت دی ہے اس نے کہا ہے کہ دولت حشمت جیسی چیزوں
میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اب تو اس کی ایک یہی خواہش ہے۔ آہستہ آہستہ
تمہارے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کردے اور اپنی زندگی کی وہ ناآسودہ خواہشیں
پوری کرے جو تشنہ رہ گئی تھیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے عوض میں تمہاری دولت کا حقدار قرار پاؤں گا اور یہ سب کچھ میرا ہوگا۔
یاسمین کے لئے مجھے ایک کام کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟"

"جوان اور تندرست نوجوانوں کی فراہمی اور شراب۔ بس اسے اب ان دو چیزوں
سے رغبت رہ گئی ہے اور اسے یہ چیزیں فراہم کرکے میں زندگی بھر عیش کروں گا۔" حامد
ہنس پڑا۔

"تم۔ تم یہ ذلیل کام کرو گے حامد؟" میں نے طیش میں آکر پوچھا۔

"ہاں میرے دوست۔ دولت کے حصول کے لئے انسان اس سے زیادہ کرتا ہے۔
میں نے ہمیشہ تمہاری مصاحبت کی ہے۔ اب مجھے موقع ملا ہے کہ لوگ میری مصاحبت
کریں تو میں کیسے اس موقع کو ٹھکرا سکتا ہوں' اتنی آسانی سے تو دولت کسی کو بھی نہیں
حاصل ہوتی۔" حامد نے کہا اور میں ششدر رہ گیا۔

میرا عزیز ترین دوست دولت کے لئے مجھ سے کس قدر دور ہوگیا۔ میری آنکھوں
میں آنسو آگئے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن میری آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ بمشکل تمام
میں نے اپنے آنسو روکے اور رقت آمیز لہجے میں بولا۔

"حامد کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ایک بدروح ہے۔" میں نے کہا۔

"جانتا ہوں۔ میں نے کب کہا کہ میں یہ بات نہیں جانتا۔" حامد رضا ڈھٹائی سے
بولا۔

"اور اس کے باوجود تم اس کے تابع رہو گے۔ اس کے احکام کی تعمیل کرتے رہو
گے۔ کیا تم خود کسی وقت اس کا شکار نہیں ہوسکتے۔"

"میں تمہاری طرح احمق نہیں ہوں سلطان۔ مجھے یہ موقع ملا ہے تو میں کیوں
چاہوں گا کہ وہ مجھ سے ناراض ہو' اور پھر مجھے کرنا ہی کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تم پر

حکمران ہے اور تم صرف وہی کرو گے جو وہ چاہے گی۔ تو پھر مجھے اس سے بغاوت
ضرورت۔ ہے میں اس کے احکامات کی تعمیل کرتا رہوں گا۔ وہ مجھ سے خوش رہے گی
یوں بھی وہ مجھ سے بہت زیادہ خوش ہے اور اگر خوش نہ ہوتی تو شراب کے نشے میں
سہی، مجھے یہ سب کچھ کیسے بتا دیتی۔" حامد نے کہا اور میں دانت پیسنے لگا۔

"تُو ذلیل ہے حامد، تُو گندے خون کا مالک ہے۔ تُو نے اپنے دوست سے غداری
ہے۔ اس دوست سے جس نے تجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھا، تجھے بھائیوں
حیثیت دی۔ تُو اگر چاہتا تو مجھے اس عذاب سے نکال بھی سکتا تھا لیکن حامد تو گندا خ
ہے۔ تیرے اندر شریف خون ہے ہی نہیں۔ کاش کاش تُو اتنا گھٹیا نہ ہوتا۔ یا تیرا خون
گندا نہ ہوتا۔" میں نے کرب کے عالم میں کہا۔

"فضول بکواس مت کرو۔ میں اپنے آپ کو بہتر طور سے جانتا ہوں۔ میں چاہتا
تمہیں کچھ نہ بتاتا لیکن یہ سب کچھ میں نے تجھے اس لئے بتادیا ہے کہ میرے پیچھے
پریشانی کا شکار نہ ہو۔ اب آرام سے یہاں رہ، اور اپاہجوں کی سی زندگی گزار اور کوئی ب
تیری مزاج پرسی کو یہاں نہیں آئے گا یہی تیرے لئے بہتر ہے ورنہ کسی بھی وقت تیرا
زندگی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔" حامد نے کہا اور میں سناٹے میں رہ گیا۔

حامد باہر چلا گیا تھا اور میرے رخساروں پر آنسو بہنے لگے تھے، لندن کی حسین او
تابناک زندگی کو چھوڑ کر یہاں آیا تھا لیکن یہاں کس عذاب کا شکار ہوگیا۔ قصور سراسر میر
ہی تھا۔ میں نے کسی کی بات نہیں مانی تھی۔ جس وقت بستی پہنچا تھا تو کارندوں نے مجھے
بتایا تھا کہ میں حویلی کا رخ نہ کروں۔ حویلی آسیب زدہ ہے۔ میں نے اپنی روشن خیالی میں
ہنس کر جاہل کارندوں کی جاہلیت کا مذاق اڑایا تھا اور اپنی سرمستی میں ان کی کسی بات ک
تسلیم نہیں کیا تھا اور حویلی پہنچ گیا تھا۔ حویلی پہنچ کر بھی میں نے اپنی تمام برائیاں جاری
رکھیں اور چلو یہاں تک تو ٹھیک تھا۔ اگر میں لالو سے اس بات کی فرمائش نہ کرتا تو شاید
یہ خوفناک عورت آزاد نہ ہوتی اور میں سکون کی زندگی گزار رہا ہوتا۔ برائیاں اب میرے
لئے تکلیف دہ بن گئی تھیں اور یقیناً ہر برائی کا نتیجہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے، میں نے دل ہی
دل میں خدا سے توبہ کی۔ اب تک جو کرچکا تھا اس پر شرمندگی محسوس ہورہی تھی۔

بلاشبہ میں نے آج تک کوئی اچھائی کا کام نہیں کیا تھا۔ میری برائیاں ہی میرے
سامنے آئی تھیں۔ اب کیا ہوسکتا ہے۔ حامد بھی کمبخت عورت کا شکار ہوگیا۔ میرے لئے
اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ یہاں اپاہجوں کی طرح زندگی بسر کر کے موت کا

انتظار کروں۔ آنسو میرے رخساروں پر بہتے رہے اور کوٹھی کے شب و روز یونہی جاری
رہے۔ حامد اب بھی کبھی کبھی یاسمین کے ساتھ میرے پاس آجاتا تھا اور میرے دل میں
نشتر چبھو کر چلا جاتا تھا۔ اس کے بدن پر میرے سوٹ ہوتے۔ ہاتھوں کی انگلیوں میں میری
قیمتی انگشتریاں ہوتیں۔ گویا وہ میری دولت سے عیش کر رہا تھا۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ اس دوران کسی عزیز نے بھی ملنے کی کوشش نہیں کی
تھی۔ کوشش کی بھی ہوگی تو اسے دھتکار دیا گیا ہوگا۔ آہ۔ میں کس کسمپرسی سے زندگی
گزار رہا تھا۔

کبھی کبھی انہیں کسی کاغذ پر میرے دستخطوں کی ضرورت پیش آتی تھی تو آجاتے
تھے۔ میں خاموشی سے دستخط کردیتا تھا۔ یہ بات میرے لئے زندگی کا باعث تھی۔ اس طرح
کم از کم وہ لوگ مجھے زندہ رکھیں گے۔ ورنہ میری زندگی ان کے لئے کیا وقعت رکھتی
ہے۔

پھر ایک شام ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اسے فائلوں میں لگے کاغذات پر دستخط
کرانے تھے۔ "تم کون ہو؟"

"میرا نام جاوید ہے جناب اور میں نیا منیجر ہوں۔"

"کس نے تمہیں منیجر بنا ہے۔"

"بیگم صاحبہ نے۔"

"منور علی کہاں ہے؟"

"اسے نکال دیا گیا۔"

"کیوں؟"

"اس نے بیگم صاحبہ کے احکامات کی تعمیل نہیں کی تھی۔"

"نکل جاؤ یہاں سے منور علی کو بلاؤ۔ جاؤ میں دستخط نہیں کروں گا۔" میں نے فائل
ٹھاکر پھینک دی اور وہ کمرے سے چلا گیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ یاسمین کے ساتھ
اپس آیا۔ یاسمین اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھی۔ اس نے میرے سامنے جاوید کے
ونٹ چومے اور بولی۔

"تم نے میرے محبوب کو کیوں ناراض کیا سلطان؟"

"ذلیل کمینی۔ اب یہ تیرا محبوب ہے۔ وہ حامد کہاں گیا۔"

"دس دن کی چھٹی لے کر گیا ہے لیکن تمہیں اس سے معافی مانگنی ہوگی۔ یہ میری

زندگی ہے میری روح ہے۔" وہ جاوید سے لپٹ کر بولی۔

"کاش میں تیرا خون کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"جو کام نہیں کر سکتے اس کے بارے میں سوچتے کیوں ہو سلطان۔ چلو فائلو لگے کاغذات پر دستخط کردو۔ جلدی کرو۔" اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور میری آ میں آنکھیں ڈال دیں اب میری مجال نہیں تھی کہ میں کوئی تعرض کرتا۔ میں نے ا کے کاغذات پر دستخط بھی کیئے اور جاوید سے معافی بھی مانگی۔ "آؤ ڈارلنگ چلیں مجھے لگ رہی ہے۔" یاسمین نے کہا اور جاوید سے لپٹی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں اپنی بے خون کے آنسو بہا رہا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ پھر ایک شام حامد رضا اور یاسمین میرے پاس آئے اور ا نے چند کاغذات میرے سامنے رکھ دیئے۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مختار نامہ۔ ہم لوگوں نے وکیل سے بات کرلی ہے۔ اس مختارنامے کی رُو سے تمہاری ساری جائیداد کا متولی بن جاؤں گا۔ سارا کاروبار میرے ہاتھوں میں آجائے دراصل دفتری امور میں دقت پیش آتی ہے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں اب تکلیف سے نجات دلادیں۔" حامد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"حامد رضا تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا۔ میں تمہارا دوست رہ چکا ہوں میں تمہیں کبھی کوئی دکھ نہیں دیا۔"

"اسی لئے تو میں تمہارے دکھوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں دوست۔" حامد مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں بے رحمی کے جذبات تھے۔ میں نے رو ہوئے ان کاغذات پر دستخط کردیئے۔ میں جانتا تھا کہ میری یہ کوشش بے سود ہوگی۔ وہی جو یہ لوگ چاہیں گے۔"

دونوں باہر نکل گئے اور میں اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتا رہا۔ تین چار گھنٹے کے بعد واپس آیا اور اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا۔ میں نے گردن جھکالی تھی۔

"یہ تو تقدیر کی بات ہے میرے دوست۔ تقدیر نے مجھے یہ سرفرازی بخشی ہے میں کروڑوں روپے کی دولت کا مالک ہوں۔"

"میں تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں حامد، لیکن مجھے بس ایک جواب دے دو۔"

"وہ کیا؟"

"کیا کل یہ سب کچھ تمہارے ساتھ نہیں ہوگا؟"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ پلنا میری دشمن نہیں ہے۔ اسے تمہارے خاندان نے ہلاک کیا تھا۔ وہ صرف تم سے انتقام کی پیاسی ہے۔ میں تو اس کے لئے نوجوان اور شراب فراہم کرتا ہوں۔ میرے لئے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

"کیا وہ یہ اعزاز کسی اور کو نہیں دے سکتی۔ کیا وہ اپنے بھائی لالو کو یہ اعزاز نہیں بخش سکتی۔"

"لالو؟" حامد نے حیرت سے کہا اور بولا۔ "لالو کا اب کوئی وجود نہیں ہے۔ اسے چونکہ زہر دے کر ہلاک کردیا گیا تھا اس لئے اس کی بے چین روح اپنی بہن کو اس کا مقام دلا کر پُرسکون ہوگئی ہے۔ پلنا کو چونکہ زندہ دفن کیا گیا تھا اس لئے وہ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک اس کی طبعی عمر کے اوقات پورے نہ ہوجائیں اور اس کے بعد میں اس دولت کا تنہا مالک ہوں گا۔"

"آہ حامد۔ کاش تمہیں اپنی دوستی یاد آجاتی۔"

"میں فضول باتوں کو یاد نہیں کرتا۔" حامد نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر وہاں سے چلا گیا۔ میری تقدیر میں اب رونے کے سوا اور کیا رہ گیا تھا۔ اب تو میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

پھر ایک رات میں گہری نیند سو رہا تھا کہ حامد نے مجھے جگایا۔ یاسمین اس وقت بھی ساتھ تھی اور ایک حسین لباس میں شعلہ جوالہ نظر آرہی تھی۔ "اٹھو سلطان کھڑے ہوجاؤ۔" اس نے کہا اور میرے بدن پر طاری بوجھ حیرت انگیز طور پر ہلکا ہوگیا۔ میں طویل عرصہ کے بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہوگیا تھا۔ "آؤ۔ ہمارے ساتھ آؤ۔" وہ پھر بولی۔ میری مجال نہیں تھی کہ میں اس سے انحراف کرتا۔ میرے قدم خودبخود اٹھنے لگے اور تھوڑی دیر کے بعد میں باہر نکل آیا۔ راستے میں یاسمین نے کہا۔

"باہر تمہارے چند رفقاء کھڑے ہیں تم ان سے یہی کہو گے کہ تم سیاحت کے لئے باہر جارہے ہو کیونکہ تمہاری صحت خراب ہے۔"

باہر سفر کی تیاریاں مکمل تھیں۔ ایک وین کھڑی ہوئی تھی جس میں میرے دو سوٹ کیس رکھے ہوئے تھے۔ باہر میرے چند عزیز کھڑے ہوئے تھے جن سے میں نے وہی

الفاظ کہے جن کا مجھے حکم ملا تھا اور پھر میں وین میں بیٹھ گیا۔ حامد رضا نے وین ا
کر کے آگے بڑھادی یاسمین اس کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

سفر شروع ہوگیا۔ مجھے اس طویل سفر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ بیٹھ
میرا بدن درد کرنے لگا تھا۔ اس وقت صبح کا جھٹپٹا ہوگیا تھا جب وین رک گئی اور وہ
نیچے اتر آئے۔

"آؤ سلطان۔ اپنی تقدیر کے آخری کھیل سے لطف اندوز ہو۔" حامد رضا نے
مجھے سہارا دے کر نیچے اتار لیا۔ میرا بدن میرا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ بس ایک ۔
لاش کی مانند میں نے اسی منحوس حویلی کا پھاٹک دیکھا اور میرے دل میں سینکڑوں و
جاگ اٹھے۔

"تم لوگ۔ تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔" میں نے گھگیائی ہوئی آوا
پوچھا۔

"اندر تو آؤ میری جان سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔" حامد رضا نے چہکتے ہو
مجھے اس شخص سے اتنی بے رحمی کی امید نہیں تھی۔ وہ لوگ مجھے حویلی کے ایک
میں لے آئے۔ وہاں وہی منحوس تابوت پڑا تھا۔ جسے کھول کر میں نے اپنی بدبختی کا آ
تھا۔

"یہ تابوت تمہارے اجداد کا ہے۔ اس میں انہوں نے ایک بے گناہ لڑکی
کر کے موت کی تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا سلطان اور آج یہی تابوت تمہاری قبر
تیار ہوجاؤ۔" حامد نے خوفناک لہجے میں کہا۔

"کک۔ کیا مطلب؟" میری سہمی ہوئی آواز نکلی۔

"پلنا تمہارے سارے خاندان کو موت کی سزا دینا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے
میں نے کہا کہ اصل خون تو تم ہو۔ دوسرے تو ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ تم
موت سے تمہارے اجداد کی روحیں جس قدر بے چین ہوں گی کسی اور کی موت
ہوں گی۔ چنانچہ ہم نے تمہارا انتخاب کیا اور اب تم اپنی زندگی کے آخری لمحات سے ا
اندوز ہو۔ آؤ پلنا اسے باندھ دیں۔" حامد نے کہا اور دونوں نے مل کر مجھے ایک
سے کس دیا۔

پلنا مسکرا رہی تھی۔ "آج میرا انتقام پورا ہو رہا ہے۔ آؤ حامد اس خوشی میں ر
رلیاں منائیں۔" اس نے کہا اور حامد نے گردن جھکادی۔ وہ شراب کی بوتلیں اٹھالایا

دونوں کمبخت بے لباس ہوگئے۔ وہ میرے سامنے شرمناک حرکتیں کرتے رہے اور
شراب نوشی میں مصروف رہے۔ حامد پلنا کو دل کھول کر شراب پلا رہا تھا۔ یہاں تک کہ پلنا
مسکرانے لگی۔

"بس حامد۔ اب بس کرو۔ میں اس بدبخت کو آگ میں جلتے دیکھنا چاہتی ہو۔"

"کل اس کے اجداد نے یہ تابوت تمہارے لئے بنایا تھا پلنا؟" حامد نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے اس تابوت میں بہت عرصہ قید کاٹی ہے۔" وہ مدہوش لہجے میں بولی۔

"اور آج یہ اس کا مدفن بنے گا۔ تُو نے دیکھا سلطان۔ تاریخ کس طرح اپنے آپ کو
دہراتی ہے۔ یہ مظلوم لڑکی کل تک اس تابوت میں بند تھی۔ کیا تُو نے محسوس کیا کہ اسے
کیسی تکلیف ہوتی ہوگی۔ پلنا۔ ذرا ادھر آؤ۔ اس بدنصیب کو اس تابوت میں لیٹ کر
دکھاؤ۔" اس نے پلنا کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور پھر مجھ سے بولا۔

"دیکھ سلطان دیکھ۔ کیسی تکلیف ہوتی ہوگی اس تابوت میں اسے۔" اس نے پلنا کو
تابوت پر جھکا دیا اور پلنا بادلِ ناخواستہ تابوت میں لیٹ گئی۔ حامد ڈرامائی انداز میں بولا۔

"آہ۔ یہ بیچاری لڑکی اس قبر میں کتنے عرصہ دفن رہی۔ ذرا محسوس کر جب یہ ڈھکن
بند ہوا ہوگا۔" حامد نے جذباتی انداز میں تابوت کا ڈھکن بند کردیا اور اس کے ساتھ ہی پلنا
کی چیخ ابھری۔

"حامد۔ کھولو اسے آہ اسے کھولو۔" لیکن دوسرے لمحے حامد نے ایک قہقہہ لگایا اور
جلدی سے ایک قفل اس تابوت میں ڈال دیا۔ "انسان سے بڑی بدروح کوئی نہیں ہے
پلنا۔ ذلیل ناپاک روح۔ میں اپنے دوست پر ساری کائنات لٹا سکتا ہوں۔ یہ دولت کیا
حیثیت رکھتی ہے۔ اب تو جہنم رسید ہوجا۔" حامد نے شراب کی ایک بوتل اٹھا کر تابوت
پر الٹ دی اور پٹرول کی بو پھیل گئی۔

"حامد۔ ذلیل کمینے۔ مجھے آزاد کردے۔ آہ مجھے آزاد کردے ورنہ میں۔ ورنہ
میں۔" تابوت سے دھماکے ہونے لگے۔

"میں ابھی تجھے آزاد کرتا ہوں ناگن چڑیل۔" حامد نے ماچس نکال کر ایک تیلی
کھینچی اور تابوت پر اچھال دی۔ اندر سے پلنا کی دلخراش چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور حویلی
کے در و دیوار ہل رہے تھے۔

میرے ذہن پر سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ یہ بدلا ہوا وقت میرے لئے اجنبی تھا۔ سب کچھ
میری سمجھ میں آگیا تھا۔ میرے دوست حامد نے یہ سب کچھ میرے لئے کیا تھا۔ اس نے

ایک بدروح کو شکست دی تھی۔ میری آنکھوں میں فرطِ ممنونیت سے آنسو نکل آئے اور
حامد میری رسیاں کھولنے لگا۔ میں.......... اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا
اور حامد مجھے تسلیاں دے رہا تھا۔

پھر اس نے چند دستاویزات نکال کر اس جلتے ہوئے تابوت پر پھینک دیں۔ ”یہ وہ
کاغذات ہیں جن کے تحت میں تیری جائیداد کا متولی بنا تھا۔ خدا کی قسم ساری دنیا کی دولت
لٹا دوں تجھ پر۔ مجھے تیری غلامی ہی پسند ہے۔“

راستے میں حامد نے بتایا کہ کس طرح اس دوران اس نے پلنا کو خوش رکھا اور اس
کی موت کے سلسلہ میں روحانی ماہرین سے بھی ملتا رہا اور ماہرین کی ہدایت پر ہی اس نے
یہ عمل کیا تھا۔

”میں نے اس دوران بڑے گناہ کئے ہیں۔ خدا مجھے معاف کرے۔“ اس نے کہا۔

”حامد میرے دوست۔ ایک بات سے میں بھی توبہ کرتا ہوں۔ آئندہ گناہوں کی یہ
زندگی ترک کردوں گا اور شریف انسانوں کی طرح کسی کو شریکِ حیات بنا کر زندگی بسر
کروں گا۔“

”ہمارے لئے اب یہی بہتر ہے سلطان۔ خوب سبق مل چکا ہے۔“ حامد نے کہا اور
ہم دونوں ہنسنے لگے۔

☆------☆------☆

خیال قاتل

ایک باکمال آرٹسٹ کی حیرت ناک کہانی۔
جس کی انگلیاں برش پکڑتیں تو تصاویر
منہ سے بول پڑتی تھیں۔ پہلے جنم سے
دوسرے جنم تک پھیلی پُراسرار داستان
اسے ایک چہرے سے نفرت ہوگئی تھی...... کیوں؟

اگر لوگ اجنبی ہوں' ماحول اجنبی ہو تب ماضی کے بارے میں جو کچھ بھی کہا
جائے' کون تحقیق کرے گا.......... اور کون یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ جو
تم کہہ رہے ہو وہ درست ہی ہے۔

ہاں البتہ ذہین لوگ اس بات کا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ کم از کم ان لوگوں
سامنے کچھ نہ کہیں' جو ان کا ماضی اچھی طرح جانتے ہوں۔

تمہید اس لئے باندھنی پڑی کہ میں خود کو حالات کا شکار سمجھتا رہا' پہلے میں نے ا
بارے میں یہ سوچا تھا کہ کسی سے کچھ کہنا حماقت ہے کہ میرا ماضی کیا تھا۔ لوگ مجھ
پوچھتے تھے کہ کہاں کے رہنے والے ہو' تب میں اپنے وطن کا نام بتا دیا کرتا تھا' کسی
اگر اصرار کیا کہ میرے خاندانی حالات کیا تھے تو تھوڑا بہت بتا دیا لیکن عام طور سے کوشش
یہی کرتا تھا کہ تفصیلات بتانے سے گریز کروں۔

ویسے یوں بھی ماضی میرے نزدیک بے جان چیز ہے' ممکن ہے آپ اس سے اتفا
نہ کریں' لیکن میرے نزدیک یہ ٹھوس حقیقت ہے' ماضی گزرا ہوا وقت ہے جو اپنا نہ
ہوتا اور ہاتھ سے نکلی ہوئی چیز کے بارے میں کیا سوچنا یا گزرے ہوئے لمحات کو دہرا
سے کیا فائدہ۔

حال سب سے قیمتی شے ہے اور حال ہی سے مستقبل کی تعمیر کی جاسکتی ہے۔ ماضی
صرف ایک یاد ہوتا ہے اور یادیں ذہن کو سوائے افسوس کے کچھ نہیں دیتیں' اب آ
سوچیں گے کیوں؟ تو سنئے..........

آپ کا ماضی بے حد شاندار رہا ہے' آپ کے ماضی میں بے شمار خوشگوار یاد
ہیں۔ گزرا ہوا بچپن ہے۔ ہنستی ہوئی جوانی ہے۔ یا پھر..........

اگر آپ کا ماضی غیر مطمئن رہا ہے' آپ افلاس کا شکار رہے ہیں ایسی صورت م
ماضی دونوں صورتوں میں غمناک ہے..........

خوشگوار یادیں بے شک ذہن و دل پر خوشگوار تاثر چھوڑتی ہیں لیکن جب وہ گھڑیا

ہاتھ سے نکل جاتی ہیں تو انسان سوائے کفِ افسوس ملنے کے کچھ نہیں کر سکتا.......... اور
غم ناک ماضی یا غیر مطمئن ماضی کسی بھی شخص کے لئے دلکش نہیں ہوتا۔

یہ تو تھی ماضی کی بات' اب اگر میں بر سبیلِ تذکرہ آپ کو یہ بات بتا دوں کہ زندگی
کے ابتدائی سال بہت اچھے انداز میں گزرے تھے' والد صاحب اچھے کھاتے پیتے آدمی
تھے۔ اس لئے اس قسم کے لوگوں کی اولادیں جس انداز میں پروان چڑھتی ہیں وہ فطری چیز
ہے' اس کے بارے میں تفصیلات بتانا حماقت ہی ہے۔

جوانی آئی.......... تو بہت ساری مشکلات پیدا ہوگئیں۔ اس وقت میری عمر تقریباً
اکیس سال تھی' جب والد صاحب نے میری شادی کا منصوبہ بنایا۔

شادی کر دی گئی' ثریا میرے لئے کسی روایتی محبوب کا درجہ نہیں رکھتی تھی۔ بس
خاندان ہی کی لڑکی تھی' صورت شکل کی اچھی خاصی تھی.......... اور چونکہ میں نے اس
وقت تک عورت کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا' لوگ شادی کرتے تھے' والدین
کرا دیتے تھے۔ یہی طریقہ کار تھا اور یہی روایت' چنانچہ میں نے بھی شادی کر لی۔

ہاں ثریا کے آنے کے بعد میرے ذہن میں کچھ تبدیلیاں ضرور پیدا ہوئیں وہ مجھے
اچھی لگنے لگی' ظاہر ہے تنہائیوں کی ساتھی تھی' ہر دکھ درد کی شریک اور یوں بھی وہ بہت
اچھی عورت تھی۔

چنانچہ والدین کی خواہش میں میری پسند بھی شامل ہوگئی' ثریا کے ساتھ شادی کئے
ہوئے دو یا ڈھائی سال ہی گزرے تھے کہ حالات نے اچانک پلٹا کھایا۔ تقسیم کے فسادات
شروع ہوگئے اور ہمارا علاقہ بھی فسادات سے محفوظ نہ رہ سکا' جو لوگ بچپن سے لے کر
اب تک مجھ سے پیار کرتے آئے تھے۔ جن میں کسی کو چاچا' کسی کو تاؤ' کسی کو ماموں' کسی
کو ماما کہا کرتا تھا۔ وہی چھریاں نیزے اور تلواریں لے کر آگئے اور قتل و غارت گری
شروع کر دی۔

نہ جانے کون سے جذبے نے اپنی پرانی تمام باتیں بھلا دی تھیں۔ میرے والد کو جس
شخص نے قتل کیا اسے میں چاچا کہا کرتا تھا۔ ہمیشہ وہ ہمارے گھر آتا تھا اور بہت ہی پیار
و محبت سے ملتا تھا اور میرے پورے گھر والوں سے بھی اس کا رویہ بہت ہی خوب تھا۔

وہ خود بھی چھوٹا سا زمین دار تھا۔ اکثر اپنی زمینوں سے اناج لے کر ہمارے ہاں آیا
کرتا تھا۔ حالانکہ اللہ کا دیا سب کچھ تھا' لیکن ہم اسے چاچا کہتے تھے اس کے لئے والد
صاحب کا حکم تھا کہ ہمیشہ اس کی اچھے انداز میں پذیرائی کی جائے اور یوں اس کے جذبات

کا مکمل طور پر خیال رکھا جاتا تھا اور پھر اسی نے میری نگاہوں کے سامنے ہندو مسلم تعصب میں سمٹ کر میرے والد صاحب کو قتل کر دیا۔

مجھے بھی زخمی کر دیا گیا تھا اور جب میں بے ہوشی سے ہوش میں آیا تو ثریا میرا سر اپنے زانو پہ رکھے رو رہی تھی۔ میرے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی، تب میں نے کراہ کر ثریا سے پانی مانگا۔

ثریا جلدی سے پانی بھر کر گلاس لے آئی۔ پانی پینے کے بعد میرے حواس کچھ بحال ہوئے تو میں نے اس سے حملہ آوروں کے بارے میں پوچھا۔

ثریا نے بتایا کہ وہ لوگ آکر جا چکے ہیں خود اس نے ایک گندی نالی میں چھپ کر جان بچائی تھی جس کے نشانات اس کے چہرے اور بدن پر موجود تھے۔ میں غم و غصہ سے پاگل ہو گیا تب میں نے اپنے دیگر اعزاء کے بارے میں پوچھا تو علم ہوا کہ سب کے سب شہید ہو چکے ہیں۔ صرف میں بچ گیا تھا جسے وہ لوگ مردہ سمجھ کر ہی چھوڑ گئے تھے۔ ورنہ مجھے بھی ہلاک کر دیتے۔

ان حالات میں ذہن کی جو بھی کیفیت ہوتی کم تھی لیکن ثریا جیسی غم گسار عورت نے مجھے سہارا دیا۔ گھر میں کافی لوٹ مار کی گئی تھی جو کچھ بچا تھا اسے سمیٹا اور دیگر لوگوں کی طرح اس طرف چل پڑے جو ہماری آخری پناہ گاہ تھی یعنی پاکستان.........

پاکستان میں داخل ہونے کے بعد وحشت و بربریت کے ان پیکروں سے جان بچ گئی تھی۔ جنہوں نے سب کچھ بھلا دیا تھا جن کے لئے انسان کا کوئی تصور نہیں رہا تھا لیکن بہر صورت یہاں بھی زندگی بے حد کٹھن تھی۔

حالانکہ جس دور کی میں بات کر رہا ہوں اس دور میں مصوری کو کوئی اعلیٰ حیثیت حاصل نہیں تھی لیکن زمین دار کے بیٹے کا شوق اس وقت پورا ہونا شروع ہو گیا تھا جس وقت سے اس نے شوق کا اظہار کیا تھا۔

ہاں مجھے بچپن ہی سے فنِ مصوری سے دلچسپی تھی، چھوٹی موٹی تصویریں بنایا کرتا تھا۔ والد صاحب نے تصویریں دیکھیں، میرے ذوق کو سراہا اور میرے لئے باقاعدہ بندوبست کر دیا۔

ایک آرٹسٹ کو دہلی سے بلوایا گیا تھا اور اسے باقاعدہ ملازمت دی گئی۔ اچھی خاصی رقم دی جاتی تھی اور وہ آرٹسٹ مجھے تصویر کشی سکھاتا تھا۔ یوں رنگوں اور برشوں کے کھیل میں، میں تھوڑے عرصے میں کافی مہارت حاصل کر گیا لیکن میں نے ذہن میں کبھی یہ

سوچا بھی نہ تھا کہ یہ شوق کبھی پیشہ بھی بن سکتا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد حالات چونکہ بہت خراب تھے، جسم پر موجود لباس کے علاوہ کوئی ایسی خاص چیز نہیں تھی جس سے زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا جا سکے، لیکن یہاں بھی ثریا نے اپنی ذہانت اور محبت کا مظاہرہ کیا اس نے بتایا کہ وہ اپنے زیورات یہاں تک لانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ گو ان زیورات کو یہاں تک لانے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن زیورات دیکھ کر جو ڈھارس بندھی اس کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتا یوں لگا تھا جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔

میں نے کبھی کسمپرسی کا دور نہیں دیکھا تھا، ہمیشہ خوشگوار طریقے سے زندگی گزاری تھی لیکن یہاں آنے کے بعد یہ خیال ذہن میں ضرور پیدا ہوا تھا کہ ثریا کو کیا کھلاؤں گا، خود کس طرح زندگی گزاروں گا۔ ظاہر ہے پاکستان ابھی خود بے حد پسماندہ تھا اور ظاہر ہے وہ لوگ جو ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے ہیں اس بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ اس وقت پاکستان اس قابل نہیں تھا کہ اس پر بوجھ بنا جائے۔

ثریا کے زیورات میری آنکھوں میں چمک بن گئے اور پھر ہم نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ زندگی کا آغاز کیا۔

چھوٹی سی جگہ ایک چھوٹا سا مکان لے لیا۔ ہم صرف دو افراد تھے ہمارے علاوہ اور کوئی تو تھا نہیں جو ہمیں بڑے مکان کی ضرورت ہوتی اور پھر اس کے بعد ایک چھوٹی سی دکان کا بھی بندوبست کیا گیا۔

میں نے اور ثریا نے زندگی گزارنے کے بے شمار پروگرام بنائے تھے اور اب ہم ان پروگراموں پر قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے۔ ہم نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ ہمارے پاس کیا ہے اور ہم نے اسے کس طرح خرچ کرنا ہے۔ ثریا ہی کے ایماء پر میں نے اپنے فنِ دست کشی کے شوق کو پیشہ بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ رنگ، برش اور کینوس خریدے گئے اور میں اپنی دکان میں بیٹھ کر مختلف تصویریں بنانے لگا۔ میری دکان پر موجود بورڈ پر Painter لکھا ہوا تھا۔

بے شمار تختیاں، پلیٹیں اور اس قسم کی چیزیں میرے پاس لکھنے کے لئے آتیں اور مجھے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔

میں اور ثریا خوش تھے۔

فن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ میں یہاں تک محدود ہوں لیکن ایک بار میں

نے فرصت کے لمحات میں ایک تصویر بنائی اور وہ تصویر اپنی دکان میں سجا دی۔

منہ سے بولتی ہوئی جاندار تصویر جسے دیکھ کر راہ چلتے لوگ رک جایا کرتے تھے۔ پھر ایک فنِ مصوری کے دلدادہ شخص نے اسے دیکھ کر گاڑی روکی اور پھر وہ میرے پاس پہنچ گیا۔

"مسٹر......... یہ تصویر کیا آپ نے بنائی ہے؟" نوجوان نے پوچھا' صورت ہی سے شوقین معلوم ہوتا تھا۔

"جی ہاں......... یہ میری اپنی کاوش ہے۔"

"لیکن آپ کی دکان تو........."

"ہاں......... اس میں کوئی کمال نہیں ہے' بے شمار لوگ ایسے ہیں جو بہت کچھ ہیں لیکن پیٹ بھرنے کے لئے وہ' وہ کچھ کر رہے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہئے۔ بہرصورت تصویر میں نے یہاں لگا کر اپنے ذوق کی تسکین کی ہے اور چاہتا ہوں کہ اس فنِ کو کچھ اور آگے بڑھاؤں۔"

"بہت ہی حسین تصویر ہے' اگر تم چاہو تو اسے میرے ہاتھ فروخت کردو۔" نوجوان شخص نے کہا۔

"ہاں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے دل میں ہنستے ہوئے کہا۔ مصوری تو میرا شوق تھا' لیکن میں اتنا بڑا نہیں ہوں کہ کسی بھی چیز کو اپنی انا کا سوال بنا دوں۔ ٹھیک ہے جب پیسہ تھا تو یہ شوق تھا اور یہ پیسہ نہیں ہے تو یہ پیشہ ہے' جب میں شوقین تھا اس وقت اس کی دوسری کیفیت تھی اور آج اگر یہ میری زندگی کا سہارا بن رہا ہے اور میرے گزارے کے لئے ایک اچھا ماحول فراہم کرسکتا ہے تو پھر آج میں اس سے پہلو تہی کیوں کروں؟

میں نے انتہائی مہنگے داموں یہ تصویر بیچی' خریدنے والا اتنا شوقین تھا کہ میں نے جو کچھ مانگا اس نے نکال کر میرے سامنے رکھ دیا اور میں حیران رہ گیا۔ یہ تو بہت ہی عمدہ بات تھی۔

جو کچھ ملا تھا اسے میں نے احتیاط سے رکھا۔ ثریا بھی اس سے بہت خوش ہوئی تھی اور پھر ہم نے باقاعدگی کے ساتھ یہ کام شروع کردیا۔

میں خوبصورت تصویریں بناتا' انہیں دکان میں رکھتا اور وہ کسی نہ کسی طرح بکتی چلی جاتیں۔

اب میرے تعلقات کچھ اور بڑھنے لگے تھے' چنانچہ میں نے اپنی جمع کی ہوئی رقم خرچ کرکے اسی جگہ دو اور دکانیں حاصل کرلیں۔ اس طرح میرا اسٹوڈیو کافی بڑا ہوگیا تھا میں اب گاڑیوں کی پلیٹیں' اور بورڈ وغیرہ لکھنے کی بجائے تصویر کشی کرتا تھا' شوقین لوگ میرے اسٹوڈیو میں آتے' ماڈل بنتے اور اپنی تصویریں بنواتے اور مجھے اچھی خاصی منہ مانگی قیمت دے کر جاتے تھے۔

چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ہمارے حالات بدلنے لگے' ہم لوگوں کے چہروں پر رونق آگئی اور جو کچھ کھو چکے تھے اسے آہستہ آہستہ بھولتے جارہے تھے۔ ہاں اب اس نئی زندگی میں کچھ نئی تبدیلیاں لانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

چنانچہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ہم نے ایک اور بڑا مکان حاصل کرلیا اور ہمارا طرزِ زندگی کچھ اور آگے بڑھا۔ گویا اب ہم یعنی میں اور میری بیوی ترقی کی جانب گامزن تھے اور ایک حسین زندگی میں جارہے تھے۔

لیکن جناب یہ بھی کہا ہے کسی نے کہ یہ آسمان بڑی عجیب وغریب چیز ہے میں نہیں سمجھتا کہ لوگ آسمان وغیرہ کے چکر میں کیوں پڑ گئے ہیں لیکن کہا ضرور جاتا ہے' خواہ اس کی وجہ تسمیہ کچھ بھی ہو' لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

چنانچہ حضرات آسمان نے میرے اوپر اپنی گردش کا سایہ ڈالا' بات بہت عجیب تھی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھ جیسا سنجیدہ پڑھا لکھا آدمی کسی ایسے عجیب سے چکر میں گرفتار بھی ہوسکتا ہے۔

میرا اسٹوڈیو شہر کے کسی بہت زیادہ بارونق حصے میں نہیں تھا۔ بلکہ ایک چھوٹی سی گلی میں تھا۔ جہاں اور بھی دکانیں تھیں جو سرِ شام ہی بند ہوجاتی تھیں۔ میں عموماً رات کو دیر تک کام کیا کرتا تھا۔

اکثر لوگوں کو میرے بارے میں علم ہوگیا اور یوں شوقین لوگ بعض اوقات چلے آیا کرتے تھے۔ کیونکہ میری تصویریں خاصی پسند کی جاتی تھیں' خاص طور سے وہ لوگ جو میری تصویریں خرید کر لے گئے تھے' مجھ سے واقفیت رکھتے تھے اور ان کے اپنے حلقے میں' میں بہت مقبول تھا۔ بہت سے لوگ اپنی اپنی تصویریں بنوانے آتے تھے' جن میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔

میں نے ان سب کو مطمئن کردیا تھا اور اس طرح وہ میرے مستقل گاہک بن گئے تھے۔ خواتین تنہا بھی میرے پاس آیا کرتی تھیں۔

حالانکہ میری عمر زیادہ نہیں تھی لیکن حالات وحوادث نے مجھے سنجیدہ اور بُر
فطرت کردیا تھا چنانچہ کسی قسم کی شکایت کسی کو نہ ہوئی جس سے میری نیک نامی پر حر
آتا۔

اس شام میں فارغ تھا جو تصویر فریم پر لگی ہوئی تھی اسے مکمل کرنے کے بعد
نے آخری ٹچ دیئے تھے لیکن یہ تقریباً ساڑھے گیارہ یا بارہ بجے کی بات ہے۔ کوئی تص
میرے ہاتھ میں نہیں تھی اور نہ ہی کوئی تصویر شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ اس کی وجہ
آسمان پر چھائے ہوئے بادل تھے لیکن کیونکہ جس شخص کی میں نے تصویر بنائی تھی ا
سے وعدہ کیا تھا کہ آج اسے یہ تصویر دے دوں گا۔ اس لئے میں اس کا انتظار کررہا تھ
بادلوں کی وجہ سے اگر میں چاہتا تو اسٹوڈیو بند بھی کرسکتا تھا' ظاہر ہے کسی کی پابندی تو نہ
تھی لیکن یہ میرے اصول کے خلاف تھا۔

بہرحال رات ہوگئی اور وہ شخص تصویر لینے نہ آیا۔ تب میں نے سوچا کہ حسب
معمول جب تک دکان کھولتا ہوں اس وقت تک تو انتظار کروں گا ہی' کیونکہ یہ م
کاروباری اصول تھا اور جلدی دکان بند کرکے چلے جانا اچھی بات نہیں تھی کیونکہ میر
ذہن میں یہ بات تھی کہ ممکن ہے وہ شخص آ ہی جائے اور اگر اسے وقت پر اپنی تصو
نہیں ملی تو اسے کافی مایوسی ہوگی۔ چنانچہ میں اس کا انتظار کرتا رہا۔

چار بجے کے بعد ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی شروع ہوگئی تھی میں نے اپنے ملازم غفو
سے اپنے لئے چائے منگوائی اور اسٹوڈیو میں اندر ہی بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

ذہن خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ چند ساعت کے بعد غفور آیا اور بولا۔

"صاحب جی۔ ایک بی بی جی آئی ہیں؟"

"اوہو......... بی بی ہیں یا صاحب بھی ہیں؟"

"نہیں جی' صرف بی بی ہیں۔"

"خیر کوئی بات نہیں' کیا کہتی ہیں؟"

"آپ کو پوچھ رہی ہیں۔" غفور نے جواب دیا۔

"بھیج دو۔" میں نے کہا اور چائے کا آخری گھونٹ لے کر پیالی ایک طرف رکھ
دی۔ پھر سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں رکھا اور اسے سلگانے لگا' اور
اسی وقت وہ اندر داخل ہوئی۔

شاعرانہ باتیں کرنا میرے لئے مشکل کام نہیں ہے۔ کیونکہ مصوری اور شاعری

خاصی نزدیکی چیزیں ہیں۔ عورت کے حسن کی تعریف میں برش لے کر کرتا ہوں جب کہ
شاعر حضرات قلم سے لکھتے ہیں۔ مجھ میں اور ان شاعروں میں فرق صرف یہی ہے کہ وہ
الفاظ میں شاعری کرتے ہیں اور میں لکیروں میں۔

لیکن وہ عورت جو اندر آئی تھی ایک مجسم غزل تھی۔ سلک کا سادہ سا سفید لباس
پہنے' بال کھولے ہوئے' مجموعی طور پر حسن و پاکیزگی کا ایک اعلیٰ شاہکار تھی۔ شکل
صورت سے ایک عجیب سی پُراسرار کیفیت ٹپکتی تھی ویسے میرے خیال کے مطابق وہ کسی
اچھے گھرانے ہی کی تھی اور یقیناً کسی لمبی کار میں آئی ہوگی۔

بہرحال میں نے اٹھ کر اس کی پذیرائی کی لیکن وہ دروازے میں کھڑی ہوگئی اور غور
سے مجھ دیکھنے لگی۔ دیکھتی رہی اس کا انداز خاصا پُراسرار تھا۔ میں خجالت سی محسوس کرنے
لگا۔

چند ساعت اس طرح گزر گئے تب میں نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "تشریف
لائیے خاتون' آپ کس سوچ میں ڈوب گئیں۔"

"آں.........." وہ چونک پڑی پھر وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی تب مجھے احساس ہوا کہ
اس کی چال بھی بے حد عجیب ہے' کھوئی کھوئی مست مست سی چال' جیسے قدم نہ اٹھا رہی
ہو یا جیسے اس کے پاؤں میں اسکیٹنگ شوز بندھے ہوں یا پھر وہ ہوا میں تیر رہی ہو۔

آگے بڑھ کر وہ ایک جگہ پہنچی' میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا' تب میں اس سے
تھوڑے فاصلے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مجھے اب بھی اسی انداز میں دیکھے جارہی تھی
عجیب کھویا کھویا سا انداز تھا' آنکھیں میری جانب نگراں تھیں۔

اس کے اس عجیب رویئے سے میں خاصا الجھ گیا تھا۔ پھر میں نے اس سے دوسرا
سوال کیا۔

"آپ جس کام سے تشریف لائی ہیں براہ کرم آپ مجھے اس کام سے آگاہ کریں اور
ہاں آپ کیا پئیں گی؟ ویسے میرا خیال ہے اس خنک موسم میں آپ کے لئے چائے بہتر
ہوگی۔"

"جی نہیں شکریہ۔" اس نے تھکی تھکی آواز میں کہا اور میں نے گہرے سانس لیتے
ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

"تکلف کی ضرورت نہیں' خاتون اگر آپ چائے کی ضرورت محسوس کررہی ہیں تو
میں ملازم کو آواز دوں۔"

"جی نہیں، میں نے کہا نا شکریہ۔" اس نے جواب دیا اور میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"آپ........." اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"جی، ظاہر ہے آپ کسی کام سے میرے پاس تشریف لائی ہوں گی۔ میں آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ حکم دیجئے۔"

لڑکی جتنی خوبصورت تھی اسے دیکھ کر کسی مصور کے ذہن کی جو کیفیت ہو سکتی تھی وہی میری بھی تھی لیکن بہرصورت میں اپنے فن سے مخلص تھا۔ اپنے پیشے سے مخلص تھا اور اپنے حالات کے بارے میں بہتر طور پر جانتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنی بیوی کی امانت تھا۔ جانتا تھا کہ میں شادی شدہ ہوں اور ثریا میری زندگی کی بہترین ساتھی ہے۔ میرے لئے ایثار کرنے والی ہر قدم کی ساتھی، جلوتوں کی رفیق، خلوتوں کی امین، میری زندگی کی ابتدا و انتہا اب اسی کے دم سے تھی۔

یہ لڑکی بے شک ثریا سے بے حد حسین تھی اس میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اب میں اس سے عشق شروع کر دوں، اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے لئے تعجب خیز تھی کہ لڑکی جانے بوجھے بغیر میرے پاس آ گئی اور اب مجھے اس انداز سے دیکھ رہی ہے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر خود کو روکے ہوئے ہے۔ اس کی غیر منتشر سوچیں مجھے غلط فہمی کا شکار کر سکتی تھیں۔

چند ساعت لڑکی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ شاید اس کی سوچیں سمٹ گئی تھیں تب وہ آہستہ سے بولی۔

"میں اپنی تصویر بنوانا چاہتی ہوں۔"

"بہت خوب۔ اب آئیں آپ مطلب پر، میرا خیال ہے باہر کی بارش نے آپ کو الجھا دیا تھا۔ آپ ذہنی طور پر غیر مطمئن تھیں اور وہ نہیں کہہ پا رہی تھیں جو کہنا چاہتی تھیں۔ بہرصورت مصوری میرا شوق ہے اور فن مصوری میرا پیشہ، میں یقیناً آپ کی تصویر بناؤں گا جو آپ کو پسند بھی آئے گی۔ اس سلسلے میں ہمیں ضروری امور پر گفتگو کر لنی چاہئے کیا آپ میری اس صاف گوئی کو پسند کریں گی؟"

"جی ہاں!" اس نے آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت سے ٹکتے ہوئے کہا۔

"خاتون آپ کچھ تھکی سی محسوس ہوتی ہیں، اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو میں آپ سے عرض کروں کہ آپ کچھ پی لیں۔ ہمارے سامنے والے ہوٹل میں چائے بہت اچھی ملتی

ہے۔ میرا ملازم غفور ابھی چند ساعت کے بعد آپ کو چائے پلائے گا، اس دوران ہم گفتگو بھی کریں گے اور دوسرے امور بھی طے ہو جائیں گے۔"

"جی نہیں شکریہ میں چائے نہیں پیتی۔"

"کچھ اور........."

"کچھ بھی نہیں۔" اس نے ناز بھرے انداز میں اپنے جملوں پر زور دیتے ہوئے کہا اور وہ خاموش ہو گیا۔

میرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ "ضدی معلوم ہوتی ہیں آپ۔" میں نے کہا اور پھر معذرت آمیز انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

مجھے اس قدر جرأت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ میں نے سوچا، لیکن لڑکی کے چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کئے کرسی کی پشت سے ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اس کے خدوخال کو دیکھا اس کے حسین سراپے کو دیکھا اور میری نظریں اس کے جسم کے مرمریں حصوں پر جا ٹکیں۔

واقعی بے حد حسین لڑکی تھی اور بلاشبہ میں اس کی خوبصورت ترین تصویر بنا سکتا تھا۔ پھر گفتگو شروع کرنے کی خاطر کہا۔

"خاتون آپ کو میرا پتا کہاں سے معلوم ہوا؟" میرے سوال پر لڑکی نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ دیر تک یک ٹک مجھے دیکھتی رہی، پھر اس کی آنکھوں میں عجیب سی اداسی تیر گئی۔

"تمہارا پتہ........." اس نے آہستہ سے کہا۔

"جی یقیناً آپ کی کسی دوست نے مجھ سے تصویر بنوائی ہوگی۔ اتفاق سے خاتون میری یادداشت بہت اچھی ہے۔ اگر آپ ان خاتون کا نام لے لیں جنہوں نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے تو میں یقیناً انہیں پہچان لوں گا۔ ان کے خدوخال تک آپ کو بتا دوں گا۔"

"تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے؟" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں میرا یہی خیال ہے اور شاید صحیح بھی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تو پھر مجھے پہچانو........."

"جی!" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"ہاں مجھے پہچانو........."

"لل......... لیکن........" میں گڑبڑا سا گیا۔

"تمہارا نام شکیل ہے، نا.........؟"

"جی ہاں......... جی ہاں! لیکن، لیکن......... کیا آپ مجھے جانتی ہیں.........؟"

"جی ہاں میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں' بہت اچھی طرح لیکن اس حیثیت سے نہیں۔"

"کیا مطلب.........؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

اور وہ جیسے چونک پڑی' پھر آہستہ سے ترنم ریز لہجے میں ہنس پڑی۔ "کوئی مطلا نہیں آرٹسٹ' ہاں تم باتیں بہت کرتے ہو۔"

"دراصل باہر بارش ہو رہی ہے اور موسم کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ ذہنی طور پر کاروبار کے لئے تیار نہ تھا۔ اب آپ تشریف لائی ہیں تو جس قسم کی گفتگو آپ ا فرمائیں۔ دراصل یہ گفتگو کاروبار سے ہٹ گئی تھی۔ ذاتی طور پر میں نے آپ سے ب سی باتیں کیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ یہ باتیں آپ کو ناگوار گزر رہی تھیں۔"

"ارے نہیں......... اس انداز میں مت سوچو آرٹسٹ' اس انداز میں مت شکیل' دراصل میں بھی بے تکلفی کی عادی ہوں۔"

"جی........." میں نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔ عورت کے الفاظ مجھے ناگوار گزر تھے۔ ظاہر ہے فطرتاً تو میں کاروباری آدمی نہیں تھا۔ میری اپنی بھی کوئی شخصیت تھی ا تک میں خود کو کوئی زیادہ حیثیت نہیں دے سکا تھا کیونکہ حالات ہی ایسے تھے' لیکن زمانے میں' میں بھی اپنی پسند کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اپنی مرضی سے بولتا اور سنتا تھا' ل اب......... بہرصورت میں نے ان تمام خیالات کو ذہن سے نکال دیا اور پھر اس کی جا دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے خاتون' تو میری خواہش ہے کہ آپ اس سلسلے میں کاروباری معاملا طے کرلیں۔"

"کاروبار......... کاروبار......... کاروبار......... کیا تمہارے ذہن پر کاروبار ب زیادہ سوار ہے۔" اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"ہونا بھی چاہئے......... ظاہر ہے آپ میرے پاس تشریف لائی ہیں میری گاہک حیثیت سے......... اس صورت میں' میں اگر آپ سے کاروبار کی باتیں نہ کروں تو باتیں کروں اور اگر دوسری صورت میں دوسری باتیں کروں بھی تو یقیناً وہ آپ کو پ

نہیں آئیں گی۔ آپ بھی کسی ایسے آدمی سے بے تکلف ہونا پسند نہیں کریں گی جو آپ کا کوئی بھی نہ ہو ایسی صورت میں خاتون مجھے ان باتوں کے علاوہ کیا کرنا چاہئے.........؟"

"اُفوہ......... ذرا سی بات کو افسانہ بنا دیتے ہو' ہمیشہ کی عادت ہے تمہاری۔"

"جی........." میں تعجب سے چونک پڑا' وہ تو ایسے بات کر رہی تھی جیسے وہ برسوں کی شناسا ہو میری' میری ساری فطرت سے اچھی طرح واقف ہو لیکن میں اسے نہیں پہچان رہا تھا اور پھر اس کی عمر' سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ اس کا میری زندگی سے کوئی تعلق ہو۔ وہ بالکل نوجوان تھی اس کی زیادہ سے زیادہ عمر انیس یا بیس سال ہوگی۔ یا ممکن ہے اس سے کچھ زیادہ ہو' خدوخال سے کوئی خاص اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں نے اسے کہیں نہیں دیکھا تھا۔

"کیا آپ مجھے ذاتی طور پر جانتی ہیں؟"

"ہاں........." اس نے جواب دیا۔

اور یہ لمحہ میرے لئے پھر چونکنے کا تھا۔ میرے ذہن کے کسی خانے میں اس لڑکی کا تصور کوشش کے باوجود ابھر نہ پا رہا تھا میں نے اس کی جانب دیکھا' اس کی آنکھوں میں عجیب سی کیفیت سمٹ آئی تھی اور یہ کیفیت پھر مجھے الجھن میں مبتلا کرنے لگی۔

میں مصور تھا' چہرے کی لکیروں سے' آنکھوں کے رنگوں سے' ہونٹوں کی لرزش سے' کانوں کی لوؤں سے' ہونٹ ہلنے کے انداز سے جذبات کی عکاسی کیا کرتا تھا' چنانچہ ان آنکھوں کی کیفیت کو میں کیوں نہ سمجھتا اور یہ کیفیت بڑی حد تک الجھا دینے والی کیفیت تھی' خود سپردگی تھی اس کیفیت میں' دعوت تھی اس کیفیت میں جو میرے لئے بظاہر غیر پسندیدہ تھی۔

اس کی آنکھوں کے ڈورے رنگین ہو رہے تھے اور چمکتی ہوئی آنکھوں میں پیار کا سا انداز تھا۔ میں بوکھلا کر رہ گیا......... دوسرے لمحے میں نگاہیں نیچے کر چکا تھا۔ تب میں آہستہ سے بولا.........

"آپ اپنی تصویر کب بنوائیں گی.........؟"

"جب تم بنا دو........." اس نے جواب دیا۔

"دیکھیں خاتون میرا تو پیشہ ہی یہ ہے' میں دوسرے لوگوں کی مانند اپنے گھر بھی جا سکتا تھا لیکن میرے حالات مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ میں اس لئے یہاں بیٹھا ہوا تھا کہ گاہک آئے اور مجھ سے کاروباری گفتگو کرے' تاکہ میرا کاروبار چلے' جانتی ہیں کیوں'

اس لئے کہ میں نے زندہ رہنا ہے اور اب آپ تشریف لائی ہیں' آپ حکم دیں میں شروع کردوں' اور ہاں کس قسم کی تصویر بنوائیں گی آپ۔"

"اس کا فیصلہ بھی تم خود ہی کرلو۔" اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا۔

"جی بہت بہتر' تو باقی معاملات.........." میں اس سے سوالات کررہا تھا اور وہ بد
مجھے گھورے جارہی تھی۔ اس نے آنکھیں دوبارہ کھول لی تھیں البتہ گردن کرسی کی پش
سے بدستور ٹکی ہوئی تھی' اس انداز میں تکنے سے اس کے دونوں ہونٹ خفیف سے
گئے تھے جس سے دو دانت باہر جھانک رہے تھے اور اس انداز میں بڑی ہی دلکش لگ ر
تھی لیکن میں اسے صرف ایک مصور کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا کسی عاشق کی نگاہ سے نہیں کسی ایسے بوالہوس مرد کی نگاہ سے نہیں جو عورتوں کو دیکھ کر دیوانے ہوجایا کرتے ہیں۔

ہاں جناب میں دعوے سے کہتا ہوں کہ عورت کو دیکھ کر جنسی فطرت میرے ا
کبھی نہیں ابھری۔ ثریا بہرطور میرے لئے بھرپور عورت تھی اور میں اس کے علاوہ
اور کو اس انداز میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ خود ہی سنبھل کر بیٹھ گئی اور بولی۔ "معاف کرنا مصور
نے تمہیں تکلیف دی۔ دراصل تمہارا سوچنا ہی درست ہے' باہر کے موسم نے ا
تمہارے اس اسٹوڈیو کی خوابناک سی فضا نے مجھے بڑا متاثر کردیا تھا اور میرے ا
اضمحلال سا پیدا ہوگیا تھا۔ بہرصورت اب میں ٹھیک ہوں ہاں تو تم ایک تصویر بنانے کا
معاوضہ لیتے ہو؟"

"خاتون ظاہر ہے آپ شوقین فن کے قدردان بھی ہوتے ہیں۔ اگر میری بنائی ہو
تصویر آپ کو پسند آجائے تو آپ کے حالات آپ کو جس قدر بھی اجازت دیں آپ
معاوضہ ادا کردیجئے گا البتہ میں پہلے سے کسی معاوضہ کا تعین نہیں کروں گا۔" میں نے کہا

"آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں مصور۔"

"نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ انسانوں کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے
اور بعض لوگوں سے کاروباری گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اس میں بعض اوقات اپنا بھی
ہوجاتا ہے۔ اگر آپ کچھ زیادہ دینا چاہیں اور میں ازراہ اخلاق آپ کو کم بتاؤں اور بعد
مجھے یہ احساس ہوجائے کہ میں آپ سے جو مانگتا آپ دے دیتیں تو پھر اس گھاٹے
بہرطور افسوس رہتا ہے۔ چنانچہ آپ تصویر دیکھ لیں اور بعد میں آپ جو کچھ عنایت فرمائیں گی مجھے قبول ہوگا۔"

"واہ تم تو انسان شناس ہو۔"

"ہاں دعویٰ تو یہی کرتا ہوں۔"

"غلط دعویٰ ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"کیوں..........؟" میں نے پوچھا۔

وہ ہنس دی۔ پھر بولی "خیر چلو معاوضے کی بات تو چھوڑو' ہاں یہ بتاؤ کب سے بناؤ گے میری تصویر؟" وہ میری بات کو صاف ٹال گئی تھی۔

"جب آپ حکم دیں۔"

"کل سے۔"

"جی بہتر' کل سے بنانا شروع کردوں گا' ہاں میں اپنے رجسٹر میں آپ کا نام درج کرلوں۔"

"جی ہاں۔"

"تب ٹھیک ہے' آپ مجھے وقت بتادیں' جس وقت آپ تشریف لائیں میں اس وقت میں آپ کو بک کرلوں۔"

"پورا دن کام کرتے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ہاں۔ بعض اوقات جب زیادہ کام ہوتا ہے۔"

"فرض کرو میں روزانہ تمہارے پاس ایک گھنٹے کے لئے آیا کروں تو کیا تمہارے کاروباری معاملے میں کوئی حرج ہوگا؟"

"بالکل نہیں' ظاہر ہے وہ گھنٹہ آپ کے لئے مخصوص ہوگا۔"

"کتنے دن میں بن جائے گی میری تصویر۔"

"بس زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگ جائے گا۔"

"گویا ایک ہفتہ' آٹھ گھنٹے' مجھے تمہارے ساتھ صرف آٹھ گھنٹے ملیں گے۔ اس کے بعد میں کیا کروں گی؟"

"جی..........جی.......... میں نہیں سمجھا.........."

"ٹھیک ہے مصور تو پھر کل کوئی وقت طے کرلو۔ ہاں کیا یہ ممکن ہے کہ میں کسی مخصوص وقت پر تمہارے پاس نہ آیا کروں۔ ہاں جب مجھے فرصت نہ ہو تو میں اوقات بدل لوں۔"

"خاتون یہ مناسب تو نہ ہوگا۔ ویسے میں آپ کو ایک پیشکش بھی کرسکتا ہوں۔" میں

نے کہا۔

"کیا..........؟"

"وہ یہ کہ اگر آپ کو خود آنے میں تکلیف ہو یا آنا آپ کے لئے غیر پسندیدہ ہو تو آپ کوئی اپنا خوبصورت سا فوٹوگراف مجھے دے دیں' میں اس سے آپ کی تصویر بنادوں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں میں خود آنا چاہتی ہوں اور آتے رہنا چاہتی ہوں۔" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"تشریف لایا کریں آپ کا اسٹوڈیو ہے۔ دراصل آپ جیسے کرم فرماؤں کی وجہ سے ہی ہماری زندگی چلتی ہے۔"

"نہایت باتیں کرنے لگے ہو' ہریش۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"جی شکیل۔" میں نے تصحیح کی۔

"ہاں شکیل' خیر تو پھر کل سے کون سا وقت دو گے؟"

"جو آپ پسند فرمائیں۔"

"تو پھر ٹھیک ہے دوپہر کو دو بجے۔"

"جی بہتر میں اس وقت فارغ ہوں۔" میں نے کہا اور اپنا رجسٹر نکال لیا اور اس کا نام پوچھا۔

"پدما..........!"

"جی..........؟"

"پدماوتی.........." اس نے کہا اور میں نے ایک گہری سانس لی۔ گویا وہ مذہباً ہندو تھی۔ بہرصورت کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ پاکستان میں اب بھی بے شمار ہندو موجود ہیں اور بڑے اچھے انداز میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ ان کا بھی وطن ہے یہ لوگ یہاں رہتے ہیں اور اس لحاظ سے زندگی کی آسائشیں حاصل کرنا ان کے لئے بھی ضروری ہے اور میرے نزدیک یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ وہ ہندو ہے۔

بہرصورت میں نے اس کا نام لکھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے اس کے باپ کا نام پوچھا۔

تو اس نے کہا۔ "جانے دیں' اس سے آپ کو کیا لینا ہے۔"

"ٹھیک ہے پدماوتی' میں نے آپ کا نام درج کرلیا ہے کل سے آپ تشریف لے آیا

کریں۔" میں نے کہا۔

"بہت اچھا گویا تمہارا مقصد ہے کہ میں جاؤں۔"

"جی نہیں بیٹھیں لیکن خالی بیٹھنا تو مجھے اچھا نہیں لگتا' اگر آپ چائے پی لیتیں تو چائے کے دوران کچھ گفتگو ہو جاتی۔"

"نہیں بس اب میں جاؤں گی۔" اس نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا پرس کھولا اور سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میرے سامنے ڈال دی۔

"دس ہزار.........." میں نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے نوٹوں کی طرف دیکھا۔ آج تک جو میری سب سے مہنگی تصویر بکی تھی وہ تین ہزار کی تھی جو تصاویر میں نے بنائی تھیں وہ پانچ سو سے لے کر دو ہزار تک کی تھیں لیکن یہ دس ہزار میرے لئے بڑے تعجب خیز تھے۔

جناب اعلیٰ میں اپنے آپ کو اس دور سے ہٹ کر کوئی فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ جو کچھ بیتا ہے جو کچھ ذہن میں ہے جو کچھ سوچتا تھا وہ سب بے کم و کاست آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

دس ہزار کی یہ گڈی میرے ہاتھوں میں آگئی۔ گو میرے پورے بدن میں لرزش تھی' میں انتہائی کوشش کر کے اس لرزش کو چھپا رہا تھا لیکن میرے دل میں مسرتوں کے سوتے ابل رہے تھے۔ تب میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ.......... رقم.........."

"ہاں اسے بطور ایڈوانس قبول کرلو اور باقی تصویر کے مکمل ہونے کے بعد۔" اس نے کہا.......... اور آپ یقین کریں میری ٹانگیں بے کار ہونے لگیں' گویا اس کے بعد بھی کچھ ملنے کی امید تھی..........

ممکن ہے یہ کسی بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہو۔ اپنی خوشی سے دے رہی تھی تو پھر مجھے قبول کرلینا چاہئے تھا اگر بعد میں واپس مانگا تو واپس بھی دیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ یہ کاروباری اصول کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے میں نے تو اس سے نہیں مانگا تھا اور صرف اپنے مقصد کی بات کی تھی اور اگر وہ مجھے اتنی بڑی رقم دینے پر تیار تھی تو میں اسے کیا کہہ سکتا تھا۔

بہرصورت میں نے نوٹوں کی گڈی جیب میں رکھ لی اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں اسے چھوڑنے باہر تک نہ آتا۔

بارش اب رک چکی تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں کبھی کبھی آسمان سے ٹپک پڑتی تھیں

لیکن میں نے دیکھا کہ باہر کوئی کار نہیں ہے۔ اس نے آہستہ سے میری جانب دیکھا اور الوداعی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں تعجب سے اس کو دیکھتا رہا تھا' بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات تھی کہ خاتون آپ کی گاڑی کہاں ہے' یا میں آپ کے لئے ٹیکسی وغیرہ کا بندوبست کردوں' یہ تو حد سے آگے بڑھنے والی بات تھی اور میں حد سے آگے بڑھنا پسند نہیں کرتا تھا اس کی نگاہوں سے جو کچھ میں نے محسوس کیا تھا وہ اب بھی میرے ذہن میں خلش بن کر چبھا ہوا تھا۔ وہ سیدھی جاتی رہی اور تھوڑی دیر بعد میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

میں جلدی سے اندر آگیا تھا۔ اس کا پیار بھرا انداز' اس کی اپنائیت آمیز گفتگو میرے ذہن میں ابھر آئی۔ بہرصورت میں نے سر کو جھٹکا اور کرسی پر گر کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

جو کچھ ہوا تھا وہ میرے لئے تعجب خیز تھا۔ لڑکی بلاشبہ پُراسرار تھی لیکن مجھے اس کی پُراسراریت سے کیا واسطہ' وہ تو مجھے دس ہزار روپے کی رقم دے گئی تھی اور یہ رقم میری زندگی بدلنے کے لئے کافی تھی۔ ٹھیک ہے میرے حالات اتنے برے نہ رہے تھے' میں مہینے میں پانچ چھ ہزار آرام سے کمالیا کرتا تھا اکثر اس سے بھی زیادہ ہوجاتا تھا' چنانچہ زندگی بہتری کی طرف گامزن تھی۔ یہ دس ہزار.......... اور اس کے بعد.........

آہا.......... میرا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اگر ایسے ہی کچھ کرم فرما اور مل جائیں تو میرا خیال ہے میں اپنی پرانی زندگی پھر حاصل کرلوں گا۔ ثریا کی قسمت جاگ اٹھے گی اور ہم دونوں بہت خوبصورت سے مکان میں زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ہاں ممکن ہوسکا تو ایک چھوٹی سی کار بھی خریدی جائے گی۔ جس میں' میں شام کو ثریا کو بٹھا کر شہر کے مختلف علاقوں کی سیر کرایا کروں گا۔ میں نے تصور میں بہت سارے خواب دیکھ ڈالے۔ اب دکان میں بیٹھنے کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ اس رقم کو ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر بار بار یہ تصور بھی آرہا تھا کہ اس کے بعد اور رقم بھی ملے گی۔ چنانچہ میں نے کاروباری اصول کو بالائے طاق رکھا اور جلدی جلدی' دکان بند کرنے لگا۔

ثریا نے اتنی بڑی رقم دیکھی تو وہ بھی خوشی سے دیوانی ہوگئی تھی۔ میں نے اسے تفصیل بتائی لیکن ذرا سی ردوبدل کرکے میں نے اس حسین سی لڑکی کا تذکرہ ضرور کیا لیکن اس کے انداز کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔

ظاہر ہے ثریا بھی عورت تھی اور میں بھی اتنا ناتجربہ کار نہیں تھا کہ اس کے ذہن

میں کسی شک وشبہ کو جنم دیتا جبکہ عورت بذات خود ہی بہت شکی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس نے مسکرا کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیں کوئی اور معاملہ تو نہیں ہے؟"

"کیا مطلب.........؟" میں چونک پڑا۔

"کیا سمجھتے ہو خود کو' میری آنکھوں سے دیکھو' اب بھی بہت سی نثار ہونے کو تیار ہوں گی۔"

"کیا میں ٹیں لگا رکھی ہے ثریا۔ بجائے اس کے کہ تم رقم کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کرو تم اس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے کسی قدر برا ماننے والے انداز میں کہا۔

"ارے ارے آپ برا کیوں مان رہے ہیں' اس میں تو آپ کی تعریف کا ہی پہلو ہے۔"

"نہیں مجھے ایسی تعریف نہیں چاہئے' میرے سامنے اگر کوئی آسمان سے حور بھی اتر آئے تو میں اسے نگاہ بھر کر نہ دیکھوں گا۔ کیا سمجھتی ہیں آپ مجھے.......... میرا اپنا بھی تو کوئی کردار ہے۔"

"میں جانتی ہوں شکیل' مذاق کر رہی تھی اس میں آپ برا مان گئے۔" ثریا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"جی نہیں.......... میں تو آپ کو آزما رہا تھا۔ اچھا ثریا ایک بات تو بتاؤ کہ اگر میری زندگی میں کوئی ایسی عورت داخل ہوجائے تو تم کیا کرو گی۔"

"کچھ نہیں کروں گی شکیل۔ میرا شکیل ہے ہی اتنا شکیل کہ ہر کوئی اسے چاہ سکتا ہے۔" ثریا نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن مجھے بامِ ثریا پر پہنچانے والی ثریا ہی ہے اور اس کے علاوہ مجھے کسی کی چاہت کی فرصت نہیں ہے۔" میں نے اسے بانہوں میں بھر کر کہا اور ثریا ہنسنے لگی۔

بہرصورت وہ دن ہمارے لئے کافی خوشی کا دن تھا۔ بلکہ ایک طرح سے تو میں یہ کہوں گا کہ ابرِ رحمت واقعی میرے لئے ابرِ رحمت بن کر آیا تھا جو اتنا اچھا گاہک مل گیا لیکن رات کو جب ثریا سوگئی تو میں نے اس لڑکی پر غور کیا۔

ثریا کی سوچ ایک حقیقت بھی رکھتی تھی۔ میں نے جو کچھ محسوس کیا تھا اس کا لبِ لباب یہی تھا کہ لڑکی کے ذہن میں کوئی خاص بات ضرور ہے۔ ممکن ہے وہ کوئی ایسی بگڑی ہوئی رئیس زادی ہو جس کے نزدیک پانچ دس' پچاس ہزار روپے خرچ کردینا کوئی بات نہ

ہو' وہ اتفاقیہ ہی بارش سے گھبرا کر میرے اسٹوڈیو میں چلی آئی ہو اور پھر مجھے دیکھ کر اسے فلمی رومان کا شوق ہو گیا ہو لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ پیدل کیوں گئی تھی' اگر وہ کسی بڑے آدمی کی بیٹی ہوتی تو کار میں آئی ہوتی' لیکن ممکن ہے کہ واقعی کوئی ایسا حادثہ پیش آیا ہو کہ وہ چند ساعت کے لئے پناہ لینے کے لئے میرے پاس آئی ہو اور اس نے سوچا ہو کہ اسٹوڈیو ہے چلو تصویر ہی بنوا ڈالیں لیکن.......... لیکن وہ میرا نام کیسے جانتی تھی.......... میرے خیالات بہت الجھے ہوئے تھے۔ اگر وہ میرا نام جانتی تھی تو پھر ظاہر ہے اس نے کہیں سے سنا ہوگا اور باقاعدہ میرے پاس آئی ہوگی لیکن اس موسم میں اور اس انداز میں' وہ الجھی الجھی سی' ہونہہ' ہوگا کچھ۔ جب میں پریشان ہو گیا تو میں نے اپنے خیالات کو جھٹکا۔

ہاں مجھے تو تصویر بنانے سے غرض تھی۔ کل دو بجے وہ آئے گی اور میرا خیال تھا کہ میں ذاتی قسم کی گفتگو اس سے جس قدر ہو سکے کم کروں گا' وہ کافی بے تکلف لڑکی معلوم ہوتی ہے اگر گلے پڑ گئی تو خواہ مخواہ کی مصیبت بن جائے گی۔ بس تصویر بناؤں گا اور خشک رویہ اختیار کروں گا اور اب تو چائے کے لئے بھی نہیں پوچھوں گا بے وقوف سے' اس وقت میں نے پوچھا تھا تو کتنی صفائی سے ٹال گئی تھی..........

نہ جانے کیسی لڑکی تھی' دیر تک میں اسی کے خیالات میں الجھا رہا اور جب نیند نے پلکیں جوڑ دیں تب وہ میرے ذہن سے نکلی۔

دوسری صبح میں ہشاش بشاش تھا۔ آدمی کے جاگنے کے بعد کچھ اچھی باتیں ذہن میں آجائیں تو دن خوشگوار گزرتا ہے۔ ثریا سے خاصی نوک جھونک چلتی رہی' بڑی پیاری بیوی تھی لیکن ابھی تک میری محبوبہ تھی۔ حالانکہ میری شادی کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ بہرصورت میں وقتِ مقررہ پر اپنے اسٹوڈیو پر چل پڑا۔

اسٹوڈیو پہنچ کر میں نے دکان کھولی' گزشتہ روز کی بارش سے سڑکوں پر کچھ گندگی ہو گئی تھی لیکن بہرصورت موسم میں خاصی خوشگوار کیفیت تھی۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی اور بھی گاہک آجاتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ حالانکہ میں یکسوئی سے کام کرنے کا عادی تھا لیکن جب اس لڑکی نے مجھے اتنی بڑی رقم دی تھی تو میں سوچ رہا تھا کہ اسے بنا کر بھی کوئی شاہکار ہی دوں۔

دن کے تقریباً ساڑھے بارہ بجے وہ شخص بھی آ گیا جس کی تصویر بنا کر رکھی تھی۔ اس نے مجھے ادائیگی کی اور اپنی تصویر دیکھ کر خوش ہو گیا کچھ معمولی سی ردوبدل بھی کرائی

تھی اس نے جسے میں نے اسی وقت ٹھیک کر دیا اور ان سارے کاموں سے میں تقریباً ایک بجے تک فارغ ہو گیا۔

اس کے بعد غفور ایک بجے کھانا لے آیا۔ میں نے کھانا کھایا اور کھانا کھانے کے بعد چند ساعت کے لئے آرام کرنے کی غرض سے کرسی میں دراز ہو گیا۔ دو تین سگریٹ پئے اور اس کے بعد گھڑی دیکھنے لگا۔

دو بجنے میں صرف دو منٹ باقی رہ گئے تھے اور ابھی میں نے گھڑی پر سے نگاہیں ہٹائی بھی نہ تھیں کہ دروازہ کھول کر وہ اندر آگئی۔ آج وہ سیاہ رنگ کی ایک خوبصورت سی ساڑھی میں ملبوس تھی۔

کل کی نسبت آج اس کے چہرے پر زیادہ خوشگواریت تھی۔ بال بھی خوبصورت انداز میں بنے ہوئے تھے۔ بہرصورت وہ تصویر کے لئے موزوں نظر آرہی تھی اور اگر میں اسے کسی مرد کی نگاہ سے دیکھتا تو بلاشبہ دل تھامنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ ذہن میں کسی دوسرے کے لئے گنجائش ہی نہ تھی چنانچہ میں نے پُرجوش انداز میں اسے خوش آمدید کہا۔

اس کے لئے کرسی کی گرد بھی صاف کی اور اسے بیٹھنے کی پیش کش بھی کی' وہ بیٹھ گئی۔

اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی' حسین مسکراہٹ' میں کہتا ہوں کوئی جواب نہیں تھا اس مسکراہٹ کا بہرصورت میں نے اسے بڑے پُرتپاک انداز میں خوش آمدید کہا تھا۔

"جی مسٹر شکیل آپ تیار ہیں؟"

"چلیں۔" میں نے جواب دیا اور اسے ساتھ لے کر اسٹوڈیو کے اس حصے میں پہنچ گیا جہاں دوسرے لوگوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر میں کام کرتا تھا تو غفور باہر ضرور موجود ہوتا تھا۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو اندر نہ آنے دے۔ کچھ کاروباری اصول تھے جن پر میں سختی سے عمل کرتا تھا اور ان کا پابند تھا۔

میں نے اسے اپنی منتخب کی ہوئی جگہ پر بٹھایا' سامنے ہی ایزل پر بہت بڑا کینوس لگا ہوا تھا میں نے اس سے تصویر کے سائز کے بارے میں پوچھا۔

"دیکھو مصور یہ تمہارا کام ہے۔ کتنی بڑی تصویر بناؤ گے۔ کیسی بناؤ گے۔ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں' بس تم مجھے کینوس پر منتقل کر دو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے بھی گردن کو خفیف سا ہلا دیا۔

"بالکل ٹھیک فرمایا آپ نے لیکن کیا یہ تصویر آپ اپنے ڈرائنگ روم میں لگائیں گی۔ اگر میں آپ کے ڈرائنگ روم کا منظر دیکھ سکتا تو آپ یقین کریں میں اس کے لئے کوئی بہت ہی موزوں جگہ تلاش کرلیتا اور پھر اس کی مناسبت سے تصویر کا سائز بھی رکھتا۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں' بس اپنی پسند سے کسی بھی سائز کی تصویر بنادو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں اسے کہیں نہ کہیں ایڈجسٹ کرلوں گی۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"بہتر!" میں نے کہا اور پھر میں نے اسے مختلف انداز میں بیٹھنے کے لئے کہا۔ بڑے بڑے آئینے اس کے نزدیک کھسکا دیئے تاکہ وہ اس پوز کو دیکھ لے جس کی وہ تصویر بنوانا چاہتی ہے لیکن لڑکی نے تمام باتوں سے غیر دلچسپی کا اظہار کیا تھا' بس یوں لگتا تھا جیسے وہ تصویر سے کوئی دلچسپی نہ رکھتی ہو۔ بلکہ صرف میری قربت کی خواہش مند ہو۔

یہ تصور میرے لئے بڑا احمقانہ تھا' بھلا مجھ جیسا آدمی اپنے آپ کو اس قدر افلاطون کیسے سمجھ سکتا تھا۔ روزی کمانے کے لئے دن رات محنت کرنا پڑتی تھی اور سوچتا کسی ایسی لڑکی کے لئے جو بہرصورت مجھے ایک تصویر کی قیمت دس ہزار سے زیادہ ادا کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ ایسی لڑکی سے عشق کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ کوئی کنواری ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے اپنی پسند کا پوز بنایا اور پھر پنسل لے کر اس کا اسکیچ بنانے لگا۔ آؤٹ لائن بناتے وقت میں نے کئی بار اس کی جانب دیکھا اس کی نگاہوں میں بڑا ہی میٹھا پن تھا' وہ بڑے میٹھے انداز میں مسکراتی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی اور یہ مسکراہٹ عجیب سا سحر رکھتی تھی۔ تب اس نے آہستہ سے پہلو بدلا اور میں نے اسے ٹوک دیا۔

"دیکھئے خاتون' ہاں کیا آپ مجھے اپنا نام نہیں بتائیں گی۔"

"بھول گئے مصور' تم تو کہتے تھے کہ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"اوہ سوری پدما دیوی۔"

"پدماوتی۔" اس نے تصحیح کی۔

"ہاں پدماوتی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے مس پدماوتی کہ آپ براہ کرم اپنے انداز میں تبدیلی نہ کریں۔"

"اس طرح تو بیٹھے بیٹھے تھک جاؤں گی میں۔"

"بس چند ساعت' میرا خیال ہے کم از کم آپ مجھے پانچ منٹ ضرور دیں اور اس کے

بعد پہلو بدل لیا کریں۔ پانچ منٹ میں کام کروں گا اور اس کے بعد دس منٹ آپ کو آرام کرنے کی اجازت ہوگی۔"

"ٹھیک........." اس نے مجھ سے تعاون کرتے ہوئے کہا اور میں اس کا ادھورا اسکیچ مکمل کرنے لگا۔

پھر وہ پانچ منٹ اس انداز میں پوز دیتی رہی جیسا کہ میں نے اسے بتایا تھا اور میرا ہاتھ تیزی سے کینوس پر چلتا رہا۔ میں اسے لکیروں میں منتقل کررہا تھا۔

کافی دیر تک میں اس کی تصویر بناتا رہا اور اس دوران میں نے صاف محسوس کیا کہ بلاشبہ اسے تصویر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس وہ مجھ سے باتیں کرنے کی خواہش مند تھی پھر ٹھیک تین بجے میں نے اس سے معذرت چاہی۔

"مس پدماوتی' مجھے افسوس ہے میں نے ابھی دوسرے گاہکوں کو بھی ٹریس کرنا ہے اور اب آپ سے کل ملاقات ہوگی۔"

"بڑے ہی کاروباری ہوگئے ہو۔" اس نے پیار بھرے انداز میں کہا اور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں اسے بھول گیا تھا جس بورڈ پر میں نے کینوس لگایا ہوا تھا اسے میں نے محفوظ کرلیا اور دوسرے کاموں میں مشغول ہوگیا۔

اس شام کو میرے ذہن میں کوئی خاص بات نہیں تھی' ثریا کے ساتھ کافی دیر تک گپ شپ ہوتی رہی۔ رات ہوئی سوگیا۔

دوسرے دن کا کام حسبِ معمول تھا۔ ٹھیک دو بجے وہ پہنچ گئی اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔

اسے آتے ہوئے پانچواں دن تھا تصویر تیزی سے مکمل ہورہی تھی میں اس کا اسکیچ تقریباً مکمل کرچکا تھا اب صرف اسے رنگ دینا تھے۔ میں نے سکیچ اسے دکھایا اور اس نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"میں نہیں جانتی کہ فنِ مصوری کیا ہے اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تم نے ان لکیروں کا کھیل کیوں اپنا لیا ہے' لیکن بہرصورت جو کچھ تم بناؤ گے وہ اچھا ہی ہوگا۔ یہ تو تمہاری فطرت ہے ہریش!" اس نے آہستہ سے کہا۔

اور میں چونک پڑا تھا۔ تب میں نے کہا۔

"مس پدما' آپ اس سے پہلے بھی ایک بار مجھے ہریش کہہ چکی ہیں۔" میں نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔

"ہاں ابھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔ پہلے میری تصویر مکمل کرلو۔"

"کیوں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" میں نے سوال کیا اور وہ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اپنی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"تین بج گئے ہیں اب مجھے چلنا چاہئے۔" اور اس کے بعد وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر واپسی کے لئے مڑ گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں پیچھے سے اسے دیکھتا رہا تھا۔ کیا یہ لڑکی کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ میں نے سوچا' ہندو ہے اور ہاں ہریش' ہریش بھی تو ہندو نام ہی ہے لیکن اس نے مجھے ہریش کہہ کر کیوں مخاطب کیا' ممکن ہے اس کا کوئی دوست رہا تھا' عزیز رشتہ دار میری شکل سے ملتا جلتا ہو۔

اوہ......... یہ وجہ ہوسکتی ہے' وہ تصویر بنوانے میں اتنی دلچسپی نہیں رکھتی بس میرے پاس آتی ہے۔ مجھ سے باتیں کرتی ہے' انوکھی باتیں جن کا کوئی سرپاؤں نہیں ہوتا' لیکن وہ ایک گھنٹہ بڑی ہنسی خوشی گزارتی ہے ہاں کبھی کبھی مغموم بھی ہوجاتی ہے۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی ایسا حادثہ ہوا ہو۔ ممکن ہے اس کا کوئی قریبی عزیز' کوئی دوست اس سے بچھڑ گیا ہے اور وہ میری شکل میں اسے دیکھنے آجاتی ہو' ممکن ہے اس کا نام ہریش ہی ہو۔

بہرصورت احتیاط شرط ہوتی ہے جناب' چنانچہ ثریا سے میں نے اس بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ میں ساری باتیں اسے بتادیا کرتا تھا لیکن اگر یہ بات اسے بتادیتا تو یقینی طور پر ثریا پریشانیوں کا شکار ہوجاتی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک بے مقصد بات پر میری پیاری بیوی پریشانیوں کا شکار ہوجائے۔

آٹھویں دن حسب وعدہ میں نے اس کی تصویر مکمل کردی میرے پاس کچھ اور نامکمل تصویریں بھی تھیں جو اس دوران میں نے مختلف لوگوں کے لئے شروع کی تھیں' کچھ اور لوگ بھی تھے جن کا میں کام کررہا تھا لیکن بہرصورت میں وقت پر کام کرنے کا عادی تھا۔

اس دن میں نے اس کی تصویر کو آخری رنگ دیا۔ اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اور اس کے لئے میں نے اسے کہہ بھی دیا اس کے باوجود وہ آتی رہتی تھی اور مجھے تصویر بناتے ہوئے دیکھتی رہتی تھی۔ کئی بار اس نے مجھ سے عجیب سے سوالات کئے

تھے۔

"تم اس تصویر کو جو رنگ دے رہے ہو کیا اس کا تمہارے ذہن سے کوئی تعلق ہے مصور.........؟" اس نے سوال کیا۔

"ظاہر ہے گہرا تعلق ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یعنی؟"

"خاتون میری خواہش ہے کہ میں اسے ایک ایسی تصویر بنا کر آپ کو پیش کروں جس کا کوئی ثانی نہ ہو' اس کے لئے میں اس میں خوبصورت سے خوبصورت رنگ بھرنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ......... تو کیا صرف اس تصور نے تمہیں اتنی حسین تصویر بنانے پر مجبور کردیا ہے؟" اس نے پوچھا

"ظاہر ہے یہ میرا فن ہے۔"

"میں سمجھی تھی کچھ اور........."

"کیا مطلب.........؟"

"میں سمجھی تھی تم ان رنگوں کو اپنے دل میں سجا رہے ہو۔"

"آپ اس بات سے انکار تو نہیں کرسکتیں۔ ظاہر ہے جس چیز سے دل نہ لگایا جائے وہ کبھی من پسند نہیں بن سکتی۔"

"ٹھیک ہے' اس دوران ایک بار بھی تمہیں میری صورت یاد نہیں آتی۔" اس بار اس نے ایک انوکھا سوال کیا۔

"کیا مطلب ہے.........؟"

"تم مجھے مستقل دیکھتے رہے ہو ہریش۔"

"پدما دیوی کیا آپ مجھے یہ بات نہیں بتائیں گی کہ آپ بار بار مجھے ہریش کہہ کر کیوں مخاطب کرتی ہیں۔"

اس بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا بس مسکرا کر رہ گئی اور پھر اس دن بھی چلی گئی۔

بہرصورت تصویر قطعی طور پر مکمل ہوچکی تھی۔ میں نے اسے بورڈ سے اتار دیا اور پیک کرکے رکھ دیا۔

دوسرے دن وہ آئی اور حسبِ معمول مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوگئی میں نے بھی

مسکرا کر اس کا استقبال کیا تھا۔ تب اس نے مسکراتے ہوئے بورڈ کی جانب دیکھا اور چونک کر بولی۔

"ارے میری تصویر کہاں گئی یہاں سے.........."

"مکمل ہوگئی۔" میں نے جواب دیا۔

"تو تم نے اسے کینوس بورڈ سے اتار دیا۔"

"ہاں۔ ظاہر ہے۔"

"کیوں؟"

"بھئی مکمل تصویر کو لگائے رکھنے سے کیا فائدہ۔"

"ہوں۔" وہ بے خیالی میں عجیب سے انداز میں بولی جسے میں محسوس کئے بغیر نہ سکا۔

"کیا آپ اسے لے نہیں جائیں گی۔"

"کہاں ہے.........؟" اس نے میرے سوال کا جواب دیئے بغیر کہا اور میں پیک شدہ تصویر اٹھا لایا۔

میں نے تصویر کھول کر اس کی نگاہوں کے سامنے کردی اور وہ تصویر دیکھنے بجائے میری صورت دیکھنے لگی۔ آج اس کے چہرے پر عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھ پھر اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

"گویا یہ تصویر مکمل ہوگئی۔"

"ہاں......... آپ دیکھیں اگر اس میں کوئی خامی یا کمی رہ گئی ہو تو مجھے بتادیں مَیں مکمل کردوں۔"

"ہاں' اس تصویر میں ایک بہت بڑی خامی ہے۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور مَیں سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"جی فرمایئے۔ میرا خیال ہے اگر آپ اس کی نشاندہی کردیں تو میں آپ کی شکایت دور کرسکتا ہوں۔"

"اس تصویر میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ تمہیں تمہارا ماضی یاد نہیں دلاسکتی۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا ماضی.........؟"

"ہاں.........!"

"کون سا ماضی؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"وہ ماضی جو تمہارے ذہن سے اوجھل ہے' وہ ماضی جو تمہارے پچھلے جنم کی یاد ہے۔"

"خاتون آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں ہریش' بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"میں نے یہ تصویر صرف اس لئے بنوائی تھی کہ تمہیں تمہارا ماضی یاد دلاؤں' تم اس کے بارے میں سوچو' یہ خدوخال تمہارے ذہن میں ابھریں اور میں تمہیں یاد آجاؤں لیکن افسوس صد افسوس تمہارا ذہن سوچکا ہے' تمہارے ذہن پر اتنی گرد پڑی ہوئی ہے کہ تم سوچکے ہو۔ جاگو' میں کہتی ہوں جاگو' مجھے اس تصویر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں صرف تمہیں جگانا چاہتی تھی کیا تم کبھی نہیں جاگو گے۔ کیا تم خود کو بیدار نہیں کرو گے۔ ہریش' سوچو میں کہتی ہوں کچھ تو سوچنے کی کوشش کرو۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔

"پدما دیوی' نہ جانے آپ کیسی باتیں کررہی ہیں۔ میں تو آپ کی ایک بات بھی نہیں سمجھ سکا۔"

"اوہ ٹھہرو۔" اس نے آہستہ آہستہ سے کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں بند کرلیں پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

"تو تمہیں کبھی کچھ یاد نہیں آئے گا۔"

"آپ مجھے کیا یاد دلانا چاہتی ہیں' یہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔" میں نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔

"ہاں!" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں تمہیں صرف یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم کبھی ہریش تھے۔"

"پدما دیوی کیا آپ آواگون کے کسی مسئلہ کو چھیڑنا چاہتی ہیں۔"

"نہیں لیکن میں تمہیں یہ یاد دلانا چاہتی ہوں کہ تم ہریش ہو۔"

"پدما دیوی' میں جانتا ہوں کہ میں ہریش نہیں شکیل ہوں' اور آپ آواگون کے مسئلہ کو چھیڑ رہی ہیں لیکن میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ آواگون آپ کا عقیدہ ہے۔ ہمارا نہیں۔ میرا مذہب دوسرا ہے آپ کا مذہب دوسرا ہے اور اس لحاظ سے آپ اگر آواگون کے سلسلے میں مجھے متاثر کرنا چاہتی ہیں تو میں آپ سے معذرت کروں گا کہ ایسی بات نہیں ہے میں بچہ نہیں ہوں۔ مضبوط عقیدوں پر میری زندگی کی اساس رکھی گئ

تھی۔ ایسی صورت میں جب میں اس قدر پختہ ہوں تو مجھے میرے عقیدے سے کہ
متزلزل کرسکتی ہیں اور پھر اگر ایک عورت کی حیثیت سے آپ مجھ پر کوئی تاثر چھو
چاہتی ہیں تو میں اس کے لئے بھی معافی کا خواستگار ہوں کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔ ؛
اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ اس صورت میں میری درخواست ہے کہ آپ ا
سلسلے کو ختم کردیں۔" وہ میری باتیں سنتی رہی اور اس کے چہرے پر مایوسیاں امنڈ
رہیں۔

"ہریش......... ہریش مجھے اتنا مایوس نہ کرو' مجھے اتنا مایوس نہ کرو ہریش کہ میں خو
کشی کرلوں' میں یہ سنسار چھوڑ دوں' ہمیشہ کے لئے اور پھر بھگوان سے پرارتھنا کروں کہ
وہ مجھے کوئی دوسرا جنم نہ دے میں اس کے بعد جنم لے کر کیا کروں گی' میں تمہاری دیوا
ہوں ہریش! میرا نام پدما ہے اور تم پدما کے ہریش ہو۔ میں تمہیں وہ ماضی یاد دلانا چاہتی
ہوں جس میں ہم تم دونوں پریم جوت جگاتے تھے ہم ایک دوسرے کے بنا سانس لینا پسند
نہیں کرتے تھے لیکن آج تم مجھ سے اتنے دور ہوچکے ہو میں تو تمہیں نہ جانے کہاں کہا
تلاش کرتی پھر رہی ہوں ہریش۔" وہ مضمحل انداز میں بولی۔

"پدما دیوی۔ میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں یہ آپ کا عقیدہ ہے میرا نہیں'؛
لوگ دوسرے انداز میں سوچتے ہیں۔ ہم صرف ایک بار پیدا ہوتے ہیں اور مرجاتے ہیں
فنا ہوجاتے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی دوسرے جنم کا تصور نہیں ہے۔ اس لئے مجھے افسوس
ہے کہ میں آپ کی باتوں سے متاثر نہیں ہوسکا۔ اور براہ کرم آپ ان خیالات کو ذہن سے
نکال دیں میں آپ کو ہمدردی کے سوا کیا دے سکتا ہوں۔"

"نہیں ہریش' تم مجھے اپنا پریم دوگے' ہریش تم میرے ساتھ چلو گے ہم دونوں
ساتھ ساتھ مرجائیں گے' اس امید میں کہ جب دوسرے جنم میں ہم اس سنسار میں آئیں
گے تو یکجا ہوجائیں گے۔ میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں ہریش تمہاری قربت چاہتی
ہوں تم......... تم میرا ساتھ دوگے ہریش دوگے نا؟"

"جی معاف کیجئے میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے مجھے اپنی بیوی بہت عزیز ہے
ویسے پدما دیوی اگر آپ کو یہ تصویر پسند نہیں ہے اور آپ اسے نہیں لے جانا چاہتیں تو نہ
لے جائیں میرا فن میرے اوپر بوجھ نہیں ہوگا میں آپ کی رقم بھی واپس کرنے کو تیار
ہوں لیکن اللہ کے واسطے اب آپ کچھ نہ کہئے گا' اس لئے کہ میں مصروف آدمی ہوں
اس چھوٹی سی دکان میں اپنی روزی کمانے کے لئے بیٹھا ہوں کہانیاں سننے کے لئے نہیں۔"

میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"ہریش' اتنے کٹھور نہ بنو........." وہ روہانسی ہوگئی تھی۔

"میں آپ سے عرض کرچکا ہوں پدما دیوی کہ میں ان باتوں کو پسند نہیں کرتا اور نہ
ہی میں اس قسم کی باتیں سننے کا عادی ہوں براہ کرم آپ کا کام مکمل ہوچکا ہے ہاں اگر آپ
چاہیں تو مجھے میری رقم کی ادائیگی کردیں اور یہ تصویر لے جائیں۔"

وہ دیر تک مجھے دیکھتی رہی اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے تھے پھر اس نے اپنا
پرس کھولا اور نوٹوں کی ایک بڑی گڈی نکال کر میرے سامنے رکھ دی کافی بڑی رقم تھی
میں حیران ہوگیا۔ دس ہزار پہلے اور اب تقریباً اس سے تگنا روپیہ' ایک لمحے کے لئے دنگ
سا رہ گیا۔

چنانچہ میں نے تصویر دوبارہ پیک کردی اور اسے اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"یہ آپ کی امانت۔"

"نہیں ہریش میں اسے نہیں لے جاؤں گی۔" وہ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولی اور میں
نے سوالیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"جی؟"

"ہاں اسے اپنے پاس رکھ لو' اسے اپنے پاس رکھو اور اسے دیکھ کر کبھی یاد آؤں تو
اپنا ماضی یاد کرلینا اور اگر میں تمہیں یاد آجاؤں تو مجھے آواز دے لینا' میں تم سے زیادہ دور
نہ ہوں گی۔" اس نے کہا اور واپس جانے کے لئے مڑ گئی۔

"دیکھئے پدما دیوی یہ میرے اوپر بوجھ بن جائے گی میں چاہتا ہوں کہ جس چیز کے پیسے
وصول کرچکا ہوں' وہ اس کے مالک کے حوالے کروں۔" اس نے گھوم کر میری طرف
دیکھا اور باہر نکل گئی میرے سوال کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

میں نے پریشانی سے شانے ہلائے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں بہرصورت
حالات جس انداز میں میرے سامنے آئے تھے وہ سمجھ میں نہ آنے والے تھے لیکن مجھے
کیا' رقم وصول ہوگئی تھی' اور اگر وہ پاگل ہے اور دیوانگی کی حرکتیں کررہی ہے تو میرا
بگڑتا بھی کیا ہے چنانچہ میں نے تصویر کو پیک کرکے احتیاط سے رکھ دیا۔

رقم میں نے جیب میں ڈال لی تھی اور اب میرے حواس قابو میں نہیں تھے اتنی
بڑی رقم تھی کہ اس سے میں بے شمار کام نکال سکتا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ رقم میرے
مستقبل کے لئے بہت بڑا سہارا تھی۔

میں نے بڑے بڑے منصوبے بنائے اور اپنے اسٹوڈیو کی نئی تعمیر شروع کردی، پر
اسٹوڈیو توسیع پارہا تھا تب میں نے کچھ اور زمین خریدلی اور اس کی تعمیر شروع کرادی
روزانہ پدما کا انتظار کرتا کہ ممکن ہے وہ اب آئے۔ اب آئے لیکن وہ نہ آئی۔ تصویر
نے احتیاط سے رکھ دی تھی ایک بار بھی میں نے اسے کھول کر نہیں دیکھا۔ جب مجھے ا
سے دلچسپی نہیں تھی تو میں بار بار اسے دیکھنے کی کوشش کیوں کرتا؟

میرا کام کچھ اور توسیع پاگیا تھا۔ اسٹوڈیو میں نے کافی بڑا کروالیا تھا اور اب اس
کچھ اور شعبے بھی قائم کرلئے تھے جن میں فوٹوگرافی بھی شامل تھی، اس طرح میرا کار
وسعت پانے لگا۔ بلاشبہ اس میں پدما کی اعانت بھی شامل تھی لیکن وہ لڑکی جو کچھ چاہتی
میں وہ نہیں کرسکتا تھا البتہ جب مجھے اس کا خیال آتا تو میں سخت حیران ہوجایا کرتا تھا۔ ا
واقعہ کے تقریباً چھ ماہ بعد ایک شام جب میں اسٹوڈیو کے کمرے میں بیٹھا تھا تو کسی نے
بجائی اور چپڑاسی نے اندر جھانکا۔

"صاحب ایک بی بی جی ملنے آئی ہیں۔" اس نے کہا۔

"بھیج دو.........." میں نے جواب دیا۔

اور چند ساعت کے بعد وہ ایک خوبصورت ساڑھی میں ملبوس اندر آگئی، ناممکن
کہ میں پدما کو نہ پہچان سکتا البتہ اتنے دن کے بعد اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی
اندر آکر کھڑی ہوگئی۔

"تشریف رکھئے۔"

"پہچانے بھی نہیں۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

"کیوں نہیں۔"

"پر تمہارے لہجے میں اتنی اجنبیت ہے۔"

"آپ کا احساس ہے پدما دیوی ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"ہوں، پورے چھ مہینے ہوگئے۔"

"ہاں آپ کی امانت میرے پاس موجود ہے۔"

"تم نے اسے پھر کبھی دیکھا؟"

"اتنی مصروفیت کہ اس کی فرصت ہی نہیں ملتی۔"

"بڑے کٹھور ہو لیکن کیا یہ میرے ساتھ انیائے نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ روزِ اول ہی میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں آپ کے جذبات کی
پذیرائی نہیں کرسکتا میرے اپنے مسائل ہیں۔"

"لیکن یہ میرا اپمان ہے میں نے تمہیں موقع دیا تھا۔" اس بار اس کا لہجہ بدلا ہوا
تھا۔

"زبردستی تو کوئی کسی کو پیار نہیں کرسکتا۔"

"تم نے میرے بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔"

"میں تو خود بھی یہ بات آپ کو بتا چکا ہوں۔"

"یہ نہ بھولو ہرلیش کہ میں اس اپمان کا بدلہ بھی لے سکتی ہوں۔"

"براہ کرم آپ مجھے پریشان نہ کریں۔"

"مان جاؤ ہرلیش مجھے غصہ نہ دلاؤ۔"

"خاتون میرا وقت بہت قیمتی ہے میں چاہتا ہوں آپ اپنی امانت لے جائیں اگر
میرے لئے اور کوئی خدمت ہو تو.........."

"ٹھیک ہے میں جارہی ہوں لیکن میں تمہیں محبت کرنے پر مجبور کروں گی میں
تمہیں سب کچھ یاد دلادوں گی اب میری آن کا سوال ہے۔"

"میں تیار ہوں۔"

"تو سنو مصور، تم ایک مصور کی حیثیت سے خاصی شہرت پاچکے ہو لیکن اب تمہاری
شہرت گمنامی کے گڑھوں میں جاپڑے گی۔ سنو تم تصویر ضرور بناؤ گے لیکن آج کے بعد
تم صرف میری تصویر بناؤ گے صرف میری۔" اس نے کہا اور باہر نکل گئی۔

میں استہزائیہ انداز میں مسکرانے لگا نہ جانے کیا سمجھتی ہے خود کو احمق کہیں کی لیکن
ذہن بھی تھوڑا سا مکدر ضرور تھا۔

اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ واقعی پریشان کن تھا۔ ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب
کی صاحبزادی اپنا اسکیچ بنوانے تشریف لائیں بہت بڑی اسامی تھی بڑی رقم کی پیشکش کرگئی
اور میں کام کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

اس کا نام عظمیٰ تھا۔ پہلے دن میں نے اس کا پنسل اسکیچ بنایا اور اس سے پوری طرح
مطمئن ہوگیا۔ دوسرے دن میں نے باقی کام شروع کردیا کوئی خاص بات نہیں تھی تیسرے
دن خاتون کا کام ختم ہوگیا اور میں نے اپنا کام شروع کردیا لیکن کوئی غیر معمولی بات نہیں

ہوئی اور پھر پانچ دن کی مسلسل محنت کے بعد میں نے اس شاہکار کو آخری ٹچ دیئے اپنے کام سے فارغ ہوگیا مکمل طور سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے تصویر کو ڈھک اور فون پر عظمٰی سے کہا اس کی تصویر تیار ہے۔

عظمٰی بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی تین سہیلیاں تھیں، عظمٰی نے ان سے میرا تعارف کرایا اور میرے لئے تین اور آرڈر بک ہوگئے نے ان کی خاطر مدارت کی تھی۔

عظمٰی نے کہا۔ "شکیل صاحب! اب براہ کرم اشتیاق نہ بڑھائیں تصویر دکھائیں۔

"تشریف لایئے۔" میں نے جواب دیا اور عظمٰی اور اس کی سہیلیوں کو لئے اندر گیا تب میں نے کینوس سے پردہ اٹھایا اور خود میں نروس ہوگیا یہ.......... یہ وہ تصویر نہیں تھی جو میں نے تیار کی تھی۔

یہ تو.......... پدما کی شکل تھی پدما جو عظمٰی کے بدن پر سوار طنزیہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔

میرا سر چکرا گیا' عظمٰی اور اس کی سہیلیاں بھی حیران تھیں۔

"آپ نے کوئی غلط تصویر دکھائی ہے.........." عظمٰی نے کہا لیکن میری زبان گنگ تھی۔

"یہ عظمٰی کی شکل تو نہیں ہے۔"

"باقی سب کچھ وہی ہے۔"

"معاف کیجئے گا شکیل صاحب یہ کیا مذاق ہے؟"

"مس عظمٰی.......... میں معافی چاہتا ہوں۔ براہ کرم آپ انتظار کریں' صرف دو دن کی مہلت چاہتا ہوں۔" میں نے پریشانی سے پسینہ خشک کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کاروباری اصول کے خلاف ہے یہ آپ نے میرے بدن پر چہرہ کسی اور کا کیوں سجا دیا ہے؟" عظمٰی نے کسی قدر ناگواری سے کہا۔

"میں آپ سے معافی چاہتا ہوں مس عظمٰی' صرف دو دن اور دے دیں۔"

"بہتر ہے اگر آپ فرمائیں تو میں حاضر ہو جاؤں ممکن ہے میرے خدوخال آپ کو یاد نہ رہیں۔" عظمٰی نے کہا۔

"یہ بہتر ہوگا کل آپ تشریف لے آئیں۔" میں نے کہا وہ چلی گئی اور میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا یہ کیا ہوا' یہ اچھا نہیں ہوا بہرحال دوسرے دو دن میں اسٹوڈیو میں ہی گزارے تھے۔ عظمٰی حسبِ وعدہ آئی میں نے صرف اس کا چہرہ اسکیچ کیا تھا اور پھر دن بھر بہت مصروف رہا تھا آخر فنشنگ کرنے کے بعد میں نے اس پر مطمئن نگاہ ڈالی دوسری تصویر بھی قریب ہی تھی پھر میں سو گیا اور عظمٰی حسبِ وعدہ پہنچ گئی میں نے خوفزدہ نگاہوں سے تصویر کو دیکھا اور پھر عظمٰی کے پاس آگیا۔

"تشریف لایئے۔" میں نے کہا اور عظمٰی اندر آگئی لیکن اندر قدم رکھتے ہی مجھے زور کا چکر آگیا چہرہ پھر بدل گیا تھا۔ عظمٰی نے مجھ سے کیا کہا میں نے کچھ نہیں سنا تھا بس میں تو بے جان سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

بہرحال اس کے بعد عظمٰی تیار نہ ہوئی اس کا ایڈوانس واپس کرنا پڑا اس کی سہیلیوں کے آرڈر بھی کینسل ہوگئے اور اس کے بعد میری بربادی کا دور شروع ہوگیا۔ کوئی تصویر بنائی اس میں پدما نمایاں ہو جاتی تھی بات صرف زنانہ تصویر کی نہیں تھی کئی مردوں کی تصویریں بنائیں ان کی بھی ایسی ہی کیفیت ہوئی کئی بار جھگڑے تک نوبت آگئی۔

مجھے پدما کے وجود سے نفرت ہوگئی اسٹوڈیو میں مکھیاں بھنکنے لگیں۔ اب کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا مجھے پدما کا انگ لگ گیا تھا۔

حالات جس انداز میں بنے تھے اسی رفتار سے بگڑنے لگے کوئی کام ہی نہیں آتا تھا کئی اشتہاری کمپنیوں کے لئے کام کیا لیکن وہی ایک چہرہ' ایک آرڈر منظور ہوگیا اس کے بعد جواب مل گیا بڑی کسمپرسی کا عالم ہوگیا تھا۔

اس دوران ایک نمائش لگی مجھے بھی دعوت دی گئی مقابلے کا معاملہ تھا دل تو نہیں چاہتا تھا لیکن بہرحال ایک تصویر بنائی اس تصویر میں میں نے اپنا انتقام سمو دیا تھا میں نے ایک کوڑھ بدن بھکارن کی تصویر بنائی جسے دیکھ کر گھن آتی تھی جس کا بدن جگہ جگہ سے عریاں تھا لیکن اس پر چہرہ پدما کا سجایا جتنی تذلیل میں اس کی کر سکتا تھا کی اور اس کے بعد اس تصویر کو نمائش میں بھیج دیا۔

پچیس ہزار روپے کا ایوارڈ اس تصویر کو ملا تھا اور اس وقت یہ رقم میری زندگی کے لئے بہت بڑا سہارا بن گئی۔ میں نے نئے سرے سے دوسرا کاروبار کرلیا اسٹوڈیو بند کر دیا گیا تھا۔ اس کاروبار نے میری حالت پھر بہتر کردی لیکن یہ اصراف بھی پدما کی تصویر سے ہی ہوا تھا لیکن مجھے پدما سے بے انتہا نفرت ہوگئی تھی وہ میرے فن کی قاتل تھی۔

اسی دوران ثریا حاملہ ہوگئی اور پھر نو ماہ بعد اس نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا اور مرگئی۔ ثریا کی موت میرے لئے ایک ایسا سانحہ تھی جو ناقابل برداشت تھا۔ میں دیوانہ

ہو گیا میرا تو کوئی نہیں تھا ساری دنیا میں صرف ثریا میری مونس تھی لیکن اب میں تنہا
گیا۔ بہت عرصہ کے بعد میں اعتدال پر آسکا۔

اس دوران میں نے اپنی بچی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی وہ ملازمہ کے ہاتھوں
پرورش پا رہی تھی۔ پہلی بار میں نے اسے دیکھا ایک بار پھر میرا دل خون ہو گیا یہ......
سخت صدمہ تھا۔

میری بچی کا نام نہ جانے کس نے عذرا رکھ دیا تھا۔ پدما کی صورت تھی ہو بہو پدما
میرے ذہن میں انگارے بھر گئے۔

"لے جاؤ اسے میرے سامنے سے میں اس سے نفرت کرتا ہوں بے پناہ نفرت پھر
اسے میرے سامنے کبھی نہ لانا۔"

ملازمہ سہم کر بچی کو اٹھالے گئی لیکن میری کیفیت اب ٹھیک نہیں تھی اب رہ رہ کر
پدما کا خیال آتا تھا کاش ایک بار صرف ایک بار میرے سامنے آجائے فنا کردوں اسے
ٹکڑے ٹکڑے کردوں کمبخت جادوگرنی کے' میں اس سے بے پناہ نفرت کرتا تھا شدید
نفرت۔ اس ذلیل عورت نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ عذرا غریب میری نفرت
کے درمیان پرورش پانے لگی۔ گھر میں کبھی کبھی وہ سامنے آہی جاتی لیکن اس وقت میرے
غضب کی انتہا نہ رہتی۔ بچی کو شروع ہی سے یہ احساس تھا کہ اس کا باپ اس سے نفرت
کرتا ہے ماں کی محبت کو تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔

حالات یونہی آگے بڑھتے رہے میں نے زندگی سے سمجھوتہ کرلیا تھا دنیا کی کسی چیز
میں میرے لئے کوئی دلکشی نہیں تھی دماغ ناکارہ ہو گیا تھا اس کے بعد میں نے کبھی کوئی
تصویر نہیں بنائی تھی۔

خوش بختی سے کاروبار چل رہا تھا جس کی وجہ سے مالی پریشانی نہیں تھی لیکن خود
میری زندگی ایک مستقل دکھ بن کر رہ گئی تھی۔ عذرا سے بھی کوئی خاص محبت نہیں تھی
بس اگر کبھی وہ سامنے آجاتی تو ساری محبت خاک میں مل جایا کرتی تھی۔ ہاں ذہن میں
محبت کا احساس ابھرتا تھا لیکن جب اس کے خدوخال دیکھتا تو ساری محبت نفرت میں تبدیل
ہو جاتی تھی وہ بنی بنائی پدما تھی۔

جوں جوں وہ بڑھتی جا رہی تھی اس کے خدوخال پدما کی شکل اختیار کرتے جا رہے
تھے اور مجھے پدما سے بے حد نفرت تھی اس خبیث روح سے جس نے میرا سب کچھ چھین
لیا مجھ سے میری ثریا چھین لی تھی۔ ثریا میری عمر بھر کی ساتھی تھی میری مونس و غم خوار

ثریا کے بارے میں جب بھی سوچتا تو پدماوتی سے میری نفرت شدید تر ہو جاتی تھی۔

لیکن جب کبھی تنہائیوں میں سوچتا تو مجھے احساس ہوتا تھا کہ بے چاری عذرا کا کیا
قصور یہ تو میرے ذہن کا قصور تھا یہ تو میری نفرت تھی جو پدما کے لئے تھی پھر یہ نفرت
عذرا کو کیوں ملے۔

لیکن میں مجبور تھا جب بھی عذرا میرے سامنے آتی تو مجھے پدما یاد آجاتی اور میری
مٹھیاں بھینچ جاتیں۔ مجھے اس سے بے پناہ نفرت کا احساس ہوتا تھا اور اب تو عذرا تین
سال کی ہو چکی تھی۔

اس کی معصوم زندگی میں محرومیاں ہی محرومیاں تھیں اس لئے وہ بہت زیادہ حساس
تھی اور اس چھوٹی سی عمر میں وہ بڑی سنجیدہ باتیں کرتی تھی۔

ایک شام کو میں لان پر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ عذرا ایک خوبصورت سی فراک میں
ملبوس دوڑتی ہوئی میرے پاس آگئی شاید اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا وہ بس یونہی ایک تتلی
کے پیچھے دوڑ رہی تھی اور اس طرح وہ اچانک میرے سامنے پہنچ گئی تھی۔

معصوم چہرے پر ایک لمحے کے لئے خوف کے تاثرات امنڈ آئے اور مجھے ایک
عجیب سا احساس ہوا۔ یہ خوف.......... یہ خوف اس کے چہرے پر کیوں' میری بچی میری
بیٹی اور باپ سے اس طرح خوفزدہ..........

ایک لمحے کے لئے میرے دل میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا لیکن پھر عذرا کے
خدوخال' اس کی نگاہیں اس کے ہونٹ اس کے چہرے پر مجھے پدما کی جھلکیاں محسوس
ہوئیں اور میں سنبھل گیا وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی تھی۔

"ابو!" اس نے آہستہ سے کہا لیکن فاصلہ کافی رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ابو ہم غلطی سے آپ کے سامنے آگئے۔" اس نے معصومیت سے کہا اور میرے
دل کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

"ابو آپ.......... آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟"

"نہیں۔"

"ابو آپ کو تتلی پکڑنی آتی ہے؟"

"نہیں۔"

"ہمیں آتی ہے۔" اس نے کہا اور ایک عجیب سا احساس اس کے چہرے سے ٹپکنے

لگا جیسے اسے شدید خواہش ہو کہ وہ مجھ سے باتیں کرے حالانکہ اس کے مواقع بہت کم نصیب ہوتے تھے لیکن بہرصورت اسے جب بھی موقع ملتا تھا وہ میرے قریب آنے کی کوشش کرتی تھی اور میری نفرت کا شکار ہو کر پیچھے ہٹ جاتی تھی۔

"ابو کیا میں آپ کے لئے تتلی پکڑوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں عذرا۔"

"کیوں؟"

"عذرا!" میں نے اسے سرزنش کی اور وہ ایک دم سے سنجیدہ ہو گئی وہ چہرہ جو کھل اٹھا تھا ایک دم سے مرجھا گیا تھا اور اس کی یہ مرجھاہٹ مجھے پسند نہ آئی' اس نے گردن جھکالی اور واپس پلٹ پڑی۔ تب میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔

"عذرا!"

"جی ابو۔" وہ جلدی سے چونک کر پلٹی چہرے پر امید و بیم کی کیفیت تھی جیسے میں اسے بلالوں گا اور شاید سینے سے لگالوں گا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن میں عجیب سے جوار بھاٹے اٹھ رہے تھے بلاشبہ وہ پدما کی شکل تھی لیکن پدما تو نہیں تھی پھر اس کے ساتھ یہ رویہ مناسب نہیں تھا ثریا کی روح کو کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ ثریا جس نے زندگی کے ہر کٹھن راستے پر میرا ساتھ دیا اور جو میری زندگی کی رازدار تھی اور میں نے اس کی ایک ننھی سی امانت کے ساتھ برا سلوک کیا تھا۔

میرے جذبات پھٹ پڑے کیسی سنگدلی کا مظاہرہ کرتا رہا ہوں میں اب تک یہ کوئی اچھی بات تو نہیں تھی۔

"ابو..........؟" عذرا میری خاموشی سے تنگ آکر بولی۔

"یہاں آؤ عذرا۔" میں نے کہا اور وہ جھجکتے ہوئے قدموں سے میرے نزدیک پہنچ گئی۔

"جی ابو۔"

"بیٹے میں تمہارا کون ہوں؟"

"ابو۔"

"میں تمہیں اچھا لگتا ہوں؟"

"بہت اچھے لگتے ہیں ابو' سب سے اچھے لگتے ہیں۔" اس نے کہا اور میں نے اسے

آغوش میں لے لیا اتنا بھینچا' اتنا پیار کیا کہ عذرا نڈھال ہو گئی اس نے اپنی ننھی ننھی سفید باہیں میری گردن میں ڈال کر خود بھی مجھے بھینچ لیا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا عذرا' میری بچی مجھے معاف کر دینا میں نے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔" میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"ابو.......... کیا بات ہے ابو؟"

"کچھ نہیں بیٹے بس کچھ نہیں تم بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہو ساری دنیا میں سب سے زیادہ اچھی میں تمہیں چاہتا ہوں۔ اور اب.......... میں ساری کسر پوری کردوں گا دیکھوں گا وہ کمبخت میرا کیا بگاڑتی ہے۔"

اور بلاشبہ اس دن کے بعد میں نے اپنی زندگی عذرا کے لئے وقف کر دی سارے ملازم حیران رہ گئے تھے۔

اور عذرا' خوشی اس کی آنکھوں سے پھوٹتی تھی' اسے جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔ ان حالات کا جمود توڑنے کے لئے میں نے سیر و سیاحت کا پروگرام بنایا تیاریاں کیں اور پھر نکل گیا۔ معصوم روح میرے ساتھ تھی اور زندگی کے انبساط سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھی۔

"ابو۔" ایک دن اس نے پوچھا۔

"ہوں۔"

"ایک بات بتائیے۔"

"جی بیٹے۔"

"پہلے آپ ہم سے بولتے ہی نہیں تھے۔"

"بس پاگل ہو گیا تھا بیٹے۔"

"اوہ۔ اب تو ٹھیک ہو گئے۔"

"ہاں بیٹے اب تو ٹھیک ہو گئے۔" میں نے جواب دیا اور اسے سینے سے لگالیا ایک انوکھا سکون تھا اس لمس میں۔

مری میں میری ملاقات ڈاکٹر کپاڈیا سے ہوئی ایک خوش اخلاق اور جلد بے تکلف ہو جانے والا نوجوان تھا جو اپنی منگیتر کے ساتھ سیر کرنے آیا ہوا تھا۔ اس کی منگیتر مریم نے عذرا سے بہت زیادہ محبت کا اظہار کیا بلکہ عذرا ہی ہم لوگوں میں تعلقات کا باعث بن گئی تھی۔

"بڑی پیاری بچی ہے مسٹر شکیل اس سے جدا ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا۔" ایک دن اس نے کہا تھا اور میں مسکرا دیا تھا۔

بہرحال بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کپاڈیا نے جرمنی میں پلاسٹک سرجری کا کورس بھی کیا ہے اور یہ سن کر میرے ذہن میں عجیب سی کلبلاہٹیں ہونے لگیں۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔

"ڈاکٹر کپاڈیا میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی فرمائیے۔"

"آپ کو یقیناً تعجب ہوگا ڈاکٹر لیکن میری زندگی سے ایک بڑا المیہ وابستہ ہے اور اتفاق سے آپ سے ملاقات ہوگئی ہے۔"

"فرمائیے مجھے آپ کے کام آکر خوشی ہوگی۔"

"بس آپ کو تفصیل نہیں بتا سکوں گا ڈاکٹر لیکن یوں سمجھیں کہ یہ میری بچی تین سال تک میری نفرت کا شکار رہی ہے۔"

"نفرت کا شکار؟"

"ہاں اپنی پیدائش سے لے کر اب تک' اور اس کی وجہ اس کے خدوخال ہیں۔"

"اوہ!" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر یہ خدوخال ایک ایسی شخصیت کے ہیں جس سے میں بے انتہا نفرت کرتا ہوں اور اس نفرت کا شکار یہ بچی رہی ہے۔ یہ صورت اب بھی میرے ذہن میں چبھتی ہے ڈاکٹر کیا آپ اس کے خدوخال بدل سکتے ہیں؟"

"ارے!" ڈاکٹر حیران رہ گیا تھا۔

"یہ بہت ضروری ہے ڈاکٹر ورنہ کبھی کسی وقت میری نفرت عود کر نہ آئے براہ کرم آپ میری مدد کریں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بڑی پیاری شکل و صورت ہے اس کی آپ یقین کریں مجھے انتہائی دکھ ہوگا اگر میں اس کے خدوخال بدل دوں۔"

"ڈاکٹر یہ آپ کے ہاتھ کی بات ہے آپ چاہیں تو اسے اس سے حسین خدوخال دے سکتے ہیں لیکن یہ اس بچی کی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہے کہ آپ اس کی شکل بدل دیں جس طرح بھی ہو جہاں تک ہو۔" میں نے ڈاکٹر کپاڈیا سے کہا اور وہ کچھ سوچنے لگا تب ڈاکٹر نے کہا۔

"ٹھیک ہے مسٹر شکیل مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے ہم واپس چلیں گے اور اس کے بعد میں اسے اپنے اسپتال میں داخل کرلوں گا اور اس ملک میں میرا پہلا کام یہی ہوگا۔" ڈاکٹر نے کہا۔

میں نے ڈاکٹر کپاڈیا کا خلوص دل سے شکریہ ادا کیا تھا۔ "لیکن ایک اور بات ہے مسٹر شکیل۔" کپاڈیا نے کہا۔

"کیا.........؟"

"بس بچی کے ذہن پر اپنے خدوخال کی تبدیلی کا کوئی اثر نہ ہوگا؟"

"ابھی اس کی عمر کم ہے ڈاکٹر کپاڈیا اس لئے اسے احساس ہی نہ ہوگا لیکن جو نقصان وہ اپنے اس خدوخال سے اٹھائے گی اس سے محفوظ ہوجائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"بہتر.........." ڈاکٹر کپاڈیا نے کہا۔

بہرصورت ڈاکٹر کپاڈیا نے مجھ سے اتفاق کرلیا تھا اور یہ بات ہمارے درمیان طے پائی تھی کہ ہم واپس چل کر یہ کام بھی انجام دے لیں گے۔ تھوڑے دنوں کے بعد میں مری سے واپس آگیا ڈاکٹر کپاڈیا اور اس کی منگیتر مریم بھی میرے ساتھ تھی۔ مریم نے بھی اس بات پر حیرانی کا اظہار کیا تھا کہ بچی بہت خوبصورت ہے' خدوخال بدلنے سے کہیں بدصورت ہی نہ ہوجائے لیکن ڈاکٹر کپاڈیا نے کہا تھا کہ میں اسے پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت بنادوں گا۔ مریم تم میرے فن کو چیلنج مت کرو۔

واپس آنے پر ڈاکٹر کپاڈیا نے عذرا کو اپنے کلینک میں داخل کرلیا' وہ اس کی پلاسٹک سرجری میں مصروف ہوگیا تھا اور مجھے عذرا کا شدید احساس تھا کیونکہ وہ بہت چھوٹی سی تھی۔

معصوم بچی کو اتنی تکلیف میری وجہ سے اٹھانا پڑ رہی تھی لیکن یہ اس کی زندگی کے لئے بہت ضروری تھا اور میرے لئے بھی بہت ضروری تھا بمشکل تمام مجھے اس کا موقع ملا تھا اب اگر اس کے خدوخال بھی تبدیل ہوجاتے تو یہ اچھا ہی تھا۔

تقریباً ایک ماہ تک عذرا ڈاکٹر کپاڈیا کے کلینک میں رہی اور ڈاکٹر کپاڈیا اس میں مصروف رہا۔ تقریباً ایک ماہ کے بعد اس کی پٹی کھلی اور بلاشبہ ڈاکٹر کپاڈیا نے جو کچھ کہا تھا وہی کر دکھایا۔ عذرا کے خدوخال بدل گئے تھے اور وہ بے حد خوبصورت نظر آنے لگی تھی۔

بلاشبہ وہ کپاڈیا کے فن کا کمال تھا اس نے عذرا کو جو حسن بخشا تھا وہ بے مثال تھا'

مریم بھی خوش ہو گئی اور میری زندگی سے بھی وہ منحوس کانٹا نکل گیا۔ وقت گذرتا رہا اور پھر ایک شام جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی عذرا آپا کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی کہ ایک ملازم نے اطلاع دی۔

"صاحب ایک بیگم صاحبہ آئی ہیں۔"

"بھیج دو۔" میں نے کہا لیکن آنے والی کو دیکھ کر میرے بدن کا خون کھول اٹھا پڑا تھی۔ کالے رنگ کی ساڑھی میں ملبوس' اجڑی اجڑی بے نور سی اس کے چہرے پر بات نہیں تھی۔

"ہریش۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"اب کیوں آئی ہے منحوس عورت۔ اب کیا چھیننا چاہتی ہے مجھ سے سب کچھ تو نے لے لیا اب کیا رہ گیا ہے میرے پاس؟"

"میرے پاس بھی تو کچھ نہیں ہے ہریش۔ کٹھنائیں بھوگی ہیں میں نے تمہارے پر یہ جنم سازگار نہیں ہے میں کسی طرح تمہیں نہیں پا سکی اب میں تھک گئی ہوں گی ہریش میں تمہارے اگلے جنم کا انتظار کروں گی۔ میری آتما بھی تھک گئی ہے ممکن ہے اگلے جنم میں تم ہریش ہی بن جاؤ۔"

"میں تیری بکواس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوں۔"

"سکھی رہو ہریش بھگوان تمہیں سکھی رکھے آج میں تم سے دور جا رہی ہوں اب تمہارے شریر پر میرا سایہ نہیں پڑے گا تم آزاد ہو۔" اس نے کہا۔ بادل زور سے گرجا اور اس کے چہرے پر خوف و ہراس پھیل گیا۔

"میں آ رہی ہوں بھگوان میں آ رہی ہوں' اچھا ہریش اگلے جنم تک کے لئے الوداع۔" اس کا بدن لرزنے لگا اور پھر میں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا اس کا بدن راکھ بن کر بکھرتا جا رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد راکھ کا ایک ڈھیر پڑا رہ گیا جسے ہوا نے آہستہ آہستہ منتشر کر دیا اور اس طرح ایک بری روح سے میرا پیچھا چھوٹ گیا۔

یہ واقعہ آج بھی مجھے یاد ہے لیکن آواگون کے مسئلے کا آج بھی میں قائل نہیں ہوں۔

☆------☆------☆

مالک مکان

اگر آپ کو کرایہ پر کسی معقول مکان کی تلاش ہے تو سب سے پہلے مالک مکان کے متعلق تسلی کر لیں۔ کہیں آپ بھی کسی جال میں نہ پھنس جائیں۔ خوفناک کہانیوں کے شوقین حضرت کے لئے تحفۂ خاص۔

گردشِ زمانہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ میں اپنے چھوٹے سے پُرسکون شہر میں ملازم
کرتا تھا چھ سال سے کمپنی کے پُراعتماد کارکنوں میں شامل تھا۔ یونین بنی' ہڑتال ہوئی ا
مالکان نے کمپنی بند کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ ہڑتالیوں کے مطالبات ماننے کے بجائے کارو
بند کردینا بہتر سمجھتے تھے اور انہوں نے یہی کیا۔ بعد میں مقدمہ چلا اور نہ جانے کیا کیا ہو
لیکن میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ میں گھر میں بیٹھ کر انتظار کروں
میرا چھوٹا سا شہر طویل عرصہ تک اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کرسکا تو مجبوراً نق
مکانی کرنی پڑی اور میں یہاں آگیا۔

چند ہی روز کی کوشش کے بعد ملازمت تو مل گئی لیکن سر چھپانے کا کوئی ٹھکانہ
مل سکا۔ ہوٹل میں قیام تھا۔ مکان کی تلاش شروع کردی کرائے کے مکانات
اشتہارات تو نظر آتے تھے لیکن کرائے میری تنخواہ سے تین گنا ہوتے تھے میں کم
چھوٹے سے مکان کی تلاش میں تھا۔

لیکن ایسا لگتا تھا جیسے میرے لئے اس عظیم الشان شہر میں ہوٹل کے علاوہ کوئی جگ
نہ ہو۔ ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی' تین سو روپے ہوٹل کا کرایہ جو ماہانہ قیام کی بنیاد
رعایت سے ملا تھا۔ معمولی پیمانے پر دو ڈھائی سو روپے کھانے کا خرچ' سگریٹ ا
آمدورفت کا کرایہ وغیرہ۔ اتنے پیسے خرچ ہوجاتے تھے کہ والدین کے لئے کچھ نہ بچتا تھا
میری خواہش تھی کہ سو پچاس تو بھیج سکوں۔

لیکن مکان! یہاں قبر کے لئے تو جگہ مل سکتی تھی لیکن زندہ رہ کر رہائش کے لئے
جگہ حاصل کرنا بہت ہی مشکل تھا' اس دوران میں نے کیا کیا کوششیں نہ کیں' یہ تو میں ہی
جانتا تھا' لیکن مجھے اپنی تمام کوششوں کا جواب ناکامی کی صورت میں ملا تھا۔

اکبر میرا اس شہر میں سب سے زیادہ بے تکلف دوست تھا' مجھ سے ہمدردی
رکھتا تھا اور میرے اچھے برے میں کام بھی آتا تھا لیکن مکان کا بندوبست اس غریب
بس کی بھی بات نہیں تھی' وہ خود بھی کسی دوسرے شہر سے ملازمت کرنے آیا تھا اور بعد

اس کے اس نے بھی کسی مکان یا کھولی کے حصول کے لئے کئی ماہ ٹھوکریں کھائیں لیکن
مکان نہ مل سکا۔ تب اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے اپنے کسی جاننے والے
ے رشتہ کے بارے میں بات کی "ضرورت رشتہ" کے اس مسئلے میں رہائش کے مسئلہ کا
حل تلاش کرلیا گیا تھا یعنی اکبر نے لڑکی والوں کے سامنے شادی کی شرط ہی یہ رکھی تھی کہ
کیسی بھی ہو قبول ہے' لیکن رہائش کا بندوبست رکھتی ہو۔ اور بالآخر اس کی کوششیں
بارآور ہوگئیں۔ اسے رہنے کو ایک کمرہ مل گیا تھا اور اس کمرے کے ساتھ ایک عدد بیوی
بھی برداشت کرنی پڑی تھی۔

بہرحال سودا بُرا نہیں تھا۔ اکبر ٹھاٹ سے رہ رہا تھا۔ معاشی مسئلہ تو حل ہو ہی چکا
تھا معاشرتی مسئلہ بھی حل ہوگیا تھا۔ ٹھاٹ سے گھر داماد بنا ہوا تھا۔

اپنی کامیاب زندگی کو دیکھتے ہوئے اس نے یہی مشورہ مجھے بھی دیا لیکن میں نے اس
کے اس مشورے کو ماننے سے صاف انکار کردیا۔ میں نے کہا۔

"نہیں بھائی اکبر میں تمہاری طرح بے فکرا نہیں ہوں میرے اپنے کچھ مسائل
ہیں۔ ماں باپ ہیں' بہن بھائی ہیں' مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنی بہنوں کی شادیاں کرنی
ہیں بھائیوں کو اعلیٰ مستقبل دینا ہے' میرے والدین میری شادی کی حسرت اپنے دل میں
رکھتے ہیں اور میں ان کی حسرتوں کو ایک رہائش گاہ پر قربان نہیں کرسکتا۔ تم اگر کچھ
سکتے ہو تو صرف اتنا کردو کہ اپنی کوششیں جاری رکھو تاکہ مجھے کہیں بھی مکان یا کھولی
جائے۔ میں خود بھی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے اکبر سے کہا تھا اور اس نے
کوشش جاری رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

خیر یہ ساری باتیں تو مذاق کی تھیں۔ درحقیقت اکبر بھی میرے لئے سخت کوششیں
رہا تھا لیکن ناکامیاں ہم دونوں کا مقدر بن چکی تھیں۔ آج بھی اس نے مجھے صبح دفتر
نے سے پہلے بتایا تھا کہ اسے ایک خالی مکان کی اطلاع ملی ہے اور وہ دوپہر کو اس مکان کو
نے جائے گا' اور شام کو مجھے اس کے بارے میں اطلاع دے گا۔ میں نے اسے تلقین کی
کہ وہ اپنی ہر ممکن کوشش مکان حاصل کرنے میں صرف کرے۔ اکبر نے کہا تھا کہ وہ
بھرپور کوشش کرے گا اور شام کو اسی ہوٹل میں مجھ سے ملے گا اور اس وقت میں
کا انتظار کر رہا تھا۔ اکبر ابھی تک نہیں آیا تھا۔

اس وقت تقریباً ساڑھے سات بجے تھے جب مجھے اکبر دکھائی دیا میں اس کا چہرہ
نے لگا لیکن اس کے چہرے سے مجھے کسی خاص بات کا اندازہ نہ ہوسکا۔ اکبر میرے

نزدیک پہنچ گیا اور میں نے ایک لمحہ توقف کے بغیر کہا۔
"اکبر بھائی آج تو خوشی کی خبر ہونی چاہئے۔" اور اکبر کے ہونٹوں پر ا
مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی اس مایوس مسکراہٹ نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اکبر
گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور میں ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹک گیا تھا
لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔
"کیا غلط اطلاع ملی تھی؟"
"کیا بتاؤں یار' اطلاع تو درست تھی لیکن دیر سے ملی' جب میں دوپہر کو مکان
کے لئے پہنچا تو مالک مکان نے کہا۔ "بھائی تم دیر سے آئے ہم نے آج صبح ہی مکان ک
پر دے دیا۔ شام تک کرائے دار آجائیں گے۔" اکبر نے ٹھنڈی سانس لے کر جوا
اور میں نے اکبر سے زیادہ ٹھنڈی سانس بھرنے کی کوشش کی اور پھر پاؤں سکیڑ کر
میز کی سطح پر رکھتے ہوئے کہا۔
"چائے منگوا یار۔" اور اکبر نے چائے والے کو......... اشارہ کیا اور ا
آجانے پر چائے کے لئے کہا۔
گرم گرم چائے ہمارے معدے جلاتی رہی اور ہم دونوں سوچ میں ڈوبے رہ
"سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے؟" بالآخر چائے کی پیالی ختم کرکے میں نے کہا۔
"مکان کا ملنا بہت مشکل ہے یار۔ صرف ایک ہی ترکیب ہے۔" اکبر نے کہا۔
"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔
"شادی کرلو۔"
"پھر تم نے فضول باتیں کیں اکبر۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔" میں۔
اور اسی وقت مجھے اپنی پشت سے آواز سنائی دی۔
"میں آپ کی کچھ مدد کرسکتا ہوں جناب۔" آواز نے کہا اور ہم دونوں نے چونک
پیچھے دیکھا۔ دراصل اس کی آواز ہی متوجہ کرنے کے لئے کافی تھی اور اسے دیکھ
عجیب سا محسوس ہونے لگا تھا۔
اس کا حلیہ بے حد عجیب و غریب تھا۔ آواز انتہا سے زیادہ کرخت اور باریک
خون کی طرح سرخ چہرے والا ایک درمیانی عمر کا آدمی تھا' لمبوترا چہرہ' پھٹی پھٹی آ
جن کی سرخی دائروں سے باہر ڈھلک رہی تھی' ٹیڑھی ناک' چوڑی بدنما' ٹھوڑی پر
شیو خود رو بدنما گھاس کی طرح اُگی ہوئی تھی۔ میلے غلیظ دانت ہونٹوں سے باہر

ہے تھے' غرض کراہت کا جس قدر تصور ذہن میں آسکتا ہے وہ اس شخص کے چہرے پر
ودار تھا اور اوپر سے اس کی آواز۔ ہم دونوں حیرت اور تعجب سے اسے دیکھنے لگے۔
"میں آپ ہی سے مخاطب ہوں۔" اس نے بدستور اپنی پھٹی ہوئی کرخت آواز میں
ہا۔
"واللہ نایاب چیز ہے۔" اکبر نے آہستہ سے کہا اور زور سے بولا۔ "اسی میز پر
ریف لے آئیے جناب۔" اور وہ کرسی کھسکا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کا انداز ہمارے لئے بے
حیران کن تھا۔ اس نے ہمارے سامنے والی کرسی گھسیٹی اور بیٹھ گیا۔
"ہوں۔ آپ کس سلسلے میں ہماری مدد کرنا چاہتے ہیں۔" اکبر نے پوچھا۔ اپنی تمام
کراہیت آمیز شخصیت کے باوجود وہ شخص حیرت انگیز صحت کا مالک تھا اور میں اس شخص
صحت پر رشک کررہا تھا۔
"آپ لوگوں کی گفتگو میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی' شاید آپ میں سے کوئی مکان
لئے پریشان ہے۔" اس نے بدستور کرخت لہجے میں کہا۔
"جی ہاں جی ہاں میں بے حد پریشان ہوں۔ مجھے کرائے کا مکان چاہئے۔" اکبر کے
ئے میں جلدی سے بول پڑا۔
"تو ٹھیک ہے اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے' انسان ہی انسان کے کام آتا
۔ شہر میں تو مکانوں کی بڑی قلت ہے اور ان کا ملنا ناممکن ہے' لیکن مضافات میں یہ کام
سکتا ہے۔"
"میں نے ہر جگہ کوشش کرلی ہے لیکن ناکام رہا ہوں اگر آپ میری یہ مشکل حل
دیں تو میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔" میں نے لجاجت سے کہا۔ اس وقت مجھے
کی کریہہ شخصیت بالکل بری نہ لگ رہی تھی' میں تو ہر حال میں مکان حاصل کرنا چاہتا

"مکان تو ہے مگر آپ کے لئے بہت دور ہے' کیا آپ شہر میں کام کرتے ہیں۔"
"ہاں۔ مگر مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ مکان خواہ کتنی ہی دور ہو۔ میں ہر قیمت پر
ن حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔
"تب ٹھیک ہے' آپ کل دس بجے مجھے اسی ہوٹل میں مل جائیں' میں آپ کو لے
ں گا۔" اس نے کہا اور میں نے جلدی سے اس کے لئے چائے کا آرڈر دے دیا۔
"کیا آج ہی یہ کام نہیں ہوسکے گا محترم۔" میں نے پوچھا۔

"آج تو مشکل ہے' دراصل اس سلسلے میں پہلے مجھے بات کرنا پڑے گی۔"

"اوہ لیکن کس سے؟" میں ایک لمحہ کے لئے چپ سا ہو گیا تھا۔ دراصل ناامید غلبہ اس قدر طاری تھا مجھ پر کہ مکان حاصل کرنا جُوئے شیر لانے کے مترادف محسوس تھا۔

"بیگم صاحبہ سے پوچھنا ضروری ہے۔ میں آج ان سے بات کرلوں گا۔ کل تک لئے رک جائیے' کیا حرج ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"نہیں نہیں حرج تو کوئی نہیں ہے' جہاں اتنا عرصہ بغیر مکان کے ہوٹل میں گ ہے وہاں ایک دن اور سہی۔ ویسے نام پوچھ سکتا ہوں محترم آپ کا؟"

"خادم کو داور کہتے ہیں۔" اس نے اپنی بے سُری آواز میں جواب دیا اور اکبر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"بہت بہت شکریہ داور بھائی کل دس بجے میں آپ کو یہیں ملوں گا' آپ کی مہربانی ہوگی' اگر آپ میرا یہ کام کرا دیں۔"

"اطمینان رکھیں' اطمینان رکھیں۔" وہ چائے پیتا ہوا بولا اور پھر چائے ختم کر کے بعد اٹھ گیا۔

"اچھا اب مجھے اجازت دیں' کل صبح دس بجے میں آپ سے یہیں ملوں گا۔' ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ ہم دونوں اسے جاتے دیکھتے رہے۔ اس باہر نکلتے ہی اکبر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"کیوں کیا ہوا اکبر؟"

"یار تم بھی بہت بھولے ہو مسعود' ارے وہ آرٹسٹ تھا' آرٹسٹ' ایسے لو تمہیں ہر ہوٹل پر مل جائیں گے' بس تمہاری دکھتی رگ ہاتھ آجائے' وہ اسی موضو تم سے بات کریں گے اور تمہاری جیب سے کھاپی کر چلتے بنیں گے مگر وہ آدمی شریف صرف چائے پر اکتفا کرکے چلا گیا' میرا تو خیال تھا کہ وہ کھانا بھی تمہارے ساتھ کھا گا۔" اکبر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دل مت توڑو بھائی اکبر' خدا کرے وہ اس قسم کا نہ ہو۔" میں نے کسی قد افسردگی سے کہا۔

"بہرحال امید پر دنیا قائم ہے۔ ویسے کیا ارادہ ہے۔ کل اس کا انتظار کرو گے؟"

"ہاں یار کل چاہے میں آفس نہ جاؤں اس کا انتظار ضرور کروں گا۔ ہو سکتا ہے آ

غلط نہ ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تو کل صبح میں بھی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا اور اگر وہ مکان دکھانے لے گیا تو میں بھی چلوں گا۔"

"نہیں اکبر' تم آج دوپہر بھی میری وجہ سے چھٹی کر چکے ہو' اس طرح روز روز چھٹی کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کل میں ہی اس کے ساتھ چلا جاؤں گا اور اگر مکان مل گیا تو پھر شام میں' میں تمہیں وہاں لے چلوں گا۔" میں نے کہا اور اکبر نے گردن ہلادی۔

"جیسی تمہاری مرضی مسعود بھائی۔" اکبر نے کہا اور تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی اٹھ گیا۔ "اب میں چلتا ہوں مسعود بھائی' انشاء اللہ کل شام کو تم سے ملنے آؤں گا۔ اللہ کرے یہ مکان تمہیں مل جائے' حالانکہ امید کچھ کم ہی ہے۔"

اکبر چلا گیا اور میں سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس شخص کی شخصیت واقعی عجیب وغریب تھی لیکن بہرحال مجھے اس سے زیادہ دلچسپی کس بات سے ہو سکتی تھی کہ وہ میرے لئے مکان کا وعدہ کر کے گیا تھا۔

دوسرے دن حسبِ وعدہ دس بجے میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وقت گزاری کے لئے میں نے مشروب منگایا اور بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ ہوٹل کے دروازے سے اندر داخل ہوا اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔ جو شخص وعدے کا پابند ہو وہ کھوٹا نہیں ہو سکتا۔

میں نے نہایت گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا اور وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

"باہر بے حد گرمی ہے۔" اس نے کہا اور میں نے جلدی سے اس کے لئے مشروب منگالیا۔ میری بے چینی عروج پر تھی لیکن اخلاقاً خاموش تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی بات شروع کرے۔"

چند منٹ تک وہ گہری گہری سانسیں لیتا رہا پھر اس نے مشروب کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔

"میں نے بیگم صاحبہ سے بات کرلی ہے۔"

"اوہ۔" میں اچھل پڑا۔ "کیا جواب دیا انہوں نے۔"

"بیگم صاحبہ بے حد نیک فطرت خاتون ہیں' بہت ہی زیادہ ہمدرد اور دوسروں کے کام آنے والی۔ میں نے آپ کی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ تیار ہو گئیں کہ آپ کو اپنے مکان کا ایک حصہ کرائے پر دے دیں۔ دراصل ان کا مکان بھی بہت بڑا ہے۔ یہ مکان بیگم

صاحب کو ورثے میں ملا تھا' یہاں مکانوں کی جس قدر قلت ہے آپ تو جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیگم صاحب پرانے زمانے کی خاتون ہیں' بے حد تنہائی پسند شہر کی گہما گہمی سے تو بے حد گھبراتی ہیں بے حد پردہ نشین خاتون ہیں' مرد تو کیا عورتوں کے سامنے آنے سے بھی کتراتی ہیں' لیکن انسانی ہمدردی کے ناطے سے وہ آپ کی مدد کرنے پر آمادہ ہوگئی ہیں' انہوں نے یہ بھی کہا کہ بس آپ سے صرف یہ کہہ دیا جائے کہ آپ ان کی تنہائی میں مخل نہ ہوں۔"

"میں تمہارا بے حد شکرگزار ہوں دوست' مجھے کیا کرایہ دینا ہوگا۔" میں نے پوچھا۔

"پہلے آپ مکان دیکھ لیں' پسند آجائے تو ٹھیک ہے ممکن ہے آپ شہر سے دور اس مکان کو پسند نہ کریں۔"

"مجھے صرف مکان چاہئے' چاہے وہ چوتھے آسمان پر ہی کیوں نہ ہو' تم اس کی فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔

"تب کرایہ جو دل چاہے دے دینا' بیگم صاحبہ کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے روپے پیسے کی کمی نہیں اور نہ ہی مکان کرائے پر دینے سے کرایہ مقصود ہے۔" اس نے مشروب کا سپ لیتے ہوئے کہا اور میں نے جلدی سے بیرے کو بلا کر بل ادا کردیا۔

"چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"چلیں۔" اس نے کہا اور اٹھ گیا۔ اس وقت اس کی بھیانک شخصیت سے قطع نظر وہ مجھے دنیا کا مخلص ترین انسان نظر آرہا تھا۔ اس کی شخصیت کچھ بھی تھی' لیکن بحیثیت انسان وہ بہت بلند تھا۔ میں اس کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ باہر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا پھر اس نے سائیڈ کا دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے ساتھ اندر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی تھی۔

گاڑی دیکھ کر مجھے تعجب ضرور ہوا تھا اور اس تعجب کو اس نے تھوڑی ہی دیر میں یہ کہہ کر ختم کردیا کہ بیگم صاحبہ نے اسے شہر آنے اور جانے کے لئے بہت سی مراعات دے رکھی ہیں جس میں یہ گاڑی بھی شامل ہے۔ دراصل مکان کافی دور اور ویران علاقے میں ہے لیکن مجھے روزانہ شہر آنا ہوتا ہے بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں آپ بھی اگر چاہیں تو صبح کو میرے ساتھ دفتر کو آجایا کریں اور شام کو واپسی آپ کا اپنا کام ہے۔ ہمارے مکان سے ایک میل دور ایک بستی ہے وہاں سے گاڑیاں آتی ہیں' وہاں تک آپ کو پیدل

آنا پڑے گا۔ باقی فاصلہ آپ بس سے طے کرلیں۔"

"کوئی بات نہیں' میرے لئے تو یہی بہت بڑا سہارا ہے کہ صبح کو تمہارے ساتھ دفتر آجایا کروں گا' اس کے بعد تو کوئی بات ہی نہیں رہی۔" میں نے کہا اور وہ خاموشی سے کار ڈرائیو کرتا رہا۔ شہر کی بے شمار سڑکوں سے مڑتا ہوا وہ مضافات جانے والی ایک سڑک پر مڑ گیا۔ میں اس فاصلے کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہا تھا لیکن میری پریشانی کے سامنے یہ فاصلہ کچھ نہیں تھا۔ پھر کافی دور نکلنے کے بعد وہ ایک طرف مڑ گیا۔ یہ سڑک کا اختتام تھا اور یہاں سے ایک کچی پگڈنڈی نہ جانے کس طرف جاتی تھی' سڑک کے دوسری سمت وہ بستی نظر آرہی تھی جس کے بارے میں اس نے بتایا تھا' پھر مجھے وہ عمارت نظر آگئی جو درحقیقت ویران اور پُراسرار تھی۔

پرانے طرز کی اس ویران عمارت کو دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لی' اس جگہ کو تو جنوں اور بھوتوں کا مسکن ہونا چاہئے تھا لیکن کیا کیا جاتا' اس مشینی شہر میں ایسی عمارتوں میں بھی انسان رہتے ہیں' میں کوئی فرد واحد تو نہیں تھا اور مکان تو بہرحال میری بہت بڑی ضرورت تھی' جو کچھ بھی تھا گزارہ تو کرنا ہی تھا اور پھر سہولت یہ تھی کہ صبح کی پریشانی نہیں تھی۔ داور نے کہا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ ہی شہر لے جایا کرے گا۔

ہم عمارت کے کمپاؤنڈ میں پہنچ گئے اور داور نے گاڑی روک دی۔

پوری عمارت بھائیں بھائیں کررہی تھی۔ بیرونی حصہ' بے ترتیب گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ سوکھے درخت اگے ہوئے تھے۔ ہر سُو ہُو کا عالم تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ برسوں سے اس گھر کی دیکھ بھال نہ کی گئی ہو میں ان تمام چیزوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور پھر داور کے ساتھ مکان کے اندرونی حصے میں داخل ہوگیا۔

لیکن اندر داخل ہوکر مجھے سخت تعجب ہوا' اندر کا ماحول باہر کے ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں کا باہر سے کوئی بھی موازنہ نہیں تھا۔ جس راہداری سے ہم گزر رہے تھے اس میں نہایت قیمتی قالین بچھا ہوا تھا' راہداری کے ساتھ ساتھ خوبصورت گملے رکھے ہوئے تھے جن میں خوبصورت پھول کھلے ہوئے تھے اور اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ دیواروں پر نہایت اعلیٰ پینٹنگز نظر آرہی تھیں۔ راہداری سے گزر کر ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہوگئے۔

ہال میں چاروں طرف دروازے تھے اور اس کے سامنے کے حصے میں ایک اور راہداری چلی گئی تھی۔ بہرصورت باہر سے یہ مکان بھوتوں کا مسکن ضرور نظر آتا تھا لیکن

اندر سے یہ ایک انتہائی خوبصورت اور حسین مکان تھا۔

"اس ہال میں چھ کمرے ہیں نہایت وسیع اور کشادہ ان میں سے جتنے چاہیں ا
استعمال میں رکھ سکتے ہیں۔ یہ سب دروازے آپ کے لئے ہیں۔ سوائے راہداری کے
دروازے کے۔ یہ دروازہ عمارت کی اندرونی سمت جاتا ہے اور وہاں بیگم صاحبہ رہتی
اور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بیگم صاحبہ پردے کی سخت پابند ہیں۔ اس طرف جانے
کسی کو اجازت نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے داور' میں تمہاری ہدایات کا خیال رکھوں گا۔ انشاء اللہ میری طرف
تم کسی پریشانی کا شکار نہیں ہوگے۔" میں نے کہا اور ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولا انتہائی نفیس کمرہ تھا۔ میری آنکھیں تعجب سے پھٹی
پھٹی رہ گئیں۔ پشت پر ایک بڑی کھڑکی تھی جو بائیں سمت کے لان پر کھلتی تھی۔ میرے
لئے ایک ہی کمرہ کافی تھا لیکن یہاں تو پورا مکان موجود تھا اور وہ بھی نہایت عالیشان۔ کا
شہر میں مجھے اس سے گھٹیا درجے کا ہی کوئی مکان مل جاتا۔ اس مکان کی ویرانی دیکھ کر مجھے
سخت وحشت ہو رہی تھی لیکن مجبوری' نہ ہونے سے کچھ ہونا بہت بہتر تھا۔ چنانچہ یہ
غنیمت تھا۔ اس کے علاوہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کمپنی سے کچھ قرض لے کر ایک مو
سائیکل خرید لوں گا۔ تاکہ آنے جانے کا محتاج بھی نہ رہوں۔ بہر حال میں نے داور
شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو کمرہ وہ چاہے مجھے دیدے۔

"میں نے کہا نا یہ سارے کمرے آپ کے لئے ہیں جہاں دل چاہے رہیں' بس
باتیں میں نے بیگم صاحبہ کے بارے میں آپ کو بتائی ہیں ان پر عمل کیجئے گا۔"

"خلوص دل سے۔" میں نے داور سے کہا اور داور نے ایک کمرہ میرے لئے
مخصوص کر دیا۔

"سامان کب لائیں گے؟"

"آج ہی اگر اجازت ہو تو۔" میں نے کہا۔

"ارے اجازت کی کیا بات ہے چلو سامان لے آتے ہیں۔" داور نے کہا۔

"تمہیں تکلیف ہوگی داور۔"

"ارے نہیں تکلیف کیسی صاحب۔ تکلف مت کریں ہم تو دوستوں کے دوست
ہیں۔" داور نے کہا اور میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ ہوٹل پہنچا وہاں کے واجبات ادا
کئے۔ اپنا سامان لیا اور اس سامان کو لے کر اس پُراسرار عمارت میں منتقل ہو گیا۔

کمرے میں سامان سجاتے ہوئے مجھ پر ایک اور انکشاف ہوا' مکان میں بجلی نہیں
تھی' البتہ شمعدان بہت سے رکھے ہوئے تھے اور انہی سے کام چلانا تھا۔

داور تھوڑی دیر میری مدد کرتا رہا اس کے بعد اندر چلا گیا۔ داور کے جانے کے بعد
میں آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ کھانے پینے کا سامان اکٹھا ہی
لے آیا کروں گا خود ہی پکایا کروں گا اور کھایا کروں گا۔ ظاہر ہے یہاں میرے لئے تکلیف
کرنے والا کون تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ابھی تک کرائے کا مسئلہ حل نہیں
ہوا تھا۔ وہ بھی حل ہو جاتا تو بہتر تھا۔

شام کے سات بج گئے۔ اب مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہوٹل سے
آتے وقت میں کچھ کھانے کے لئے لانا بھول گیا تھا۔ اور یہاں اس عمارت کے مکین نہ
جانے کہاں تھے۔ کچھ پتہ نہیں چل پا رہا تھا۔ بھوک سے آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی تھیں
لیکن کھانے کے لئے میرے پاس کچھ نہ تھا اور اب کھانا مجھے صبح ہی دستیاب ہو سکتا تھا۔
آج رات بھوکے رہ کر ہی گزارہ کرنا پڑے گا خیر کوئی بات نہیں' کل یہ سارا بندوبست
کرلوں گا۔ میں نے سوچا۔ تاریکی پھیل گئی تھی' میں نے شمعدان روشن کر دیئے اور
شمعوں کی روشنی میں کمرے کا ماحول پُراسرار ہو گیا تھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا' نہ جانے داور کہاں تھا' کیا کر رہا تھا
لیکن وہ کہیں بھی تھا' مجھے ان لوگوں کو پریشان کرنے یا ان کے بارے میں کریدنے کا کوئی
حق نہیں تھا میں کوئی مہمان نہیں تھا صرف کرایہ دار تھا۔

اس وقت رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے جب داور نے میرے کمرے کے
دروازے پر دستک دی۔

"سو گئے کیا؟"

"نہیں' آؤ داور۔" میں نے جلدی سے کہا اور داور میرے کمرے میں داخل ہو گیا
لیکن اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ میں نے اسے دیکھا۔

ایک نوجوان سی لڑکی تھی۔ جو نہایت سلیقے کا لباس پہنے تھی۔ اس کے ہاتھوں میں
ایک ٹرے تھی۔ لڑکی نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ داور بولا۔

"یہ چھیمو ہے بیگم صاحبہ کی ملازمہ' لیکن گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتی ہے۔
بیگم صاحبہ نے اسے ہدایت کر دی ہے کہ یہ صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا تمہیں دے دیا
کرے اور کوئی اور ضرورت ہو تو آپ اسے آواز دے سکتے ہیں۔"

"ارے مگر یہ کیا۔ میرا مطلب ہے کہ اس تکلف کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کھانا........"

"میں بتا چکا ہوں بیگم صاحب بہت رحمدل خاتون ہیں بس ان کے معاملات میں مداخلت نہ کی جائے تو وہ بہت اچھی ہیں' وہ کسی قیمت پر یہ برداشت نہیں کرسکتیں کہ ان کے گھر میں کوئی شخص بھوکا رہے۔"

"میں نے متشکرانہ نگاہوں سے داور کو دیکھا' چھیمو کھانے کی ٹرے رکھ کر واپس جاچکی تھی' بھوک تو مجھے بھی بہت زور کی لگ رہی تھی۔ میں نے داور سے کہا۔

"آؤ داور کھانا کھالو۔"

"نہیں آپ کھائیے' میں کھانا کھا چکا ہوں۔" داور نے جواب دیا اور میں کھانے پر ڈٹ گیا۔ بہترین کھانا تھا۔ میں نے مزے لے لے کر کھایا۔

دوسرے دن جب آفس پہنچا تو اکبر میرا بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔

"خیریت مسعود بھائی۔" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں خیریت ہے' تم یہاں کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بس جناب کے بارے میں معلوم کرنا تھا' سوچا آفس میں ہی ملنا پڑے گا۔ سو یہاں آگیا' رات کو ہوٹل پہنچا تو پتہ چلا کہ سامان سمیت جاچکے ہیں۔ یعنی اتنی جلدی ہاتھ مار دیا جناب نے۔ بہرحال مبارک ہو' مکان کیسا ہے۔" اکبر نے چھوٹتے ہی کہا۔

"مکان تو بے حد شاندار ہے دوست لیکن........"

"لیکن کیا؟"

"بس عجیب پُراسرار سی جگہ ہے' کچھ سمجھ میں نہیں آتا حیرت انگیز لوگ ہیں۔"

"کیا مطلب۔ عمارت کے مکینوں سے ملاقات کی ہے تم نے۔"

"نہیں ابھی تک تو کسی سے ملاقات نہیں ہوئی سوائے اس داور کے۔"

"بیگم صاحبہ سے کرائے کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی؟" اکبر نے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تم سے کہہ رہا ہوں نا کہ ابھی تک کسی سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"اوہ تو ہے کہاں وہ مکان۔" اکبر نے پوچھا اور میں اسے اس مکان کا جائے وقوع بتانے لگا۔

"انا للہ وانا الیہ راجعون۔" اکبر نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"کیوں بھئی۔"

ظاہر ہے بھائی' اب صرف تم سے دفتر میں ملاقات ہوا کرے گی' وہاں جانے کی ہمت کس میں ہوگی۔ بہرحال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔ کرایہ تو طے نہیں ہوا ہوگا۔"

"نہیں یار' کچھ بھی طے نہیں ہوا۔"

"تو تم اس سلسلے میں داور سے بات کرتے۔"

"کیا بات کرتا' جب بھی کوئی بات کرتا ہوں وہ ٹال جاتا ہے۔ اور تو اور اس نے رات کو کھانا بھی لاکر دیا اور صبح کو ناشتہ بھی۔ بقول اس کے بیگم صاحبہ بے حد رحمدل خاتون ہیں۔"

"بس تو مزے کرو پیارے' ویسے ان بیگم صاحبہ کی عمر کیا ہے۔ اس بارے میں معلوم کیا کچھ۔"

"نہیں یار۔ بقول داور کے بیگم صاحب بے حد پردہ نشین خاتون ہیں' وہ کسی کے سامنے نہیں آتیں۔ پھر عمر کے بارے میں کیسے معلوم ہوسکتا ہے یوں بھی مجھے ان کی عمر سے کیا غرض۔" میں نے کہا اور اکبر ہنسنے لگا۔

"بہت سیدھے ہو مسعود بھائی' یہ عنایتیں خالی ازعلت نہیں ہوسکتیں' ٹھیک ہے عیش کرو عیش کاش مجھے شادی کرنے سے پہلے کوئی ایسی بیگم صاحبہ مل جاتیں۔" اکبر نے کہا اور میں بھی ہنسنے لگا۔

"بہرحال اکبر مجھے کوئی اچھا گھر مل گیا تو میں اس ویران جگہ کو بہت جلد چھوڑ دوں گا۔"

"بیگم صاحبہ کو پہلے ضرور دیکھ لینا۔" اکبر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ ممکن ہے بیگم صاحبہ کو دیکھنے کے بعد نہ صرف مکان بلکہ ملازمت کی ضرورت بھی نہ رہے۔" اکبر نے ہنستے ہوئے کہا اور بات مذاق میں ٹل گئی۔

شام کو اس بستی تک جانے کے لئے آسانی سے ٹیکسی مل گئی اور پھر وہاں سے میں پیدل چل پڑا۔ گھر پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شام کو ساڑھے آٹھ بجے چھیمو میرا کھانا لے کر آگئی۔ آج داور اس کے ساتھ نہیں تھا۔

میں نے نیچی نگاہوں سے اس لڑکی کا جائزہ لیا' بہت خاموش سی لڑکی تھی اور نہ جانے کیوں سہمی سہمی سی نظر آرہی تھی لیکن میری ہمت نہ ہوئی کہ اس سے کوئی بات

کرتا۔ ممکن تھا لڑکی بیگم صاحبہ کو میرے بارے میں کچھ غلط باتیں کہہ دیتی' یا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ یہ بات گھر والے پسند نہ کرتے جبکہ یہ گھر میرے لیے ایک نعمت تھا۔

روز و شب گزرتے رہے' مہینہ پورا ہو گیا۔ مہینہ ختم ہونے پر میں نے داور سے پوچھا۔

"کیا پیش کروں بھائی۔"

"ارے نہیں صاحب' بیگم صاحبہ سنیں گی تو انہیں افسوس ہو گا کہ آپ اتنے دن یہاں رہنے کے باوجود غیریت برت رہے ہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو پیش کرنا ہی ہو گا۔"

"نہیں نہیں۔ میری بیگم صاحبہ سے بات ہو چکی ہے' ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ انہیں پیسے کی طمع نہیں ہے۔ عیش سے رہ رہے ہو' رہتے رہو اور پھر بیگم صاحب کو آپ کی شرافت پسند آئی ہے۔ وہ کبھی بھی آپ سے کرایہ لینا گوارہ نہیں کریں گی۔" داور نے کہا اور میں خاموش ہو گیا لیکن دلی طور پر میں ان لوگوں کا بے حد ممنون ہو گیا تھا۔ داور نے میری ایک نہ چلنے دی لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان لوگوں کے احسانات کا بدلہ کیسے ادا کروں۔"

ویسے درحقیقت اب میں اس زندگی کا عادی ہو گیا تھا اب اس ویرانی سے مجھے کوئی وحشت نہ ہوتی تھی' یہ ماحول میری عادت بن گیا تھا۔ اب یہاں سے آنے جانے میں بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ داور مجھے صبح شہر چھوڑ دیتا تھا اور شام کو میں کسی ٹیکسی یا رکشے یا پھر بس سے اس بستی تک آ جاتا اور بقیہ ایک میل کا راستہ پیدل طے کر لیا کرتا تھا۔ اس ماہ میری پوری تنخواہ بچ گئی تھی خرچہ صرف کنوینس کا ہوتا تھا' باقی میرے تمام دیگر اخراجات بیگم صاحبہ پورے کر رہی تھیں۔ یعنی گھر کے کرائے اور کھانے پینے کی سہولت حاصل ہو جانے سے میرے تمام اخراجات تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ اس پورے مہینے میں' میں نے ایک بار بھی بیگم صاحبہ کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ان کی آواز سنی تھی اور اب میں اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا تھا' ورنہ ابتدا میں مجھے خاصا تجسس رہا تھا۔

دن گزرتے رہے' میں گھر والوں کو باقاعدگی سے رقم بھیجتا رہا۔ اس دن شام کو میں سات بجے کے قریب گھر پہنچا تھا۔ جب داور میرے لئے خود کھانا لے کر آیا۔ اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

"کیوں داور چھیمو کہاں گئی؟" میں نے پوچھا۔

"چلی گئی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"بس صاحب' اس گھر میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے یہاں کوئی ملازمہ ٹکتی ہی نہیں' دو تین ماہ رہتی ہیں پھر بھاگ جاتی ہیں' میں نے کئی بار بیگم صاحبہ سے کہا کہ کسی بوڑھی ملازمہ کو رکھ لیں' نوجوان لڑکیوں کا اس ماحول میں گزارہ بے حد مشکل ہے انہیں تو چہل پہل کی زندگی چاہئے۔ اب یہ چھیمو کو ہی دیکھ لو پانچ سو روپے ماہوار دیئے جاتے تھے اوپر سے کھانا پینا اور کپڑا الگ لیکن کمبخت کا دل ہی نہ لگا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے داور' عام لڑکیوں کا اس ماحول میں گزارہ مشکل ہے۔ اب کیا کرو گے؟"

"اجی کرنا کیا ہے' نئی ملازمہ رکھیں گے اور اس کے لئے بھی بیس بائیس دن تو لگ ہی جائیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" میں نے کہا۔

"مسعود بابو آپ کے جاننے والوں میں کوئی نہیں ہے؟" داور نے اچانک ہی پوچھا۔

"نہیں داور' میرا اول تو یہاں کوئی ہے ہی نہیں ایک اکبر صاحب ہیں لیکن وہ بے چارے بھی کسی دور دراز کے شہر سے نوکری کرنے آئے تھے' شادی کر لی یہاں پر تو کچھ جان پہچان ہو گئی۔ ورنہ وہ بھی میری طرح یہاں تنہا ہی ہیں۔"

"اچھا تو پھر آپ ایک کام کریں۔" داور نے کہا اور میں اس کی شکل دیکھنے لگا۔

"آپ ایسا کریں کہ اخبار میں ایک ملازمہ کے لئے اشتہار دے دیں اور خود ہی کسی کو منتخب بھی کر لیں۔ ورنہ جب تک ملازمہ نہیں آئے گی مجھے ہی کھانا تیار کرنا پڑے گا اور میں کھانا پکانے میں اتنا ماہر نہیں ہوں۔ اب آپ کھانا کھا کر دیکھیں' کھایا جاتا ہے یا نہیں۔" داور نے کہا اور کھانے کی پلیٹ میرے سامنے سرکا دی۔

"میری وجہ سے تمہیں اور تکلیف اٹھانا پڑتی ہے داور میں بیگم صاحبہ اور تمہارا بے حد شکر گزار ہوں' تم لوگوں نے مجھے اپنوں کی سی محبت دی ہے۔"

"ارے چھوڑیں ان باتوں کو ہم سب ایک ہی خاندان کے افراد ہیں پھر یہ تکلفانہ گفتگو کیسی' کھانا کھاؤ کھانا۔" داور نے کہا اور میں کھانا کھانے لگا اور اس وقت تک کھاتا رہا جب تک کھانے کی گنجائش رہی' بلاشبہ میں نے پوری زندگی میں اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا۔

"کیا خیال ہے؟" داور نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بس داور میں اس کھانے کی تعریف الفاظ میں نہیں کرسکتا' تم تو یار کسرِ نفسی سے کام لے رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ تم واقعی کھانا پکانا نہیں جانتے ہوگے' لیکن یار تم نے تو عورتوں کو مات کردیا ہے۔" میں نے کہا اور داور ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔

"لیکن صاحب نئی ملازمہ کا بندوبست بے حد ضروری ہے ورنہ مجھے پھنسا رہنا پڑے گا۔"

"اور تم ایسا ہی کھانا کھلاتے رہو گے۔"

"ہاں۔ وہ تو میں کھلاؤں گا ہی' کیونکہ بیگم صاحبہ بھی میرے ہاتھ کا کھانا بے حد پسند کرتی ہیں۔"

"تب تو پھر میں دعا کرتا ہوں کہ نئی ملازمہ کبھی نہ آئے۔" میں نے کہا۔

"ارے نہیں 'نئی ملازمہ بے حد ضروری ہے' ویسے میرا وعدہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد آپ کو اپنے ہاتھ سے پکایا ہوا کھانا کھلاتا رہوں گا۔" داور نے کہا اور میں ہنسنے لگا۔

دوسرے دن' میں نے اخبار میں اشتہار دے دیا۔ انٹرویو کے لئے بھی میں نے اپنے دفتر کا پتہ دے دیا تھا۔ اشتہار میں ایسی آسانیاں رکھی گئی تھیں کہ بہت سی لڑکیاں انٹرویو کے لئے آگئیں لیکن بیشتر لڑکیاں ایک شرط سے گھبرا گئیں یعنی انہیں شہر سے دور ایک مکان میں رہنا ہوگا' البتہ ایک تیار ہوگئی تھی۔

"آپ کا نام؟" میں نے پوچھا۔

"سوزی۔" لڑکی نے جواب دیا۔ نام سے اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑکی مسلمان نہیں ہے۔ بڑی شوخ اور شریر لڑکی تھی۔ اس کے انگ انگ سے زندگی جھلک رہی تھی۔

"والدین کہاں ہیں آپ کے؟" میں نے دوسرا سوال کیا اور لڑکی کے چہرے پر اداسی چھاگئی۔

"جناب میرے والدین مرچکے ہیں۔" اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا اور میں بھی ایک لمحہ کے لئے اداس ہوگیا۔

"اوہ مس سوزی مجھے سن کر افسوس ہوا ہے' کوئی اور بہن بھائی وغیرہ۔" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں' دو بہن بھائی ہیں' دونوں بورڈنگ میں زیر تعلیم ہیں' ہفتہ میں ایک دن

گھر آتے ہیں ورنہ میں گھر میں تنہا ہوتی ہوں۔"

"مس سوزی آپ کو یہاں سے کافی دور ایک بستی میں رہنا ہوگا کیا آپ اس کے لئے تیار ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں تیار ہوں' دراصل تنہائی میرے لئے عذاب کی صورت اختیار کرگئی ہے اور میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ دراصل اعلیٰ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے مجھے اچھی ملازمت نہیں مل پاتی اور میں فی الوقت اسی ملازمت کو قبول کررہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر آج شام آپ اسی جگہ مجھ سے مل لیں میں آپ کو اپنے ساتھ لے چلوں گا۔"

اسی شام سوزی میرے ساتھ اس عمارت میں چلی آئی۔ وہ اس عمارت کو دیکھ کر کافی خوفزدہ نظر آرہی تھی لیکن پھر میں نے اندر داخل ہوکر تسلی دی اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں تفصیلات بتائیں تو اسے قدرے اطمینان ہوا۔

سوزی کو میرے نزدیک ہی رہنے کی اجازت مل گئی میرے کمرے کو چھوڑ کر دوسرے کمرے میں اس نے رہائش اختیار کرلی تھی۔

اس کے آجانے سے زندگی میں کچھ دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ اکثر داور میں اور سوزی باتیں کیا کرتے تھے۔ چند دنوں میں سوزی بھی اس ماحول کی عادی ہوگئی۔ بیگم صاحبہ کی طرف سے اسے بہت سی مراعات حاصل تھیں اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں تھی شاندار تنخواہ دی جارہی تھی اسے' اس کے علاوہ کھانا فری تھا۔ سوزی بھی بیگم صاحبہ کی بے حد مشکور تھی۔

لیکن بیگم صاحبہ کی پُراسرار شخصیت اس کے لئے بھی تجسس کا باعث تھی۔ اسے صرف باورچی خانے تک جانے کی اجازت تھی اور بس' باقی حصے سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا' بیگم صاحبہ کے لئے کھانا وغیرہ لے جانا داور کے سپرد تھا۔ سوزی کو اس کی اجازت نہیں تھی۔

سوزی نے آج تک بیگم صاحبہ کو نہیں دیکھا تھا اور میری تو خیربات ہی دوسری تھی لیکن بیگم صاحبہ کے بارے میں اسے خاصا تجسس تھا۔ ایک دن جب داور کہیں گیا ہوا تھا وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"مسٹر مسعود یہ بیگم صاحبہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکیں آخر یہ اس قدر تنہائی میں زندگی کیسے بسر کررہی ہیں۔"

"عادت پڑ گئی ہے سوزی' خود میرے لئے بھی وہ بے حد پُراسرار ہیں۔ میں خود ان کے بارے میں خاصے تجسّس کا شکار رہا ہوں' مگر اب میں نے ان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔"

"آپ نے بھی آج تک انہیں نہیں دیکھا۔"

"نہیں سوزی' تم لڑکی ہو کر نہ دیکھ سکیں تو میں مرد ہو کر کیسے دیکھ سکتا تھا۔ یقین کرو بعض اوقات تو میں محسوس کرتا ہوں کہ اس عمارت میں کسی بیگم صاحبہ کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ صرف داور کی اختراع ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ وہ کسی کے سامنے کیوں نہیں آتیں لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ان کا وجود ایک اختراع ہے گو میں نے بھی آج تک انہیں نہیں دیکھا لیکن اکثر ان کے قدموں کی چاپ سنی ہے۔ ان اوقات میں جب داور ان کے پاس ہوتا ہے' میں نے ان دونوں کی گفتگو بھی سنی ہے۔"

"اوہ۔ ایسی کوشش مت کرو سوزی۔ اگر کبھی داور نے یا بیگم صاحبہ نے تمہاری یہ حرکت دیکھ لی تو اچھا نہیں ہوگا' یوں بھی ہمارے لئے ان کا وجود باعثِ رحمت ہے۔ ان کی ذات سے ہمیں آج تک کوئی تکلیف نہیں پہنچی' تو کیا ضروری ہے کہ ہم ان کے لئے تکلیف کا باعث بنیں۔ کیا انہوں نے کبھی تمہیں کوئی تکلیف دی۔"

"نہیں مسعود' میرا تو رواں رواں بیگم صاحبہ کا احسان مند ہے میں آئندہ خیال رکھوں گی۔"

"وعدہ۔" میں نے کہا۔

"ہاں مسعود پکا وعدہ۔" سوزی نے کہا اور بات آئی گئی ہو گئی۔

زندگی کے معمولات یونہی چلتے رہے' دن گزرتے رہے اس دوران اکبر سے ملاقاتیں رہیں' لیکن اکبر آج تک میری رہائش پر نہیں آیا تھا۔ میں جب بھی اس سے کہتا تو اس کا جواب یہی ہوتا کہ یار وہ بھی کوئی آنے کی جگہ ہے لیکن سچ پوچھئے تو میں اس جگہ کا عادی ہو گیا تھا۔ سوائے گھر پہنچنے کی دقت کے مجھے وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ صبح کا مسئلہ داور نے حل کر دیا تھا۔ کھانے پینے کی بھی کوئی پریشانی نہیں تھی' یوں بیگم صاحبہ کا گھر میرے لئے بہت ہی زیادہ سہولتوں کا باعث تھا اور میں کسی نئی پریشانی سے دوچار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

اس دن آفس میں نہ جانے کیوں میری طبیعت خاصی اداس اور مضمحل تھی۔ بڑی دیر تک میں اپنے آپ کو مختلف مشاغل میں الجھانے کی کوشش کرتا رہا لیکن طبیعت کا اضمحلال دور نہیں ہوا اور جب کسی طرح بھی نہ بہلا تو یونہی بلا مقصد میں نے اِدھر اُدھر گھومنے کی ٹھانی۔ میرا خیال تھا کہ بازار کی رونق اور گہما گہمی دیکھ کر ضرور کچھ وقت بہتر گزرے گا لیکن طبیعت پر افسردگی بدستور طاری رہی۔ پانچ بج چکے تھے' چنانچہ میں نے سوچا کہ گھر چلا جائے وہاں جا کر سوزی سے گپ شپ رہے گی۔ چنانچہ میں نے ٹیکسی لی اور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ گھر پہنچا تو خاموشی اور ویرانی نے میرا استقبال کیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے کپڑے اتارے' دوسرے کپڑے پہنے اور پیروں میں چپلیں پہن کر سوزی کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

سوزی کے کمرے کے دروازے پر میں نے دستک دی لیکن کوئی آواز نہ آئی۔ میں نے دستک دوسری بار ذرا زور سے دی لیکن اس بار بھی آواز ندارد! کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا' میں نے دروازے کو ذرا سا کھولا اور اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن پورا کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ میں واپس پلٹ آیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد داور میرے پاس پہنچ گیا۔ شاید اس نے دستک کی آواز سن لی تھی۔

"خیریت تو ہے آج آپ جلدی کیسے آ گئے؟" اس نے آتے ہی سوال کیا۔

"بس یار آج آفس میں دل نہیں لگا بڑی بے چینی سی طاری تھی طبیعت پر چنانچہ میں نے سوچا کہ گھر چل کر آرام کیا جائے۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی' سوچا سوزی سے کہوں چائے بنا کر لے آئے لیکن سوزی اپنے کمرے میں موجود نہیں ہے۔"

"وہ چلی گئی۔"

"کیا مطلب.........؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"پتہ نہیں.......... میں نے اسے باورچی خانے میں دیکھا اس کے علاوہ پوری عمارت میں بھی میں نے چھان ماری لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں چلا نہ جانے وہ کہاں گئی۔"

"کیا کہہ رہے ہو داور!" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"وہی پرانی بات.........."

"یعنی؟"

"بھاگ گئی۔" داور نے گہری سانس لے کر کہا۔

"لیکن کیوں..........؟"

"اب اس بارے میں' مَیں کیا کہہ سکتا ہوں' یہ اس کا اپنا مسئلہ ہوگا۔"

"لیکن داور یہ کیسے ممکن ہے وہ تو یہاں بہت خوش تھی۔ ایسی آرام دہ ملازمت اسے اور کہاں مل سکتی ہے۔ اور پھر رات کو اس نے مجھ سے ملاقات کی تھی۔ ایسا کوئی خیال بھی اس نے ظاہر نہیں کیا۔"

"مجھ سے ظاہر کیا تھا.........." داور بولا۔

"اوہ کیا کہا تھا؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہ یہاں اس کی زندگی کو زنگ لگتا جا رہا ہے۔ وہ خود کو عضوِ معطل سمجھ رہی ہے اور پھر اس کے لئے بہت سی مشکلات بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے بہن بھائیوں سے ملنے نہیں جاسکتی۔ یہاں کوئی تفریح بھی نہیں ہے۔ اس ویرانے میں اس کا دم گھٹتا ہے۔"

"یہ سب کچھ اس نے کب کہا تم سے داور؟"

"یہی کوئی آٹھ دس روز ہوگئے۔ جب اس نے مجھ سے بات کی تھی۔ میں اسی روز کھٹکا تھا۔ بہر حال میں نے اسے سمجھایا کہ اس پُر آشوب دور میں اتنی اچھی ملازمت کہاں ملتی ہے' اچھی تنخواہ تمہیں دی جا رہی ہے۔ ہر سہولت مہیا ہے گذارتی رہو' ہاں کوئی تکلیف ہو تو ضرور بتاؤ۔ اس وقت میری باتیں سن کر وہ خاموش ہو گئی تھی' لیکن میں۔ اس کے چہرے پر الجھن کے سائے دیکھے تھے اور بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا۔"

"مجھے حیرت ہے داور۔"

"حیرت کی کیا بات ہے صاحب' یہاں آنے والی ہر لڑکی دوسرے تیسرے مہینے گم جاتی ہے اور اس طرح کی باتیں کر کے نوکری چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے داور' لیکن لڑکی لڑکی میں بھی فرق ہوتا ہے' سوزی بہت سلجھی ہوئی لڑکی تھی اور مجھے تعجب ہے کہ وہ چپ چپاتے کہاں چلی گئی۔"

"یہ آپ کا خیال ہے مسعود صاحب' ورنہ وہ بھی.......... ایک عام سی لڑکی تھی بالکل عام سی' اسے رومان کی ضرورت تھی۔ وہ کسی مرد کا سہارا چاہتی تھی' اور ظاہر ہے سب کچھ اسے یہاں نہیں مل سکتا تھا۔ مسعود صاحب اس نے کئی بار مجھ سے اظہارِ عشق کیا لیکن میں اس قسم کا انسان نہیں ہوں۔" داور نے کہا اور میں اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

کیا کہہ رہے ہو داور..........؟"

"ہاں مسعود صاحب' وہ سالی مجھ سے عشق کرنے لگی تھی۔ پر اپنی فطرت میں اس گندگی شامل نہیں ہے۔ میں نے اسے دھتکار دیا اور شاید اسی بات پر ناراض ہو کر وہ

گئی۔"

"ارے!" میں نے کہا اور داور کو دیکھنے لگا' مجھے سوزی پر حیرت ہو رہی تھی۔ بے شک داور مرد تھا لیکن نہایت کریہہ صورت' اس کی صورت دیکھ کر میرا خیال تھا کہ کوئی لڑکی اس سے محبت نہیں کرسکتی تھی لیکن اگر سوزی نے داور سے اظہارِ عشق کیا تھا تو وہ خود بھی عجیب فطرت عورت تھی۔ ورنہ عمر وغیرہ کے لحاظ سے میں داور سے کہیں زیادہ بہتر' تندرست اور شکل و صورت میں خوبصورت تھا' اور سچی بات تو یہ تھی کہ اس عمارت کی وحشت ناک تنہائی سے گھبرا کر میں نے کئی بار سوزی کو اس انداز میں ٹٹولنے کی کوشش کی تھی لیکن میرے سامنے وہ بالکل ٹھس رہی تھی اور اس کی اس سرد مہری کو محسوس کرتے ہوئے میں نے اس کا خیال چھوڑ دیا لیکن یہ جان کر مجھے انتہائی حیرت ہوئی تھی کہ موصوفہ داور سے عشق کرتی تھیں۔ چند منٹ تک میں ان خیالات میں ڈوبا رہا' پھر داور کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں مسعود صاحب۔"

"کوئی خاص بات نہیں' بس سوزی کے بارے میں میں سوچ رہا تھا۔ اگر تم کہو تو میں ان سے اس کے گھر پر ملنے کی کوشش کروں اس طرح خاموشی سے اسے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی اگر جانا ہی تھا تو باقاعدہ کہہ سن کر جاتی۔"

"نہیں مسعود صاحب اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر بھی داور ہمیں کوئی نئی ملازمہ تو رکھنا پڑے گی نا اگر سوزی ہی دوبارہ آجائے تو اس میں کیا حرج ہے۔"

"حرج تو کوئی نہیں ہے۔ مسعود صاحب' لیکن بیگم صاحبہ کا ایک اصول ہے' جانے والے سے وہ کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں' اب وہ کسی قیمت پر اس کا یہاں آنا پسند نہیں کریں گی اس لئے اس کے ذکر کو جانے دو۔"

"پھر کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال میرے ہاتھ کا کھانا۔ میرے ہاتھ کا ذائقہ!" داور نے بھونڈے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں یار کھانا تو تمہارے ہاتھ کا بے حد شاندار ہوتا ہے۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

کافی دن گزر گئے۔ داور کھانا پکانے کا ماہر تھا۔ وہی بیگم صاحبہ اور میرے لئے کھانا

پکاتا رہا' سوزی کے جانے کے چھٹے دن داور نے پھر مجھ سے بات کی۔
"نئی ملازمہ کا کیا ہوگا مسعود صاحب..........؟"
"جیسا تم کہو.........."
"آپ اخبار میں اشتہار دے دیں اور کسی لڑکی کو ارینج کرلیں۔"
"نہیں داور۔ میرا خیال ہے یہ کام تم بہتر طور پر خود ہی انجام دے سکتے ہو۔"
"کیوں مسعود صاحب..........؟"
"بھائی میرے لئے پہلا ہی تجربہ خاصا تلخ ثابت ہوا ہے۔"
"کیا مطلب! میں نہیں سمجھا مسعود صاحب۔"
"سوزی کی بات کررہا ہوں داور' تم یقین کرو مجھے سوزی کے اس طرح چلے جانے سخت غصہ ہے۔ اس نے میری بھی توہین کی ہے۔ داور' میں کتنے خلوص سے اس پیش آتا تھا' لیکن اس نے اتنا بھی نہ کیا کہ جانے سے پہلے مجھے بتا ہی دیتی' چوروں کی طر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی اسے وہ تو بیگم صاحب شریف خاتون ہیں۔ ورنہ چوری کا الزا لگا کر گرفتار کروا دیتیں اسے۔" میں نے غصے سے کہا اور داور.......... بے تکے پن ہنسنے لگا۔
"ہاں کہہ تو ٹھیک رہے ہیں مسعود صاحب' لیکن بس بیگم صاحبہ بہت ہی نیک دل خاتون ہیں' وہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف دینا پسند نہیں کرتیں۔ سوزی کے مسئلے کو بھ انہوں نے اسی لئے نظرانداز کردیا کہ غریب بچی ہے۔ اگر یہاں نہیں رہنا چاہتی نہ س کسی اور کا انتظام کرلیا جائے گا۔" داور نے کہا پھر بولا۔ "تو آپ اس مسئلے پر کوئی تو نہیں دیں گے مسعود صاحب!؟"
"میرا خیال ہے اس بار تم ہی کوشش کرڈالو۔" میں نے کہا اور داور نے گرد ہلادی۔
اس دن آفس پہنچا تو کھانے کے وقت پر اکبر سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بیچارا خاص طو سے مجھ سے ملنے کے لئے آیا تھا' اور خاصا بگڑا بگڑا نظر آرہا تھا۔
"کیا بات ہے اکبر' کچھ ناراض معلوم ہوتے ہو۔"
"ناراضی کیسی بھائی' جب تک تم نے چاہا تعلقات.......... رکھے اور جب دل چا توڑ دیئے۔" اکبر نے روکھے پن سے کہا۔
"ارے مگر تعلقات توڑنے کی اطلاع کس نے دی تمہیں میں نے تو کسی کو قاصد

کر نہیں بھیجا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"بس یہی تو کسر رہ گئی ہے۔ کسی کے ذریعے اطلاع بھی بھجوا دیتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔" اکبر بدستور ناراض تھا۔
"تعلقات توڑنے کی.........."
"جی ہاں.........." اکبر نے اسی انداز میں کہا۔
"خیر چھوڑو ان باتوں کو' تم میری مجبوری جانتے ہو۔ اکبر' اتنی دور چلا گیا ہوں کہ بس.......... ویسے میرے حالات واقعی بہتر ہوگئے ہیں۔ اچھی خاصی رقم بچ جاتی ہے۔ رہائش فری' کھانا فری ایک طرف کا کونینس فری۔ اور کیا چاہیئے مجھے' دوسرے معمولی سے اخراجات ہیں۔ ایسی جگہ اور کون سی ملے گی' حالانکہ میں خود بھی ان لوگوں کے احسانات سے شرمندہ رہتا ہوں' لیکن کچھ ایسی اپنائیت ہے ان کے ہاں کہ وہاں سے آنے یا ان سے کچھ کہنے کو دل بھی نہیں چاہتا۔"
"ٹھیک ہے بھائی عیش کرو' منع کون کر رہا ہے تمہیں لیکن دوستوں کو اس طرح فراموش بھی نہ کرو' چھٹی کا دن تو ملتا ہے نا تمہیں۔"
"ہاں یار ملتا تو ہے' لیکن وہ ہفتہ بھر کی مصروفیات کو ذہن سے جھٹکنے میں صرف ہوجاتا ہے' سارا دن کپڑے دھونے میں' نہانے وغیرہ میں اور آئندہ کی تیاریاں کرنے میں گزر جاتا ہے' تم خود بھی تو آؤ نا کبھی' تم نے تو ادھر کا رخ ہی نہیں کیا۔"
"کیا بتاؤں' مسعود بھائی کئی بار دل چاہا کئی بار ہمت کی' لیکن اول تو وہ بستی ہی اتنی دور ہے اور اس کے بعد پیدل کا سفر' بس ہمت جواب دے جاتی ہے۔ بہرحال کسی وقت آؤں گا۔" اکبر نے کہا۔
"بھابی کو بھی ضرور لانا۔" میں نے اکبر کو منالیا تھا۔
"یقیناً.........." اکبر نے جواب دیا۔
شام کو حسب معمول گھر پہنچا' داور گھر سے باہر لان میں ٹہل رہا تھا اور بے حد خوش نظر آرہا تھا' مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔
"کیا بات ہے' بہت خوش نظر آرہے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔
"خوش ہونے کے لئے کسی خاص بات کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بس جب بھی خوشی مل جائے اس کا اظہار کردو۔" اس نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہوگیا۔
"خوش ہونے کے لئے یہی بات کیا کم ہے کہ مجھے اب ایسا اچھا اور ہمدرد دوست مل گیا

ہے آپ سے پہلے میں یہاں تنہا رہتا تھا' میرا کوئی ساتھی نہیں تھا' لیکن آپ کے آنے سے یہ تنہائی دور ہوگئی ہے۔ کم از کم کچھ باتیں تو کرلیتا ہوں میں آپ سے' کچھ وقت خوشی میں ہی گزر جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔"

"ہاں داور........ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب تمہاری مہربانی ہے' ورنہ میں نے تمہارے لئے کیا کیا ہے۔" میں نے مخصوص لہجے میں کہا۔

"بس بس مسعود بھائی یہ ساری فضول باتیں بند کرو کھانا کھاؤ گے نا۔"

"تم کھلاؤ گے تو کھالیں گے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور داور بھی ہنسنے لگا۔

"ٹھیک ہے آپ لباس تبدیل کرلیں' میں کھانا لے کر آتا ہوں۔" داور نے کہا اور اندر چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔

حسب معمول میں نے منہ ہاتھ دھویا' لباس تبدیل کیا اور داور کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد داور ایک ٹرے میں کھانا سجائے اندر آگیا اور اسے میرے سامنے رکھ دیا۔

"آج تو تم بھی شروع ہو جاؤ داور!" میں نے کہا۔

"توبہ کریں مسعود بھائی........ میں تو پکانے میں کھانے کا عادی ہوں' صبر مجھ سے بالکل نہیں ہوتا' ناک تک بھرا ہوا ہوں' تم عیش کرو۔" اس نے کہا اور میں کھانا کھانے لگا۔

غضب کے مزیدار کباب تھے' میں اس کی جس قدر بھی تعریف کرتا کم تھا۔ حسب معمول میں نے ضرورت سے زیادہ کھانا کھایا اور پھر جب بالکل گنجائش نہ رہی تو میں نے کہا۔

"بس داور اب صبح۔"

"کھالیں کھالیں مسعود بھائی۔ صبح کو تازہ کھانا کھلاؤں گا۔" اس نے کہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم دیر تک باتیں کرتے رہے حتیٰ کہ موضوعِ گفتگو سوزی بن گئی۔ تب داور نے کہا۔

"بیگم صاحبہ سوزی کے چلے جانے سے بے حد ناراض ہیں۔"

"اوہ کیوں؟"

"بس انہیں دکھ ہے کہ لوگ انہیں اس طرح اگنور کیوں کرتے ہیں۔ کوئی ان کے خلوص کو قبول کیوں نہیں کرتا' جب کہ وہ کسی کو تکلیف بھی نہیں دیتیں اور نہ ان

کے لئے باعثِ تکلیف بنتی ہیں لیکن لوگ انہیں خاطر میں ہی نہیں لاتے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے داور........ بیگم صاحبہ جیسی عظیم شخصیت کے ساتھ اس قسم کی حرکات کے مرتکب لوگوں کو معاف نہیں کرنا چاہئے ان کی ذات سے واقعی کسی کو تکلیف نہیں پہنچتی۔ سوزی بھی عجیب و غریب لڑکی نکلی۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے۔"

"حیرت کی کیا بات ہے مسعود بھائی' یہ سب لڑکیاں ایک ہی قسم کی ہوتی ہیں' ہر کسی کے خلوص کا مذاق اڑانے والی اور دوسروں کو دکھ دینے والی۔" داور نے کہا اور میں گردن ہلانے لگا۔

"دراصل ہم بھی تو بہت جلد دوسروں پر اعتبار کرلیتے ہیں۔ داور........ کام کرنے کے لئے لڑکی کی ضرورت تو ہوگی ہی' اس بار ہم اس سے معاہدہ کرلیں گے۔"

"کیا معاہدہ؟"

"یہی کہ اسے کم از کم تین سال تک اس ملازمت پر........ ہمارے ساتھ رہنا ہوگا ورنہ ہم اس پر ہرجانے کا دعویٰ کردیں گے۔"

"ہاں ٹھیک ہے یہ بھی' لیکن فی الحال چند روز تو لڑکی کے بغیر ہی کام چلانا ہوگا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک بیگم صاحبہ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہو جائے۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے داور جو بیگم صاحبہ کی مرضی لیکن اس سلسلے میں اگر کسی کام کے لئے میری ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

تین چار دن تک داور کھانا پکا پکا کر کھلاتا رہا بے شک اس کے ہاتھ کا کھانا بے حد لذیذ ہوتا تھا۔ جن دنوں داور اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتا تھا اس دوران میری خوراک دگنی ہو جاتی تھی۔ یہ بات میں نے اکثر محسوس کی تھی........ پانچویں دن داور نے مجھ سے کہا۔

"بیگم صاحبہ کی طرف سے اجازت مل گئی ہے۔"

"کس چیز کی اجازت........؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"لڑکی کی۔"

"اوہ........ بیگم صاحبہ تیار ہیں........؟"

"ہاں مسعود بھائی آپ کل ہی اشتہار دے دیں اور کسی تندرست اور خوبصورت لڑکی کو اپائنٹ کرلیں۔"

"کیا لڑکی کا خوب صورت ہونا ضروری ہے؟" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"خوبصورت ہوگی تو کھانا بھی اچھا لگے گا۔ بدصورت ہوئی تو بہترین پکی ہوئی چیز بھی بے کار لگے گی۔" داور نے کہا اور ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"او کے داور۔ میں اس سلسلے میں کل ہی کوئی قدم اٹھاتا ہوں۔" میں نے دوسرے دن کے اخبار میں اشتہار دے دیا۔

تیسرے دن بہت سی لڑکیوں کا میں نے انٹرویو لیا اور آخر ایک خوبصورت سی لڑکی اپائنٹ کرلیا۔ اس کا نام فرزانہ تھا۔ مسلم لڑکی تھی۔

فرزانہ بڑی بے تکلف قسم کی لڑکی تھی' دو منٹ میں مجھ سے گھل مل گئی۔ اس نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ اس پوری دنیا میں وہ تنہا ہے' کرائے کے مکان میں رہتی ہے۔ تقریباً چھ ماہ سے کرایہ ادا نہیں کیا ہے اور اگر مزید کچھ روز اسے ملازمت نہ ملتی تو وہ جسم فروشی پر مجبور ہوجاتی۔ اس نے اداس لہجے میں بتایا۔

"نہیں فرزانہ انسان کو رب عظیم سے امید رکھنی چاہئے' جس نے ہمیں پیدا کیا ہے وہ ہماری طرف سے آنکھیں بند نہیں کرسکتا۔" میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب' لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر شخص کو زندگی گذارنے کے لئے سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے' میں نے بہت ٹھوکریں کھائی ہیں' بڑی مشکل سے تعلیم حاصل کی اور ملازمت کرنے لگی لیکن فرم کا مالک میرے کام سے زیادہ میرے بدن کا خواہش مند تھا' جب میں نے اس کی ناجائز خواہش کو تسلیم نہیں کیا تو اس نے مجھے ملازمت سے نکال دیا اور میں ماری ماری پھرنے لگی لیکن مسعود صاحب' چاروں طرف پُرہوس نظریں تھیں۔ میں جگہ جگہ انٹرویو دیتی رہی' اور لوگوں کی نگاہیں میرے جسم کو ٹٹولتی رہیں' وہ مجھے ایک دن میں ایک ماہ کی تنخواہ دینے کے لئے تیار تھے' لیکن اس کا معاوضہ میری محنت سے نہیں' میرے جسم سے وصول کرنا چاہتے تھے۔ حتیٰ کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے باعزت روزی میرے لئے ختم کردی گئی ہو۔ تب میں نے سوچا کہ اگر جسم بیچ کر ہی روٹی مل سکتی ہے تو اسے سستے داموں کیوں بیچوں......... اور یقین کریں جناب اگر آپ کے ہاں مجھے ملازمت نہ ملتی تو میں یہاں سے سیدھی بازارِ حسن جاتی اور وہاں پر گاہک تلاش کرتی' کیونکہ دو دن سے میں بھوکی ہوں' میں نے کچھ نہیں کھایا' صرف پانی پی کر گزارہ کررہی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور میرا کمزور وجود اس کے آنسوؤں میں بہنے لگا۔

بمشکل تمام میں نے اسے خاموش کرایا' چپڑاسی کو بلا کر اس کے لئے کھانے کا انتظام

کرایا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"میں تمہیں ملازمت دینے کے لئے تیار ہوں فرزانہ' ایک باعزت ملازمت' بلاشبہ تم خوش رہو گی۔ کیونکہ کوئی ہوسناک نگاہ تمہاری طرف نہیں پڑے گی لیکن ہماری کچھ شرائط ایسی ہیں' جنہیں ممکن ہے تم پسند نہ کرو۔"

"وہ کیا جناب؟"

"تمہیں شہر سے دور ایک مکان میں رہنا ہوگا' وہاں کل تین افراد ہیں۔ ایک میں ہوں' ایک گوشہ نشین خاتون ہیں جو پردے کی بے حد پابند ہیں اور ایک شخص اور ہے تمہیں گھر کے ضروری کام کرنا ہوں گے۔ کوئی کام ایسا نہیں ہوگا جو تمہاری فطرت کے خلاف ہو' لیکن کم از کم تین سال تمہیں ہمارے ساتھ گذارنے ہوں گے۔"

"میں کچھ پوچھنا چاہوں گی جناب۔" فرزانہ نے کہا۔

"ہاں ضرور......... آدمی کو ہر کام تسلی سے اور سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"یہ تین سال کی پابندی کیا حیثیت رکھتی ہے؟"

"کچھ نہیں......... یہ معاہدہ صرف اس لئے ہوگا کہ عام طور پر لڑکیاں اس ماحول کی ویرانی سے اکتا کر بھاگ جاتی ہیں۔"

"اوہ' یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے' میرا دل بھی اس مشینی دنیا سے بھر گیا ہے جناب' اگر صرف ویرانی کی بات ہے تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ جب تک آپ مجھے ملازم رکھیں گے رہوں گی۔" فرزانہ نے کہا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت بہت شکریہ جناب۔" اس نے کہا اور میں نے اسے ملازم رکھ لیا۔ شام کو میں اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا اور اس کا تعارف داور سے کرادیا۔

"یہ فرزانہ ہیں داور' تین سال کے اگری منٹ پر راضی ہیں اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ یہ ماحول کی ویرانی سے نہیں گھبرائیں گی۔"

"بہت خوب۔" داور نے کہا۔ "تنخواہ کا مسئلہ طے کرلیا ہے تم نے۔"

"نہیں تنخواہ کے بارے میں ابھی میں نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔ البتہ کھانا کپڑا اور رہائش کے بارے میں بتا دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے تنخواہ کا مسئلہ بھی طے ہو ہی جائے گا' میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ

آپ نے انہیں ضروری کوائف سے آگاہ کردیا ہے۔"

"ہاں یہ ہمارے لئے بالکل ٹھیک رہیں گی۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ مطمئن ہیں تو سب ٹھیک ہے' ویسے آپ نے انہیں بیگم صاحبہ کے بارے میں بھی بتا دیا ہوگا۔"

"بالکل۔ انہیں صرف ملازمت سے سروکار ہے۔" میں نے کہا اور داور نے گردن ہلادی۔

فرزانہ کو بھی وہی کمرہ مل گیا تھا جو کبھی سوزی کے لئے مخصوص تھا اور فرزانہ نے حسن وخوبی سے اپنا کام سنبھال۔ وہ ہمارے ساتھ بہت خوش تھی۔ البتہ فطری طور پر اسے بھی بیگم صاحبہ کے بارے میں تجسّس تھا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ کئی بار ان پُراسرار بیگم صاحبہ کا تذکرہ کرچکی تھی جن کی موجودگی اس نے بخوبی محسوس کی تھی لیکن جن کا سایہ بھی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے خاص طور سے اسے اس سلسلے میں سمجھایا اور کہا یہاں باعزت ملازمت کرنے کے لئے یہ شرط بھی ضروری ہے کہ بیگم صاحبہ کی کھوج نہ کی جائے' پھر میں نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں اتنے عرصے سے یہاں رہ رہا ہوں لیکن میں نے کبھی بھی بیگم صاحبہ کا سایہ تک نہیں دیکھا۔ فرزانہ میری اس بات سے کافی متحیر تھی۔

پھر ایک دن ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں دفتر میں تھا کہ ایک پولیس انسپکٹر ایک اسسٹنٹ کے ساتھ میرے پاس آیا' اس نے میرا نام معلوم کیا اور بولا۔ "میں ایک خاص سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔"

"فرمایئے۔" میں نے انسپکٹر کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر صورت سے بے حد ذہین اور ہوشیار نظر آتا تھا۔ اس نے کسی اخبار کا تراشہ میرے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"یہ اشتہار آپ کی طرف سے تھا۔"

میں نے غور سے اس اشتہار کو دیکھا۔ یہ وہ اشتہار تھا جو میں نے سوزی کو ملازم رکھتے ہوئے دیا تھا۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ نے اس کے جواب میں کسی سوزی نامی لڑکی کو ملازم رکھا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"کیا وہ اب بھی آپ کے پاس ملازم ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہی' اور پھر ایک دن چپکے سے ملازمت چھوڑ کر چلی گئی۔"

"کتنے عرصے قبل؟"

"میرا خیال ہے ایک ڈیڑھ ماہ ہوگیا۔"

"کہاں چلی گئی۔ کیا اس نے آپ کو بتایا تھا؟"

"نہیں' وہ خاموشی سے چلی گئی تھی اور اس کے بعد سے آج تک نہیں ملی۔"

"اس کے ملازمت چھوڑنے کی وجہ کیا تھی؟"

"تنہائی۔ دراصل میں جس جگہ رہتا ہوں وہ خاصی ویران ہے' عام لوگوں کا دل وہاں نہیں لگ سکتا۔"

"آپ کے ساتھ کون کون رہتا ہے؟"

"میں ہوں' بیگم صاحبہ اور ان کا ملازم خاص۔ بس ہم تین افراد ہیں۔ دراصل میں بھی اس مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے گیا تھا لیکن بعد میں ہمارے تعلقات دوستانہ ہوگئے۔" میں اسے تفصیل بتاتا رہا اور انسپکٹر کسی خیال میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے کہا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں انسپکٹر صاحب کہ یہ تفتیش کس سلسلے میں ہو رہی ہے۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ دراصل یہ لڑکی جس کا نام سوزی ہے کافی دنوں سے غائب ہے۔ اس کے بہن بھائی نے پولیس کو اطلاع دی ہے بہرحال ہم اسے تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کو سختی سے ہدایت کی جاتی ہے کہ اس تفتیش کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ قانون شکنی کے مجرم ہوں گے۔"

"بہتر ہے انسپکٹر میں خیال رکھوں گا۔ ویسے اس لڑکی کی تلاش میں میری کسی قسم کی مدد درکار ہو تو آپ تکلف نہ کریں۔ وہ بہرحال ایک شریف لڑکی تھی۔"

"ٹھیک ہے ہمیں آپ کی جس قدر مدد درکار تھی ہم نے حاصل کرلی۔ ایک بات اور بتایئے' کیا اس کے بعد کوئی دوسری لڑکی ملازم رکھی ہے آپ نے؟"

"جی ہاں' اس کا نام فرزانہ ہے اور وہ بڑے اطمینان سے کام کر رہی ہے۔"

"براہ کرم آپ اپنے مکان کا پتہ نوٹ کرادیں۔" انسپکٹر نے کہا اور میں نے اس مکان کا پتہ نوٹ کرادیا۔ جس پر انسپکٹر نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر متعجب لہجے میں بولا۔

"آپ اس مکان میں کیوں رہ رہے ہیں۔"

"کیونکہ مجھے اس کا کوئی کرایہ نہیں دینا پڑتا اور شہر میں مکان حاصل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔"

"بہرحال شکریہ۔" انسپکٹر نے کہا اور چلا گیا۔

انسپکٹر کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ سوزی کہاں گئی۔ اگر اس نے ملازمت چھوڑی تھی تو اپنے گھر واپس کیوں نہیں گئی لیکن پھر میں نے ان وسوسوں کو ذہن سے جھٹک دیا' اونہہ یہ تو پولیس کا کام ہے' وہ تفتیش کر رہی ہے کرتی رہے۔ ہم نے تو سوزی کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا لیکن ایک بات میں نے سوچ لی تھی اور وہ یہ کہ انسپکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کی آمد کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ دو تین دن یہ الجھن میرے سر پر سوار رہی۔ اس کے بعد میں انسپکٹر کی آمد کو بالکل ہی بھول گیا۔

فرزانہ کی آمد سے خاصی دلچسپیاں پیدا ہوگئی تھیں وہ بڑی باغ و بہار قسم کی لڑکی تھی۔ اچھا کھانے کو اچھا پہننے کو ملا تو خوب نکھر گئی۔ شروع میں وہ ان بیگم صاحبہ کی وجہ سے متعجب رہی لیکن پھر اس ماحول کی عادی ہوگئی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ میری طرف مائل تھی اور اس ویران ماحول میں اس کا وجود میرے لئے بے حد دلکش تھا۔ حتیٰ کہ میرے اور اس کے تعلقات بڑھتے گئے۔ فرزانہ کو اب میرے بغیر چین نہیں آتا تھا اور اب ہمارے درمیان سے جسمانی حجاب بھی اٹھ گیا تھا۔

میں فرزانہ کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا اس کی شرافت نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں اسے اپنالوں اور آج میں اپنے آفس میں اسی بارے میں سوچتا رہا تھا۔ حتیٰ کہ میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ فرزانہ کو اپنالوں گا' اور یہ بات میرے لئے فرحت کا باعث بن گئی' اس کے بعد میرا دل آفس میں نہیں لگ سکا تھا۔ شام کو روز مرہ سے کچھ قبل ہی میں واپس پہنچ گیا۔ فرزانہ بے چینی سے میری منتظر تھی مجھے دیکھتے ہی بے ساختہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"میرا سہارا توڑ نہ دینا مسعود' ورنہ میں مرجاؤں گی۔" اس نے درد بھرے انداز میں کہا۔

"پگلی تمہیں مرنے کون دے گا۔" میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں میں مستی چھلک آئی۔

میں نے اس سے کہا کہ رات کو وہ کام سے فارغ ہونے کے بعد میرے کمرے میں آجائے۔ میں نے پکے عاشقوں کے انداز میں کہا۔ "آؤ گی نا؟"

"ہاں۔" وہ آہستہ سے بولی۔

آنے والی رات کے تصور نے مجھے بے خود کر دیا۔ میں اپنی زندگی کے انداز بدلے ہوئے محسوس کر رہا تھا' فرزانہ نے میری سوچ کے دھارے بدل دیئے تھے۔ سارا دن میں اس کے خیال میں ڈوبا رہا شام گزر گئی۔ رات کو ہم حسب معمول یکجا ہوگئے۔ داور کسی قدرے بے چین نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی بے چینی تھی۔

"کیا بات ہے داور۔ تم کچھ پریشان ہو۔"

"ایں۔ نہیں بھلا میرا پریشانی سے کیا واسطہ۔"

"کچھ بے چین لگ رہے ہو۔"

"بے چین نہیں بیمار کہیں۔" داور نے پھیکے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"نزلہ۔ معمولی سا۔ کوئی دوا لے لوں گا ٹھیک ہو جاؤں گا۔ البتہ آج ذرا جلدی آرام کرنے چلا جاؤں گا۔"

"ضرور۔ ضرور۔" میں نے کہا۔ میں تو خود یہی چاہتا تھا۔ فرزانہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

داور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تو مجھے اجازت ۔ آپ دونوں بھی آج جلدی سوجائیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے چور نگاہوں سے فرزانہ کو دیکھ کر کہا اور فرزانہ مسکرادی۔ اس نے بڑی ادا سے گردن ہلائی اور پھر سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"احتیاط ضروری ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"ایک بجے آؤں گی۔ ٹھیک ایک بجے۔"

"اوکے۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گا۔" میں نے کہا اور وہ بھی چلی گئی۔ میں بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی طرف آگیا۔ فرزانہ کی آمد نے میری زندگی میں بھی بہاریں پیدا کر دی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اچانک میں بھی انسان بن گیا ہوں۔ وہ انسان جو اپنی زندگی جیتا ہے جسے چاہنے والے ہوتے ہیں جس کی اپنی کوئی منزل ہوتی ہے۔ فرزانہ میری منزل تھی۔ میں۔ اگر اس نے پسند کیا تو میں اسے اپنی شریک

حیات بتالوں گا۔ بیگم صاحبہ کو بھلا اس سلسلے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے' ہم دونوں جس طرح ان کی خدمت کرتے ہیں کرتے رہیں گے اور اگر انہیں کوئی اعتراض ہوا تو کیا ضروری ہے کہ اسی جگہ رہا جائے۔ کوئی دوسری جگہ بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ یہ دوسری بات تھی۔ اس وقت میں تنہا تھا اور زندگی میں کوئی امنگ نہیں تھی اور جب زندگی میں کوئی امنگ نہیں ہوتی تو انسان اپنی ذات میں تنہا ہوتا ہے۔ اپنے لئے وہ کچھ نہیں کرپاتا لیکن اب فرزانہ تھی۔ نہ جانے کب تک میں ان خیالات میں کھویا رہا۔ گھڑی کی سوئیاں بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ میری آنکھوں میں نیند کا شائبہ بھی نہیں تھا کسی کا حسین وعدہ کہاں سونے دیتا ہے ایک بجے کے انتظار میں تڑپ رہا تھا۔

اس وقت پونے بارہ بجے تھے جب میرے کانوں میں ایک چیخ کی آواز ابھری اور میں اچھل پڑا۔ یہ چیخ ہی تھی میری سماعت کا واہمہ نہیں تھا۔

میں گھبرا کر اٹھ گیا۔ یہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ اس ویرانے میں کون چیخ رہا ہے لیکن دوسری چیخ پہلی سے واضح تھی اور اس نے میرے دل کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہ فرزانہ کی آواز تھی۔ سو فیصدی فرزانہ کی آواز۔ میرے بدن میں بجلیاں تڑپ اٹھیں۔ بے اختیار میں نے دروازے کی طرف ہی چھلانگ لگائی تھی۔ دروازہ کھول کر میں باہر نکلا اور فرزانہ کے کمرے کی طرف دوڑنے لگا۔ فرزانہ کا بستر خالی تھا۔

اسی وقت مجھے تیسری چیخ سنائی دی اور سناٹے کی اس چیخ نے مجھے سمت بھی بتادی۔

آواز اندر سے آرہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں تذبذب میں پڑ گیا۔ اس طرف بیگم صاحبہ کی رہائش گاہ تھی اور اس طرف جانے کی پابندی تھی لیکن فرزانہ بلاوجہ تو نہ چیخ رہی ہوگی۔ فرزانہ میری زندگی' میری خوشی میں اس کی آواز کو نظرانداز نہیں کرسکتا تھا نتیجہ کچھ بھی ہو۔

چنانچہ میں بے اختیار اندر دوڑا۔ میں نے پہلی بار اس حصے میں قدم رکھا تھا اور اس سے قطعی ناواقف تھا۔ سامنے ہی ایک طویل راہداری نظر آئی اور میں اس میں دوڑتا ہوا دوسری طرف نکل گیا راہداری میں موٹا قالین بچھا ہوا تھا جس کی وجہ سے میرے قدموں کی چاپ معدوم ہوگئی تھی۔ اس راہداری کے سرے پر ایک دروازہ تھا جس سے روشنی چھن رہی تھی۔ اس ایک دروازے کے علاوہ وہاں کوئی اور دروازہ نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ..........

میں نے اس دروازے میں کوئی سوراخ تلاش کیا لیکن جونہی میرے ہاتھ کا دباؤ پڑا

دروازہ کھل گیا۔ اسے اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ دروازہ کھلنے کی کوئی آواز نہیں ہوئی تھی۔ اندر تیز روشنی تھی لیکن اس روشنی میں' میں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ میرے ہوش وحواس گم ہوگئے تھے آنکھوں کے سامنے تاریکی چھائی جارہی تھی میرے سامنے ہال کی چھت کے ایک کڑے سے فرزانہ کی لاش لٹکی ہوئی تھی اس کے دونوں پیروں میں رسیاں بندھی ہوئی تھیں اور یہ رسیاں چھت کے کڑے میں پھنسی ہوئی تھیں۔ خوبصورت بال جھول رہے تھے اور ان کی نوکوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ خون اس کے کٹے نرخرے سے بالوں تک آرہا تھا۔ سر کے نیچے ایک سفید برتن رکھا ہوا تھا جس میں خون جمع ہو رہا تھا اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پر داور.......... خونی داور کسی ماہر قصائی کی طرح چھری پر چھری گھس کر انہیں تیز کررہا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین منظر ناقابلِ برداشت بھی تھا میرے حلق میں ایک وحشیانہ غراہٹ نکل گئی۔ "داور کتے۔ یہ تو نے کیا کیا۔ تو نے فرزانہ کو قتل کردیا۔" میں اس کی طرف لپکا۔ داور کے ہاتھوں سے چھریاں چھوٹ گئیں۔ وہ منہ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا لیکن میں جنگلی بھینسے کی طرح داور پر پل پڑا تھا۔ اسی وقت مجھے اپنے عقب میں ایک منحوس سی آواز سنائی دی۔

"یہ کیسے اندر آگیا؟"

لیکن میں نے آواز پر توجہ نہیں دی تھی۔ میں تو داور کی بوٹیاں اڑانے پر تلا ہوا تھا لیکن چند ہی لمحات کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ داور ٹیڑھی کھیر ہے کمبخت کا بدن تھا یا فولاد۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی چٹان پر قوت آزمائی کررہا ہوں۔

دفعتاً اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ "کیا بدتمیزی ہے مسعود بھائی۔ تم اندر کیوں گھس آئے۔" اس کی غرائی ہوئی آواز ابھری۔

"تم نے تم نے فرزانہ کو قتل کردیا ہے داور۔ تم نے.......... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"میں کہتی ہوں داور یہ اندر کیسے داخل ہوا؟" عقب سے آواز آئی اور میں نے پلٹ کر دیکھا بیگم صاحبہ ہی ہوسکتی تھیں لیکن ان کی ہیبت دل پر دہشت طاری کررہی تھی۔ بدن سوکھا ہوا پنجر۔ پیٹ پھولا ہوا مٹکا۔ لمبا دبلا چہرہ۔ ویران سرخ آنکھیں۔ وہ کوئی چڑیل معلوم ہوتی تھی۔ کالے اور سفید بال بکھرے ہوئے تھے اور سوکھے ہوئے ہونٹوں پر سرخی رچی ہوئی تھی لیکن غور سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا یہ لپ اسٹک نہیں تھی چہرے پر میک اپ نہیں کیا گیا تھا بلکہ یہ خون کی سرخی تھی آہ شاید فرزانہ کے خون کی سرخی۔

"اب تو داخل ہوگیا ہے بیگم صاحبہ۔ آپ فکر نہ کریں اندر آگیا ہے تو باہر نہیں جائے گا۔" داور نے کہا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا' کیا بگاڑا تھا اس معصوم لڑکی نے تیرا کیوں قتل کیا ہے اس کو تونے؟ بولو تم لوگ یہاں کیا منحوس کھیل کھیل رہے ہو؟"

"اس کھیل کے تیسرے کھلاڑی تو تم بھی ہو مسعود بھائی۔" داور ہنس کر بولا۔ "کل صبح تمہیں فرزانہ کے بھی بھاگ جانے کی اطلاع مل ہی جاتی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے بدحواسی سے پوچھا۔

"آرام سے بیٹھو تو تمہیں مطلب بتاؤں۔ اول تو یہاں آکر تم نے بیگم صاحبہ کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے اوپر سے یہ جنونی حرکات کررہے ہو' چلو آرام سے بیٹھو۔"

داور کے لہجے میں سختی تھی۔ اس نے مجھے آہستہ سے دھکا دیا تھا لیکن میں توازن قائم نہ رکھ سکا اور زمین پر آرہا۔ داور کے ہاتھوں سے گری ہوئی چھریاں نزدیک ہی پڑی تھیں میں نے ان میں سے ایک چھری اٹھالی اور کھڑا ہوگیا۔

تمہیں فرزانہ کے قتل کی قیمت ادا کرنی ہوگی داور۔" میں غرائی ہوئی آواز میں بولا۔ اور دلاور کی بھنوئیں سکڑ گئیں۔

"کیا تمہاری شامت ہی آگئی ہے مسعود بھائی' چھری پھینک دو اور انسان بنو۔ تم انتہائی احمق آدمی نکلے میں تو سمجھا تھا کہ تم سب کچھ جانتے ہو چھری پھینک دو۔ ورنہ مجھے بھی غصہ آجائے گا۔" اس کی آواز میں غراہٹ تھی۔

چھری میرے ہاتھ میں لرز گئی۔ داور کی قوت کا میں اندازہ لگا چکا تھا۔ اس کے فولادی بدن میں شیطان سرایت کرگیا تھا لیکن فرزانہ کی موت بھی مجھ سے برداشت نہیں ہورہی تھی' میں چھری لے کر داور پر جھپٹا نتیجہ وہی ہوا تھا داور نے چھری میرے ہاتھ سے چھینی اور اس بار اس کا الٹا ہاتھ میرے جبڑے پر پڑا تھا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری شکل ٹیڑھی ہوگئی ہو چکرا کر گرا تھا چھری ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے بعد میں داور سے کسی قسم کی مدافعت نہیں کرسکا۔ داور نے میرے ہاتھ پاؤں رسی سے جکڑ دیئے اور بڑے اطمینان سے مجھے اٹھا کر ایک دیوار کے پاس بٹھا دیا۔

"تم نے اپنی حماقت سے اپنا بہت بڑا نقصان کرلیا ہے مسعود بھائی۔ اب میں تمہاری

کوئی مدد نہیں کرسکتا۔ تمہیں جو ہدایت کی گئی تھی تم نے اس کی خلاف ورزی کی۔"

"یہ۔ یہ سب کیا ہے داور۔ تم نے فرزانہ کو اس وحشیانہ انداز میں کیوں قتل کردیا۔ کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا؟ بیگم صاحبہ آپ نے بھی اس مردود کو اس وحشیانہ اقدام سے نہیں روکا۔" میں نے کہا اور جواب میں بیگم صاحبہ کھوں کھوں کرکے ہنسنے لگیں۔

"بالکل ہی گدھا ہے۔ ارے بھائی صبح کو میں تمہیں اس نئی ملازمہ کے بھی بھاگ جانے کی اطلاع دیتا اور پھر شام کو اپنے ہاتھ سے تمہارا پسندیدہ سالن تمہیں کھلاتا۔ اس سے قبل بھی تم بار بار ملازماؤں کا سالن کھاتے رہے ہو۔" داور نے ہنستے ہوئے کہا۔

میری زبان گنگ ہوگئی۔ دل سینے سے نکلنے لگا۔ خدا کی پناہ میں ان بھیڑیوں کے ساتھ انسانی گوشت کھاتا رہا ہوں۔ اسی وقت داور کی آواز گونجی۔ "بیگم صاحبہ کا معدہ خراب ہے وہ صرف خون پیتی ہیں گوشت میرا ہوتا ہے لیکن سالن میں صرف تمہارے لئے پکاتا تھا۔ خود میں کچا گوشت کھاتا ہوں۔"

میری طبیعت متلانے لگی تھی۔ "ذلیل کمینے کتے تم آدم خور ہو تم دونوں۔ وحشی ہو۔ آخر تم انسانی گوشت کیوں کھاتے ہو؟"

"تم بھی تو کھاتے رہے ہو میری جان' چند روز رک جاؤ اس کے بعد خود عادی ہوجاؤ گے۔"

"میں۔ میں پولیس میں تمہاری رپورٹ کروں گا پوری تفصیل بتاؤں گا تمہاری۔"

"پھنسو گے تو تم خود ہی کیونکہ ہم نے جال ہی ایسا بچھایا تھا۔ لڑکیاں تمہارے ذریعہ ہی یہاں پہنچتی تھیں۔" داور نے کہا۔

"مگر مجھے تمہاری درندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔"

"پھر تمہیں بھی کھالیا جائے گا! اب تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤ گے۔" داور خونخوار لہجے میں بولا۔

اسی وقت دروازے پر ایک زوردار لات پڑی اور دس بارہ پولیس کے جوان اندر گھس آئے۔ آگے پولیس افسر تھا جس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا۔

"یہ مسئلہ بھی تم نے حل کردیا وحشی جانور۔ ورنہ یہ بے گناہ بھی مصیبت میں پھنس جاتا۔ اے بوڑھی اپنی جگہ رہو ورنہ........." افسر نے گولی چلادی جس نے بیگم صاحبہ کی ٹانگ توڑ دی تھی بیگم صاحبہ بری طرح چیخنے لگیں دوسری طرف داور کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا اور پھر میری بندشیں کھول دیں گئیں۔

عجیب وغریب کہانی تھی۔ داور اور مسز دانیال دو مریض تھے ایک عجیب وغریب مرض کے شکار جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ ان کے بدن سڑتے جا رہے تھے اور ڈاکٹروں کے بورڈ کا متفقہ فیصلہ تھا کہ ان کی زندگی ناممکن ہے۔ ایک تجربہ کار ڈاکٹر نے گہرے دکھ کے ساتھ کہا تھا کہ یہ دونوں مریض ٹھیک ہوسکتے ہیں لیکن ان کا علاج انسانی گوشت اور خون ہے۔ ظاہر ہے اس کا حصول ناممکن تھا۔

لیکن مسز دانیال نے یہ بات سن لی داور سے دوستی کر کے ان دونوں نے ہسپتال سے نکل جانے کا پروگرام بنایا اور اس میں وہ کامیاب ہوگئے۔ مسز دانیال نے اپنی جائیداد فروخت کر کے شہر سے الگ تھلگ یہ عمارت خرید لی اور دونوں یہاں آدم خوری کرنے لگے تھے۔

پولیس دراصل سوزی کی تلاش میں مجھ تک پہنچی تھی اور پھر اس عمارت تک۔ اگر آفیسر اپنے کانوں سے ساری گفتگو نہ سن لیتا تو پھر میری گلو خلاصی بھی ممکن نہیں تھی۔

بہرحال دونوں موذی پکڑے گئے تھے چند سماعتوں کے بعد انہیں موت کی سزا دے دی گئی۔ ان واقعات کو طویل عرصہ گذر گیا ہے لیکن آج بھی جب مجھے ان لمحات کا خیال آتا ہے تو میری روح تک کانپ جاتی ہے۔

☆------☆------☆

کشمکش

ایک لاأبالی نوجوان کا قصہ جسے حالات نے

ایک عجیب وغریب کشمکش میں پھنسا دیا تھا۔

ایک طرف کھڈا تھا تو دوسری طرف کھائی۔

مہم جوئی پسند کرنے والوں کے لئے خوبصورت کہانی

چین و عرب ہمارا' ہندوستان ہمارا' مسلم ہیں ہم' وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ اس میں شک بھی کیا ہے سارا جہاں ہمارا ہے۔ اس جہاں کا ہر گوشہ ہمارا ہے کسی مخصوص گوشے کا تعین کیوں کیا جائے۔ اپنے گھر کے کسی گوشے میں پڑ رہو' ضروری ہے کہ اس سائبان ہو' ضروری ہے کہ اس میں زندگی گزارنے کے لوازمات ہوں۔ آسائشیں ہوں اپنے گھر میں ان فضولیات کی کیا ضرورت ہے۔ ان فضولیات نے کبھی میری طرف رخ کر کے میرا ایمان خراب نہیں کیا تھا۔ والدین اس سے منحرف تھے۔ انہیں اس سارے جہاں میں ایک گھر درکار تھا اس گھر میں آسائشیں درکار تھیں۔ غلط چیزوں کے متمنی کیسے ملتیں؟ مایوس ہوئے مرگئے اور اس سارے جہاں میں مجھے تنہا چھوڑ گئے۔ مگر سارا جہاں ہمارا ہے تو اس میں بسنے والے بھی ہمارے ہی ہوئے۔ کوئی ایک دوسرے کو نہ پہچانتا نہ پہچانے کیا فرق پڑتا ہے۔ سب اپنے ہی بندے ہیں۔

مگر ان اپنوں کے درمیان زندگی بڑی بے کیف گزر رہی تھی کوئی اپنائیت کا مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ نہ محبت نہ سائبان نہ روٹی نہ کپڑا۔ میں اس سارے جہان میں سارے جہاں والوں کی مانند ہی زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں یہ سب سوتیلے بن گئے تھے کوئی پہچانتا ہی نہیں تھا کہ میں بھی اس جہان کا باشندہ ہوں۔ معذرت نہیں تھی تو روٹی کہاں سے آتی۔ سب سے بات کی سب نے ٹھکرا دیا۔ تب میں نے سوچا کہ اپنا جہاں اتنا مختصر نہیں یہاں بات نہیں بنتی کہیں اور چلو اور میں چل پڑا۔ کسی نے ایک ترکیب بتا دی تھی بعض غیر ملکی جہاز ناجائز نوکریاں دے دیتے ہیں خلاصی بنا کر لے جاتے ہیں روٹی بھی دیتے ہیں اور پیسے بھی مگر ایسے کسی جہاز پر چڑھنے کے لئے بھی رقم درکار ہوتی ہے جس کا اپنے پاس کوئی تصور نہیں تھا' کسی اور نے ایک اور ترکیب بھی بتادی۔ یعنی قوت بازو سے کام اور میں نے ایک کے بجائے دونوں بازوؤں کی قوت سے کام لیا اور ایک رات خاموشی سے سمندر میں اتر گیا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں ایک یونانی جہاز لنگر انداز تھا۔ کسی نہ کسی طرح یہ سپاٹ بلندیاں طے کر کے میں جہاز میں داخل ہو گیا اور پھر تین دن تک بھوکا پیاسا اس میں چھپا رہا۔ تیسرے دن جہاز نے لنگر اٹھا دیئے اور میرے سفر کا آغاز ہو گیا۔

سفر کے چودہ گھنٹے گزر گئے تو میں نے اپنی پناہ گاہ چھوڑ دی۔ بھوک پیاس نے نڈھال کر رکھا تھا آدھی رات کے وقت کسی کی موجودگی کے امکانات بھی نہیں تھے۔ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں بچا کھچا کھانا پھینک دیا جاتا ہے۔ بڑے سے ڈھکن کے نیچے بہت کچھ تھا میں نے بسم اللہ کہہ کر اس دسترخوان پر ڈیرہ جمالیا۔ پہلا لقمہ بھی حلق میں داخل نہیں ہوا تھا کہ دیکھ لیا گیا اور پکڑ کر کپتان کے پاس پہنچا دیا گیا لیکن یہ اس جہاں میں پہلا اپنا بندہ تھا میں نے ایک لفظ جھوٹ نہیں بولا اور اپنی پوری کہانی سنا دی وہ ہنس پڑا۔

ہنسا تو پھنسا۔ روٹی بھی ملی اور عارضی نوکری بھی۔ جہاز کے فرش کی صفائی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ سفر جاری رہا۔ دیس دیس کی سیر ہوتی رہی اور پھر جب جہاز اور سمندر سے دل بھر گیا تو اپنے جہاں کی ایک آبادی میں چھپا اور جب جہاز نے لنگر اٹھا دیئے تو اس ملک کا ایک شہری بن گیا۔ ابتدا میں مشکلات پیش آئیں لیکن بعد میں سب ٹھیک ہو گیا۔ ایک ہوٹل میں فراش کی نوکری مل گئی اور رہنے کا ٹھکانہ بھی۔ کام کچھ بھی ہو۔ عزت سے روٹی ملے تو سب ٹھیک ہے۔ اس سے زیادہ طلب کس نے کی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ ذمہ داریاں پوری کرلی جائیں اس کے بعد چھٹی جو دل چاہے کرو۔

اس وقت بھی چھٹی کے لمحات سمندر کے کنارے گزار رہا تھا۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا کہ میری ملاقات وانکر سے ہو گئی۔ نہانے کے لباس میں ملبوس میرے قریب آ گیا تھا۔

"ہیلو!"

"کیوں بھئی میں یہاں بیٹھا برا لگ رہا ہوں کیا؟" میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ آؤ بار میں چلیں۔"

"چلو۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ہم دونوں بار میں جا بیٹھے۔

وانکر نے شراب پیتے ہوئے اپنے بارے میں تفصیلات بتا دیں۔ اپنے ہی جیسا آدمی تھا اور سارے جہاں کو اپنا وطن سمجھتا تھا۔ اخلاق' مروت' معاشرت اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو مضحکہ خیز قرار دیتا تھا۔ یوں اپنا مزاج اس سے مل گیا اور پھر وانکر نے میری ملاقات نیلس سے کرائی۔ معصوم چہرے والی سپاٹ سی لڑکی جس کی عمر بیس سے بائیس سال کے درمیان رہی ہو گی۔ رنگ گلابی' بال سیاہی مائل بھورے' آنکھیں نیلی اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ وانکر نے بتایا۔

"نیلس کو نوادرات اور آثار قدیمہ سے بہت دلچسپی ہے اور اسی وجہ سے ہم دونوں گہرے دوست ہیں۔" وانکر خود آثار قدیمہ کا ملازم تھا۔ نیلس تھوڑی دیر کے بعد چلی گئی

تو میں نے اشاروں' اشاروں میں وانکر سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"ہاں اچھی لڑکی ہے۔ بس دوستی کی حد تک رہتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھتی۔" وانکر نے جواب دیا۔

"پھر اس سے دوستی کیا جواز رکھتی ہے؟"

"دوستی کسی سے بھی ہو کوئی جواز نہیں رکھتی۔ وہ صرف دوستی ہے۔" وانکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نیلس کے بارے میں' میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ وہ پہلی بار وانکر کے ساتھ ملی۔ دوسری بار ایک سڑک پر چہل قدمی کرتی ہوئی مل گئی اور اس نے بڑی بے تکلفی سے میرے ساتھ ایک سڑک چھاپ ریسٹورنٹ میں چائے پی۔ تیسری ملاقات وانکر کے ساتھ ہوئی تھی۔ جہاں وہ دونوں رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے درمیان اپنی میز پر بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وانکر کو ایک ہم رقص مل گئی تو وہ اس کے ساتھ چوبی فرش پر چلا گیا۔ میں نے نیلس سے رقص کے بارے میں پوچھا۔

"نہیں' مجھے ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

"دنیا میں تمہیں کسی چیز سے دلچسپی ہے مس نیلس؟"

"ہاں کیوں نہیں دلچسپی کے لئے اور بھی بہت کچھ ہے اس دنیا میں۔" اس دن میری اس سے خاصی تفصیلی گفتگو ہوئی تھی۔ پھر ایک دن میں اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا کہ دروازے کی بیل بجی۔ جاکر دروازہ کھولا تو نیلس میرے سامنے تھی۔

"تم؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیوں اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا میرا یہاں آنا کوئی ایسا فعل ہے جس پر حیرت ہو؟"

"نہیں۔ نہیں آؤ اندر آؤ۔"

"میرا خیال ہے میرے اندر آنے کے بجائے تم اگر میرے ساتھ باہر آجاؤ تو زیادہ بہتر رہے گا۔" نیلس نے بے تکلفی سے کہا۔

"ٹھیک ہے میں لباس تبدیل کرلوں۔" میں نے جواب دیا اور پھر اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ نیلس مجھے ساتھ لیے ہوئے ایک چھوٹی سی عمارت کے ایک فلیٹ میں داخل ہوگئی۔

"یہ میری رہائش گاہ ہے۔"

تنہا رہتی ہو؟"

"ہاں۔ میں کھانا تیار کرلوں۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔" اس نے کہا اور میں نے

شانے ہلا دیئے۔ یہ عجیب دعوت تھی۔ اتفاق سے آج میری چھٹی تھی ورنہ اس وقت میں اپنی ڈیوٹی پر ہوتا شاید نیلس کو اس کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ اس نے بڑی نفاست سے کھانا لگایا اور پھر میرے ساتھ کھانے کی میز پر آگئی۔ میں نے میز پر تلی ہوئی مچھلیوں کے قتلے' روسٹ گوشت کے پارچے' ابلے ہوئے انڈے' آلو کے چپس' پڈنگ اور تر و تازہ سلاد پر نظریں ڈالتے ہوئے اس سے کہا کہ اس نے میرے لئے اتنا تکلف کیوں کیا؟ تو وہ بولی۔

"پہلی بار جو آئے ہو اس لئے۔ اب دوبارہ یہاں آؤ گے تو اس طرح خاطر مدارت نہیں کروں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے لیکن یہ اچانک دعوت میرے لئے ابھی تک حیران کن ہے۔ کیا اس کی کوئی وجہ ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"کیا؟"

"میرے پاس کچھ چیزیں ہیں جو میں فروخت کرنا چاہتی ہوں۔" نیلس نے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ "یہ چیزیں مجھے ورثے میں ملی ہیں میں اس ورثے کو کبھی اپنے آپ سے جدا نہ کرتی لیکن مجھے اس وقت پیسوں کی شدید ضرورت ہے اور میں اس کی فروخت کے لئے تمہارا سہارا لینا چاہتی ہوں۔"

"اس کی وجہ؟"

"بس بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے طویل ملاقات نہ ہو تب بھی ان پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔"

"کمال ہے میں نے خود اپنے آپ پر بھروسہ نہیں کیا تم پہلی لڑکی ہو جس نے مجھے بھروسے کے لفظ سے روشناس کرایا ہے۔"

"یہ کام تمہیں روم یا پیرس جاکر کرنا ہوگا۔" وہ بولی اور میں اچھل پڑا۔

"ارے۔ ارے۔ کمال کر رہی ہو۔ میں اپنی یہ نوکری چھوڑ کر بھلا روم یا پیرس کیسے جاسکتا ہوں؟"

"تمہیں جانا ہوگا۔ کیوں کہ میرے پاس جو چیزیں ہیں ان کی صحیح قیمت یہاں نہیں لگ سکے گی۔"

"مگر میرا کیا فائدہ ہوگا اس سے؟" میں نے سوال کیا۔

"تم مطمئن رہو گے۔ اطمینان رکھو۔ چاہو تو اپنی ملازمت سے چھٹی لے سکتے ہو۔"

"کیا چیزیں ہیں جنہیں تم فروخت کرنا چاہتی ہو؟"

"یہ تم خود دیکھ کر اندازہ لگا لینا۔ میں تمہیں اس کے سلسلے میں باقاعدہ کمیشن دوں گی۔"

"ہوں! پیشکش دلچسپ ہے۔ اس بہانے پیرس اور روم کی سیر بھی ہو جائے گی۔"

"اور میں تمہاری احسان مند بھی ہو جاؤں گی۔ سفر خرچ میرے ذمہ۔" نیلس کے چہرے پر سرخی نظر آنے لگی تھی۔ جس سے احساس ہوا کہ وہ خوش ہے۔ ہم فلیٹ کے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ نیلس نے میرے سامنے شراب کی بوتل برف اور گلاس لا کر رکھ دیا اور اس کے بعد اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک چمڑے کا سوٹ کیس اٹھا لائی۔ اسے چابی سے کھولا اور اس کے اندر سے لکڑی کی ایک صندوقچی نکال لی۔ میں دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے صندوقچی کا نمبروں والا تالا کھولا اور صندوقچی میری طرف بڑھا دی۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو صندوقچی میں ایک تقریباً سات انچ کا مجسمہ جگمگا رہا تھا۔ جس کی گردن میں چھوٹے چھوٹے جگمگاتے ہوئے ہیروں کے دو ہار نظر آ رہے تھے۔ دیکھنے ہی میں یہ ہیرے کافی قیمتی ہوتے تھے۔ نیلس نے کہا۔

"یہ انمول چیزیں میرے باپ کی یادگار ہیں اور مالی اعتبار سے ان کی قیمت بہت زیادہ ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے لئے صحیح گاہک کا انتخاب کیا جائے اور اسے ان چیزوں کی اہمیت بتا دی جائے۔"

"میں نے یہ کام پہلے کبھی نہیں کیا ہے مس نیلس کہیں گھاٹے کا سودا نہ کر بیٹھوں۔"

"ہم ان کی قیمت کا تعین کئے لیتے ہیں اسی کی روشنی میں تم کام کرنا۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گا کہ تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤں لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم نے ایک اجنبی پر اتنا بھروسہ کیوں کر لیا؟"

"اس میں حیرت کی بات نہیں ہے تم اسے میرا ایک تجربہ سمجھ لو دراصل میں ان چیزوں کو فروخت کرنے کے بعد اپنا کاروبار کرنا چاہتی ہوں۔ تم اگر چاہو تو اس کاروبار میں بھی میرے ساتھ شرکت کر سکو گے۔"

"ٹھیک ہے یہ سب بعد کی بات ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے اور تمہارے درمیان ایک طویل رشتہ قائم ہو رہا ہے۔" نیلس مسکرا کر خاموش ہو گئی پھر اس نے کہا۔

"میں تمہیں ایک ہزار پونڈ دے رہی ہوں۔ وہاں تمہیں اعلیٰ حیثیت کا مالک بن کر

جانا ہو گا کیونکہ لوگ تمہاری حیثیت ہی سے متاثر ہو سکیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

"تو پھر کب روانہ ہو رہے ہو؟"

"جب تم چاہو۔"

"بہتر یہ ہے کہ کل ہی تم اپنی ڈیوٹی سے چھٹی لے لو اور ایک آدھ دن کے اندر یہاں سے نکل جاؤ۔ پاسپورٹ وغیرہ کا بندوبست کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔" میں نے نیلس کی یہ پیشکش پوری طرح قبول کر لی اور پھر تمام تیاریوں کے بعد میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں نے روم کو اپنی پہلی منزل کے طور پر منتخب کیا۔ وہاں امریکی برطانوی' یورپی اور ایشیائی سیاحوں کی ریل پیل تھی۔ ایک پُر رونق شاہراہ کے باوقار ہوٹل میں' میں نے قیام کیا جہاں ٹھہرنے والوں کی اکثریت امریکیوں کی تھی۔ تیسرے ہی دن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی ایک بوڑھے امریکی سے مجسمے کا سودا ہو گیا اور کافی بڑی رقم میں یہ سودا ہوا۔ چنانچہ میں نے یہ مجسمہ اس کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

اس مجسمے کی قیمت ڈالروں میں وصول ہوئی تھی۔ جنہیں میں نے پونڈز میں تبدیل کرایا اور اس کے بعد پیرس روانہ ہو گیا۔ اب میرے پاس بہت بڑی رقم موجود تھی۔ اخراجات کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے پیرس کے ایک اچھے سے ہوٹل میں قیام کیا اور اس کے بعد ہیروں کے وہ ہار فروخت کرنے کے لئے جگہ تلاش کرنا شروع کر دی۔ میں نے وہ ہار جوہریوں کی دکانوں پر دکھائے لیکن ان لوگوں نے اس کی رسید وغیرہ طلب کی تھی چنانچہ میں نے انہیں مسترد کر دیا اور پھر تیسری دکان پر قسمت آزمانے پہنچا تو اس کا مالک درمیانی عمر کا ایک معقول آدمی نظر آیا۔ اس نے مجھے بڑی تعظیم سے بٹھایا اور ہار دیکھنے کے بعد بولا کہ وہ اپنے پارٹنر سے مشورہ کر کے ان ہاروں کی خریداری کا فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ میں نے وہ ہار اس کے پاس چھوڑ دیئے اور ان کی رسید لے لی۔ دکان بہت بڑی تھی اور لاتعداد زیورات اس میں سجے ہوئے تھے چنانچہ میں مطمئن تھا۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب جب میں ہوٹل میں اپنے بستر پر لیٹا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے ویٹر سمجھ کر دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی تھی لیکن دروازہ کھول کر جو لوگ اندر پہنچے وہ ویٹر نہیں تھے بلکہ شاندار سوٹوں میں ملبوس دو' دراز قامت آدمی تھے۔ ان میں سے ایک نے میری طرف ایک چٹ بڑھائی جس پر میرا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔

"ہمارا تعلق محکمہ خفیہ سے ہے اور ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔" اس
نے کہا جس نے مجھے چٹ دکھائی تھی۔

"جی فرمایئے۔"

"تمہارا نام؟" ان میں سے دوسرے نے سوال کیا۔ اور میں نے انہیں اپنا نا
دیا۔

"ہم تم سے ان ہاروں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتے ہیں جو تم جوہری کی دکا
چھوڑ آئے ہو۔"

"کیا مطلب؟ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں آپ ان کے بارے میں؟" میں نے بے
سے کہا۔

"مطلب یہ ہے کہ وہ ہار آپ کے پاس کہاں سے آئے؟"

"کمال کی بات ہے آپ یہ کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں مسٹر؟"

"آپ براہ کرم ہمارے سوالات کے جوابات دیجئے بلکہ بہتر یہ ہے کہ آپ ہمار
ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر چلیں۔"

"اس کی وجہ جاننا چاہتا ہوں جناب؟"

"یہ ہار چوری کے ہیں۔"

"اوہ۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ کیا آپ کے پاس ک
ثبوت ہے؟"

"ثبوت بھی فراہم کردیا جائے گا۔ آپ براہ کرم ہمارے ساتھ چلئے۔"

"ٹھیک ہے مجھے اعتراض نہیں ہے لیکن میرے خیال میں کسی اجنبی کے ساتھ
طریقہ مناسب نہیں ہے۔"

"ہم اس کے لئے آپ سے باقاعدہ معافی طلب کرلیں گے لیکن ہماری کارروائی م
مدد کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔" بہرطور مجھے ان کے ساتھ پولیس ہیڈ کوارٹر جانا پڑا۔ ہیڈ
کوارٹر کے ایک کمرے میں داخل ہونے کے بعد ان میں سے ایک شخص نے مجھے کرسی
بیٹھنے کی پیش کش کی اور دوسرا ایک کیبنٹ کی جانب بڑھ گیا اس نے کیبنٹ کھولا اور ایک
بڑا سا لفافہ نکال کر میرے سامنے آبیٹھا۔ اس لفافے میں بے شمار تصویریں بھری ہوئی
تھیں۔ پولیس افسر نے یہ تصویریں میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

"اگر ان تصویروں میں تمہارا کوئی شناسا چہرہ ہے تو بتاؤ۔" میں نے تصویریں آگے
سرکالیں۔ عورتوں اور مردوں کی لاتعداد تصویریں تھیں۔ میں ان میں سے ایک ایک

رکے تصویر اٹھا کر دیکھتا رہا۔ تقریباً بیس تصویریں دیکھنے کے بعد میرے ہاتھ رک گئے۔
اس بار جو تصویر میرے ہاتھ آئی تھی وہ واٹکر کی تھی۔ پولیس آفیسر جو غالباً میرا چہرہ دیکھ
رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا تم اس تصویر کو پہچانتے ہو؟" میں نے اعتراف میں سرہلایا تھا۔

"گڈ۔ تو اب اس تصویر کو بھی دیکھو۔" اس نے اپنے ہاتھ سے ایک تصویر نکالی اور
میرے سامنے رکھ دی اور میں چونک پڑا۔ میں نے اس تصویر کو بھی پہچان لیا تھا۔ یہ نیلس
کے علاوہ اور کسی کی تصویر نہیں تھی۔

"کیا خیال ہے؟"

"ہاں میں اسے جانتا ہوں اس کا نام نیلس ہے۔"

"اور مرد کا۔"

"وہ واٹکر کے نام سے مجھ سے متعارف ہوا تھا۔"

"تمہارا جرم ثابت ہوگیا ہے میرے دوست اب تمہیں ان دونوں کے پتے بتانے
ہوں گے۔"

"میں نہیں سمجھ رہا تھا۔ آفیسر۔ یہ سب کیا ہے؟" میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"جو لوگ جرم کرتے ہوئے گرفتار ہوجاتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کوئی نئی کہانی
سناؤ۔"

"میں سچ کہتا ہوں میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔"

"اداکاری مت کرو اب صرف یہ بتاؤ کہ ہمیں کس ملک اور کس شہر میں چلنا ہے۔
ہمیں ایک عرصے سے اس گروہ کی تلاش تھی۔ لاکھوں فرانک کا فراڈ کرچکے ہو تم لوگ۔"

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کسی گروہ کو نہیں جانتا میں نہیں جانتا کہ یہ لوگ
ون ہیں۔ میں ایک قانون پسند آدمی ہوں اور تمہیں بلا تکلف ان دونوں کے پاس لے جانا
کرتا ہوں۔"

"تو پھر ہمیں کہاں چلنا ہے؟" پولیس افسر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں ان کے ٹھکانے پر پہنچادوں گا۔"

"گڈ۔ ہم صبح کی فلائیٹ سے چلیں گے۔ افسوس تمہیں رات کو یہیں قیام کرنا
وگا۔" آفیسر نے کہا اور یہ رات مجھے حوالات میں گزارنی پڑی۔ بار بار واٹکر اور نیلس کا
نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ ان دونوں............ کیا ان دونوں نے ملی بھگت سے کام لیا
اور مجھے............ مجھے اس جال میں پھنسا دیا۔ کیا واقعی ان کا تعلق چوروں کے کسی گروہ

سے ہے؟ اگر ایسی ہی بات ہے اور انہوں نے چالاکی سے میرے ساتھ یہ فراڈ کیا ہے تو ہم انہیں اس فراڈ کی سزا ملنی چاہئے۔ چنانچہ میں دوسرے دن نہایت مستعدی کے ساتھ پولیس افسروں کے ساتھ چل پڑا اور اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد میں نے واٹکر کے دفتر ہی رخ کیا تھا۔ دونوں پولیس افسروں نے تجویز پیش کی کہ میں جاکر واٹکر سے ملوں اور اسے یہ صورت حال بتاؤں واٹکر اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہے گا وہ اس کے جرم کا ثبوت ہوگا۔ میں یہاں بھی ان سے تعاون کرنے پر آمادہ تھا۔ واٹکر کے دفتر میں داخل ہوا تو وہ اپنی میز کے عقب میں بیٹھا فائلوں میں غرق تھا۔ مجھے دیکھ کر بری طرح چونک گیا۔ پھر اس کے چہرے پر مسرت کے آثار پھیل گئے۔

"اوہ.......... مائی ڈیئر تم.......... تم آگئے۔ نیلس نے مجھے بتایا تھا کہ تم کسی ضروری کام سے گئے ہو۔"

"ہاں واٹکر لیکن اس ضروری کام کی تکمیل نہیں ہوسکی اور پیرس سے آنے والے دو پولیس آفیسر میرے ساتھ ہیں۔"

"کیا مطلب؟" واٹکر بری طرح چونکا۔

"وہ باہر موجود ہیں اور تمہاری گرفتاری عمل میں آنے والی ہے۔"

"نہیں میرے دوست اگر نیلس نے کوئی ایسی بات کی ہے تو وہ کمینی ہے کہ دوستوں کو دھوکا دیتی ہے۔ بے شک ہمارا تعلق ایک ایسے گروہ سے ہے جو چوری کی اشیاء کا کاروباری کرتا ہے لیکن تمہیں جو چیزیں دی گئیں ان کے بارے میں نیلس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کے باپ کی ملکیت ہیں اگر اس نے تمہارے ساتھ یہ فریب کیا ہے تو پھر وہ قابلِ معافی نہیں ہے۔ آؤ میرے ساتھ آؤ۔ ہم حقیقت کی تہہ تک پہنچے بغیر نہیں رہیں گے۔ آؤ کچھ کرتے ہیں۔ پولیس کے ہاتھوں میں جانا ہم دونوں میں سے کسی کے لئے سود مند نہیں ہوگا۔ وہ لوگ کسی قیمت پر یہ یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں گے کہ تم ہمارے ساتھی نہیں ہو۔" واٹکر کی بات کچھ سمجھ میں آرہی تھی۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ فرار ہونے کے لئے تیار ہوگیا۔ واٹکر میرا ہاتھ پکڑے ہوئے کمرے کی عقبی کھڑکی سے دوسری جانب کود گیا۔ ادھر ایک لمبی راہدری تھی۔ ہم دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے راہداری سے گزر کر آخری سرے پر لوہے کے گول زینے پر پہنچ گئے اور پھر وہاں سے نیچے اتر کر عمارت کی پچھلی سڑک پر آگئے۔ یہاں سے ہم برق رفتاری سے آگے بڑھتے ہوئے سڑک پر پہنچے اور ایک ٹیکسی روک کر اس میں بیٹھ گئے۔ واٹکر نے ڈرائیور کو نیلس کے فلیٹ کا پتا بتا دیا تھا۔ راستے میں ہم دونوں خاموش رہے تھوڑی دیر کے بعد ہم نیلس کے فلیٹ پر پہنچ

گئے۔ واٹکر نے زور زور سے دروازے کی بیل بجائی اور چند لمحات کے بعد دروازہ کھل گیا۔ نیلس اندر موجود تھی واٹکر کے بعد مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"اوہ۔ مائی ڈیئر تم۔ تم آگئے۔" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا لیکن میرے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی میں نے آگے بڑھ کر نیلس کا گریبان پکڑ لیا۔

"کتیا' مکار' چور تو نے مجھے چوری کی چیزیں فروخت کرنے کے لئے دی تھیں۔"

نیلس ایک لمحے کے لئے ہکا بکا رہ گئی اور پھر اس نے ایک جھٹکے سے اپنا گریبان میرے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ دوسرے لمحے میں نے عقب سے چاقو کھلنے کی گڑگڑاہٹ سنی اور چونک کر پیچھے دیکھنے لگا۔ میرا پیچھے دیکھنا اس وقت میرے لئے بڑا سود مند رہا۔ چاقو واٹکر کے ہاتھ میں تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ دوسرے لمحے وہ غراتا ہوا مجھ پر جھپٹا اور اس نے چاقو کا وار میرے سینے پر کرنے کی کوشش کی۔ صورت حال اب میرے علم میں آگئی تھی۔ واٹکر مجھے بے وقوف بنا کر یہاں لے آیا تھا۔ بہرطور میں نے جھکائی دے کر اس کا وار بچایا اور اس کے پیٹ میں ایک زور دار گھونسہ لگا دیا وہ کراہ کر لڑکھڑایا لیکن پھر سنبھل کر اس نے مجھ پر دوسرا وار کرنے کی کوشش کی۔ اس دوران نیلس نے ایک کانسی کا مجسمہ اٹھا لیا تھا وہ میرے سر پر مار کر مجھے زخمی کرنا چاہتی تھی لیکن جونہی واٹکر آگے بڑھا میں نے نیلس کو اس پر دھکیل دیا اور واٹکر کا چاقو نیلس کے سینے میں اتر گیا۔ اس کی دلخراش چیخ ابھری اور واٹکر احمقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ چاقو نیلس کے سینے سے باہر نکل آیا تھا۔ اسی وقت میں نے چاقو پر وار کیا اور چاقو میرے ہاتھ میں آگیا۔ چاقو ہاتھ میں پکڑتے ہی میں نے واٹکر پر حملہ کیا۔ واٹکر میرے اس حملے سے نہیں بچ سکا تھا۔ چنانچہ چاقو اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر پیوست ہوگیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ دبائے نیچے گر پڑا۔ اب دو لاشیں میرے سامنے تھیں اور میں پاگلوں کی طرح انہیں دیکھ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں بہرطور ان دونوں لاشوں سے اپنا بچاؤ کرنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ مجھے یقیناً ان کے قتل الزام میں گرفتار کرلیا جائے گا اور پھر میں دہرے جرم کا شکار ہوجاؤں گا چنانچہ میں نے بمشکل تمام اپنے پتھرائے ہوئے بدن کو گھسیٹا اور دروازے سے باہر نکل آیا۔ میں نے نیچے آکر ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو ایک جگہ کا پتہ بتادیا ٹیکسی چلتی رہی اور میں دروازے کے قریب بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کیا کروں؟ بہرطور جس جگہ میں ٹیکسی سے اترا وہ ایک صنعتی علاقہ تھا گردو پیش میں دور تک ٹیکسیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک پانچ منزلہ بوسیدہ بلڈنگ کی پانچویں منزل پر ایک سیلن زدہ کمرے میں پہنچ گیا جہاں میں نے اس سے پہلے بھی

اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا تھا اور کبھی کبھی یہاں آجایا کرتا تھا۔ اس کے بعد میں اپنے بچاؤ کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ پولیس میرے پیچھے لگی ہوگی اور اگر میں یہاں سے نکل نہ گیا تو موت کے علاوہ اور کچھ نہ ملے گا۔ چنانچہ دو تین دن تو میں یہیں خاموشی سے چھپا رہا اور اس کے بعد ایک دن موقع پاکر باہر نکل آیا۔ تمام انتظامات کئے اور اس کے بعد ایک سفر کے لئے تیاریاں کرلیں۔

جہاز کا سفر میری زندگی کے لئے اجنبی نہیں تھا چنانچہ میں جہاز میں بیٹھ کر ایک نامعلوم منزل کی جانب چل پڑا۔ بہت سے اندیشے بہت سے وسوسے ذہن میں تھے۔ سوچ رہا تھا کہ اب کہاں پناہ لوں گا لیکن پناہ میرے لئے مقرر ہوچکی تھی۔ جہاز کے سفر کا غالباً تیسرا دن تھا سورج طلوع نہیں ہوا تھا کہ جہاز کو طوفان نے آگھیرا۔ دوسرے مسافروں کی طرح میں بھی نیند کی آغوش میں تھا کہ اچانک غل غپاڑے سے آنکھ کھل گئی۔ جہاز ہلکورے کھا رہا تھا میں جلدی سے جوتے میں پاؤں ڈال کر بھاگم بھاگ عرشے پر گیا تو وہاں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ عورتوں' بچوں کی چیخوں اور رونے سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ پھر میں نے جہاز کے عملے کو لائف بوٹ سمندر میں اتارتے دیکھا اور لوگ لائف بوٹ کو اپنی بقاء کا ضامن سمجھتے ہوئے ان پر سوار ہونے لگے۔ جہاز کا عملہ سخت مشکل میں گرفتار تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں سے ڈسپلن قائم کرنے کی درخواست کی جارہی تھی لیکن کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ ہر شخص پوری قوت سے اپنی جان بچانے کے لئے کوشش کررہا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی وہی کیا اور لائف بوٹ میں آبیٹھا لیکن لائف بوٹ میں اتنے افراد بھر گئے تھے کہ سمندر کی بپھری ہوئی موجوں کا غیض وغضب انہیں برداشت نہ کرسکا۔ نہ جانے میں اور میرے لائف بوٹ کے ساتھی کتنی دیر ان بپھری ہوئی لہروں کے رحم وکرم پر رہے ہمیں کوئی احساس نہیں تھا اور اس کے بعد سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہوگئیں۔ شاید ہم لائف بوٹ کے ساتھ ڈوب گئے تھے لیکن زندگی باقی تھی میری آنکھ کھلی تو میں ریت کے ٹیلوں پر پڑا ہوا تھا۔ تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور پہلا احساس پیٹ اور سینے کی جلن کا ہورہا تھا میرا پورا بدن پسینے میں تربتر ہورہا تھا۔ پتا نہیں میں کہاں آگیا تھا۔ میں نے بمشکل تمام خود کو سنبھالا اور نگاہیں اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ تاڑ کے درخت چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے لیکن مجھ سے کچھ فاصلے پر چند افراد کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھا اور مجھے یہ جاننے میں دقت نہ ہوئی کہ وہ تہذیب وتمدن سے دور گمنام اندھیروں کے باسی ہیں۔ وہ کڑی نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے اور جب انہیں احساس ہوا کہ میں ہوش میں ہوں تو ان میں سے چند افراد آگے

بڑھے اور مجھے مرے ہوئے کتے کی مانند گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔ ان کی انگلیاں میرے پیروں میں گڑی جارہی تھیں بڑی مضبوط گرفت تھی ان کی اور وہ مجھے گھسیٹ رہے تھے۔ میری کہنیاں اور کمر چھل گئی تھی لیکن ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ تاڑ کے درختوں سے کچھ فاصلے پر بنی ہوئی ایک جھونپڑی کے قریب پہنچ گئے۔ سرکنڈوں اور ناریل کے پتوں سے یہ جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھے جھونپڑی میں دھکیل کر دروازہ بند کردیا۔ میں درحقیقت اس وقت کسی مردہ کتے کی مانند ہی ہورہا تھا۔ بدن میں ذرا بھی جان نہیں تھی۔ ایک عجیب سی کھولن پورے جسم پر طاری تھی۔ میں نے اپنا ایک گال نرم گھاس پر رکھ دیا اور خوف آمیز مایوسی کے اندھے کنویں میں جھانکتا رہا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کہاں آگیا ہوں؟ یہ کون لوگ ہیں اور میرے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ نہ جانے کتنے گھنٹے اسی طرح پڑا رہا۔ غالباً سورج چھپ گیا تھا رات ہوگئی تھی جب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تو میں نے جھونپڑی کے دروازے پر روشنی دیکھی۔ مشعل کی روشنی تھی اور دو آدمی کچھ اٹھائے ہوئے اندر آئے تھے وہ سب بے لباس تھے اور ان کے پورے بدن پر زیادہ سے زیادہ کیلے کے پتوں کے لباس سجے ہوئے تھے۔ کیلے ہی کے پتے پر انہوں نے کچھ چیزیں میرے سامنے رکھ دیں۔ ان میں کچے ناریل' تاڑ گولے' کیلے' کھجوریں اور چٹنی جیسی کوئی چیز تھی۔ بھوک اس وقت میرے حواسوں پر مسلط تھی میں جلدی سے اٹھا اور کھانے کی پینے کی ان اشیاء پر پل پڑا۔ میں نے ہر چیز صاف کردی۔ دونوں خوفناک آدمی میرے سر پر کھڑے رہے تھے لیکن مجھے ان کی پرواہ نہیں تھی جب وہ چلے گئے تو میں نے ایک انگڑائی لی جسم میں کچھ توانائی آگئی تھی۔ میں اٹھ کر جھونپڑی میں کھڑا ہوگیا چھت ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور وہاں سے تارے نظر آرہے تھے ان کی جھلملاہٹ سے دل کو کچھ سکون سا ملا اور میں سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کرپایا تھا کہ پھر دو آدمی میرے پاس آئے اور میرے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک نے میرا بازو تھام لیا اور مجھے باہر کی طرف دھکیلا لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ان سے تعاون کروں گا تاکہ جینے کی کوئی راہ نکل آئے۔ میں خود ہی آگے بڑھ گیا۔ جھونپڑی سے باہر نکلنے کے بعد وہ مجھے ایک سمت لے چلے تب میں نے غور سے دیکھا یہاں بے شمار جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں اور ان تمام جھونپڑیوں میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا البتہ ان میں سے کسی کسی سے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں یا پھر کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی تھی۔ وہ لوگ مجھے ساتھ لئے ہوئے ایک اور جھونپڑی میں پہنچے اور اندر دھکیل دیا۔ یہاں جھونپڑی کے اندر کونوں پر تین تین فٹ لمبی مشعلیں

گڑی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے خود کو بے شمار دہکتی ہوئی سرخ آنکھوں کے درمیاں پایا۔ وہ پانچ یا چھ آدمی تھے جو ایک قطار کی شکل میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں ایک موٹے بدن کا آدمی موجود تھا۔ جس کے انداز سے پتا چلتا تھا کہ وہ ان لوگوں میں نمایاں حیثیت کا مالک ہے غالباً ان لوگوں کا سردار۔ ان سب کے سامنے تقریباً تین تین فٹ لمبے بھالے نما ہتھیار رکھے ہوئے تھے۔ جھونپڑی میں کافی دیر تک بھیانک خاموشی طاری رہی۔ وہ اپنی ہولناک آنکھوں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور میرے بدن کا خون خشک ہوتا جارہا تھا پھر اس موٹے بدن کے آدمی نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا اور میں اکڑوں بیٹھ گیا۔ موٹے بدن والا آدمی اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں سے کھسر پھسر کرنے لگا اور کچھ دیر کے بعد اس نے اپنے بائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ شخص اٹھ کر میرے پاس آیا اور مجھے اٹھانے لگا تو میں خود ہی کھڑا ہوگیا وہ آدمی مجھے لے کر جھونپڑے سے باہر نکل آیا اور چند لمحوں کے بعد مجھے ایک اور جھونپڑی میں پہنچا دیا گیا تھا جو باقی جھونپڑیوں سے الگ تھلگ ایک سرے پر بنی ہوئی تھی۔ اس جھونپڑی میں بھی ایک طرف کھجوروں کے پتوں کی چٹائی تھی اور ایک کونے میں مٹکے جیسا مٹی کا ایک برتن رکھا ہوا تھا اس کے قریب ناریل کا پیالے نما خول پڑا تھا۔ چھت میں جگہ جگہ سوراخ تھے جن سے بدستور تارے جھانک رہے تھے۔ میں جھونپڑی میں آتے ہی چٹائی پر لیٹ گیا اور مجھ پر غنودگی سی طاری ہوگئی۔ یہ غنودگی نیند کی نہیں بلکہ حالات کے ہاتھوں مایوس ہوجانے کی تھی۔ نہ جانے کتنا وقت گزرا کہ جھونپڑی میں آہٹ سی ہوئی اور میں نے آنکھیں کھول کر سر گھما کر دیکھا تو وہی بھاری بدن والا آدمی اندر داخل ہو رہا تھا؟ تقریباً آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تھی میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کیا یہ کمبخت رات کو بھی نہیں سوتے؟ تقریباً آدھی سے زیادہ رات گزر گئی تھی لیکن ان کے درمیان چہل پہل جاری تھی۔ میں متجسس نظروں سے اس شخص کو دیکھنے لگا۔ وہ میرے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اس وقت صاف نظر نہیں آرہا تھا لیکن چند ہی لمحات کے بعد اس کی آواز ابھری اور میں شدت حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے شستہ انگریزی میں مجھ سے کہا تھا۔

”نوجوان میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو اور مجھے یہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے یہاں یہ رات تمہاری زندگی کی آخری رات بھی ہو سکتی ہے۔ میرے ساتھیوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں صبح کے نکلتے ہوئے سورج کے ساتھ ہی تمہاری گردن تمہارے شانوں سے اتار دوں لیکن میں نے ان سے تعاون نہیں کیا۔ میں تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ سنو نوجوان میں اس جزیرے کا حکمراں ہوں۔ میں نے

اگر کوئی فیصلہ کیا تو کسی کی مجال نہیں کہ وہ اس سے انحراف کرے لیکن اس جاں بخشی کے بدلے میں تمہیں میرے لئے کچھ کرنا ہوگا۔ بولو زندگی بچانا چاہتے ہو یا کل کا سورج نہیں دیکھنا چاہتے؟“

”نہیں۔ نہیں میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں زندہ رہنے کا خواہش مند ہوں۔“ میں نے نہ جانے کس طرح کہا حیرت سے میرے حواس گم ہوتے جارہے تھے کیونکہ مجھے اس وحشی کے اس طرح انگریزی بولنے کی توقع نہیں تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ پھر بولا۔

”اگر تم میرا کام کردیتے ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ یہاں سے تمہیں زندہ سلامت نکل جانے کا موقع دوں گا۔ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کرسکے گا۔ تمہیں حفاظت سے کشتی میں سوار کرادوں گا۔ کیا سمجھے؟“

”ٹھیک ہے سردار.......... میں یہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے منظور ہے۔ مجھے بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے؟“

”تمہیں کسی کو قتل کرنا ہے۔“ اس نے جواب دیا اور میں حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔

”قتل؟“

”ہاں قتل۔“

”مم مگر..........“

”اگر یا مگر کی گنجائش نہیں۔ تمہیں صرف ہاں یا ناں میں جواب دینا ہے۔“

”ٹھیک ہے سردار میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”تو پھر تم تیار رہو۔ تمہیں اس کو ہلاک کرنے کے لئے کوئی ہتھیار نہیں دیا جائے گا۔ تم اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کی گردن دباؤ گے اور اس کے بعد اس کی لاش کو سمندر میں پھینک دو گے۔ سمجھے۔“

”ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔“

”یہ مت سمجھنا کہ میں خود اسے اس دنیا سے رخصت نہیں کرسکتا یا کسی اور سے اسے قتل نہیں کراسکتا۔ میں اسے چٹکیوں میں مسل سکتا ہوں۔ ٹکڑے ٹکڑے کراسکتا ہوں لیکن اس کی ایک وجہ ہے میں ایسا نہیں کرنا چاہتا اور تمہیں یہ وجہ جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں خاموشی سے سنتا رہا۔ سردار چند لمحات خاموش رہا پھر بولا۔

”یہاں کوئی نہیں جانتا کہ میں انگریزی بول سکتا ہوں تم بھی اس کا اظہار کسی پر

نہیں کرو گے۔ جس شخصیت کو تمہیں قتل کرنا ہے وہ ایک لڑکی ہے۔ نوجوان خوبصورت
اور پُرکشش لڑکی جو تمہیں متاثر کرسکتی ہے لیکن زندگی حسن پرستی سے زیادہ قیمتی ہے
ہے۔ تم اس کے حسن کے جال میں پھنس کر اپنی موت کو فراموش نہیں کرو گے........
لڑکی انگریزی نہیں جانتی۔ تم اس سے اشاروں میں بات کرو گے۔ کیا سمجھے۔ باقی تفصیلات
تمہیں بعد میں بتائی جائیں گی چونکہ تم نے میری پیش کش منظور کرلی ہے اس لئے اس
بات پر یقین رکھو کہ صبح کا سورج تمہاری موت کا نہیں ہوگا۔"

سردار چلا گیا لیکن یہ رات مجھ پر کٹھن گزری۔ نیند آنکھوں سے مکمل طور پر غائب
ہوگئی تھی ہزاروں خوفناک احساسات نے گھیرا ہوا تھا یہاں تک کہ سورج نکل آیا میں اٹھ
کھڑا ہوا اور باہر آکر میں نے جھونپڑی کے باہر کا منظر دیکھا سرکنڈوں اور کھجور کے پتوں
کی لاتعداد جھونپڑیاں سامنے کے رخ پر بکھری ہوئی تھیں۔ یہ جھونپڑی ذرا الگ تھلگ
تھی اور غالباً اس بستی کی آخری جھونپڑی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر کھجوروں کے جھنڈ
تھے جن کے قدموں میں ایک چشمہ یا ننھی منی جھیل سی تھی۔ میں جھونپڑی سے باہر نکل
آیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ سردار نے یقیناً میرے
بارے میں دوسرے لوگوں کو ہدایات دے دی ہوں گی۔ سورج کی نارنجی کرنیں درختوں
کی چوٹیوں پر سنہرا پانی پھیرتی جارہی تھیں اور پرندوں کے راگ سنائی دے رہے تھے۔
مہک آمیز ہوا کے جھونکے جھیل کے پانی کو ہلکورے دے رہے تھے۔ میں سحرزدہ سا ہو کر
جھیل کے کنارے بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ پانی میں ڈال کر اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے
مارنا شروع کردیئے۔ تہذیب کی دنیا سے اتنی دور نکل آؤں گا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔
کبھی کبھی تو میرا بدن خوف و دہشت سے کانپنے لگتا اور کبھی سوچتا کہ اچھا ہی ہوا اس دنیا
سے نکل آیا ورنہ ان دونوں کی موت میرے گلے میں پھانسی کا پھندا بن جاتی اور مجھے یقیناً
بجلی کی کرسی نصیب ہوتی یہاں آکر جان تو بچ گئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر تک میں خاموش
بیٹھا رہا کہ دفعتاً ایک چھوٹا سا پتھر پیچھے سے آیا اور جھیل کے پانی میں گر کر دائرے بناتا ہوا
گم ہوگیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ درخت کے جھکے ہوئے تنے سے پشت
ٹکائے کھڑی تھی۔ نہ جانے کب سے وہ وہاں موجود تھی۔ معمولی سا کیلے کے پتوں کا لباس
یہاں کے عام باشندوں کی مانند اس کا بدن چھپائے تھا۔ اس کا رنگ کسی قدر سانولا اور
نقوش تیکھے تھے۔ ناک ستواں اور آنکھیں بڑی بڑی جسم بے حد سڈول تھا۔ لمبے لمبے بال
شانوں پر لہرا رہے تھے۔ میں پاگلوں کی طرح اسے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس
کی طرف بڑھ گیا۔ قریب پہنچا تو وہ آہستہ سے مسکرا دی اور میں اس کے اس انداز کو

حیرت سے دیکھنے لگا۔ وہ خاموشی سے میری صورت دیکھ رہی تھی تھوڑی دیر تک وہ اسی
طرح دیکھتی رہی پھر اچانک درخت کی پشت سے ہٹی اور مڑ کر واپس چل پڑی۔ میرے قدم
نہ جانے کیوں خود بخود اس کے پیچھے اٹھ گئے تھے۔ اس کا رخ اس گول جھونپڑی کی جانب
تھا جو سامنے ہی نظر آرہی تھی۔ چند لمحات کے بعد وہ جھونپڑی میں داخل ہوئی اور اس نے
دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ میں باہر کھڑا سوچتا ہی رہ گیا تھا کہ یہاں تک آنے کا مقصد کیا
ہے لیکن مقصد خود میری سمجھ میں نہیں آیا تو میں واپس چل پڑا اور اپنے جھونپڑے میں
پہنچ گیا۔ جھونپڑی کے فرش پر میرے لئے صبح کا ناشتا رکھا ہوا تھا۔ وہی جانی پہچانی چیزیں
ناریل تاڑ گولے اور دوسرے پھل جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے لیکن انہیں
کھانے سے مجھے کافی تقویت محسوس ہوئی تھی۔ کافی دیر تک میں اکتایا اکتایا سا بیٹھا رہا۔
سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں پھر میں باہر نکل آیا ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ
عقب سے آہٹ ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو سردار اپنے انہی دونوں مشیروں کے ساتھ
کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نگاہیں عجیب انداز میں میرا جائزہ لے رہی تھیں پھر اس نے شانے پر
سر رکھ کر اپنے دائیں سمت کھڑے ہوئے آدمی سے کچھ کہا اور وہ دونوں آگے بڑھ آئے۔
ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میرے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور بشرٹ پھاڑ کر پھینک
دی۔ دوسرے نے میری پتلون کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ ظاہر ہے
اسے اس کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ سردار نے اپنی زبان میں کچھ کہا اور وہ شخص پیچھے
ہٹ گیا گویا مجھے پتلون پہنے رہنے کی اجازت دے دی گئی تھی اور اس کے بعد وہ وہاں سے
آگے بڑھ گئے۔ میرا اوپری بدن برہنہ ہوگیا تھا لیکن یہی شکر تھا کہ پتلون ابھی میرے جسم
پر موجود تھی۔ پریشانیوں کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جس طرح
بھی ممکن ہوسکے چالاکی سے یہاں کا جائزہ لوں۔ کسی کو قتل کرنا اور وہ بھی جان بوجھ کر
میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ نیلس تو واٹکر کا شکار ہوئی تھی اور واٹکر صرف میرے خوف کا
شکار ہوا تھا اگر مجھے جان بچانے کا خوف نہ ہوتا تو میرے ہاتھ کبھی اس کے خون سے نہ
رنگے جاتے۔ بہرطور اب یہاں زندگی گزارنا ہی تھی۔ دیکھوں کب تک میری تقدیر میں یہ
تمام قید لکھی ہے۔ نہ جانے کیوں میں وہاں سے آگے نکل کر اس گول جھونپڑی کی جانب
چل پڑا۔ وہ لڑکی مجھے عجیب سی محسوس ہوئی۔ یہاں کسی نہ کسی سے تو شناسائی ضروری ہے
اگر اس کے ساتھ کچھ وقت گزر جائے تو کم از کم تنہائی کا یہ احساس تو ختم ہوجائے گا۔ گول
جھونپڑی کا دروازہ اندر سے بند تھا لیکن کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی چند لمحات میں وہاں
کھڑا رہا اور اس کے بعد مایوسی کے انداز میں وہاں سے واپس پلٹ پڑا۔ اب میں اس

آبادی کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ تقریباً ڈیڑھ سو جھونپڑیاں تھیں گویا ایک بھرپور آبادی تھی۔ اندر اور باہر عورتیں ننگ دھڑنگ بچے ہر عمر کے اور ہر سائز کے گروپوں میں بٹے مختلف کھیل کھیل رہے تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کی چیخیں نکل گئیں۔ ان چیخوں میں ڈر بھی تھا اور حیرت بھی۔ وہ سب کے سب کھیل چھوڑ کر ایک گروہ کی شکل میں مجھے دیکھنے لگے۔ عورتوں نے بھی کام چھوڑ دیا اور جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے۔ وہ بھی مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ میں چند لمحات ان کے درمیان کھڑا رہا اور اس کے بعد مسکراتا ہوا ان کی جانب بڑھا تو ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چیختے چلاتے اپنے جھونپڑوں کی جانب بھاگے یا اپنی ماؤں سے لپٹ گئے۔ میرے قدم رک گئے اور میں نے ایک پُرامید مسکراہٹ عورتوں کی طرف اچھالی لیکن ان کے چہروں کے انداز بھی نہ بدلے البتہ انہوں نے اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے خوف محسوس نہیں کر رہی ہیں البتہ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں میری یہ خوش اخلاقی میرے لئے مصیبت نہ بن جائے۔ تھوڑی دیر تک میں وہاں کھڑا رہا اور اس کے بعد میں اپنی جھونپڑی کی طرف بوجھل قدموں سے چل پڑا۔ دھوپ میں تمازت پھیلی ہوئی تھی اور بدن میں جابجا سوئیاں سی چبھتی محسوس ہو رہی تھیں چنانچہ جھونپڑی کی طرف جانے کے بجائے میں نے اپنا رخ جھیل کی طرف کردیا تاکہ ٹھنڈے پانی میں نہا کر اس گرمی کی شدت کو دور کروں۔ میں جھیل میں داخل ہوگیا اور دیر تک اس میں تیرتا رہا پھر جب میں نے پانی کی سطح سے گردن اٹھائی تو بے شمار بچوں کو جھیل کے کنارے کھڑا پایا وہ سب مجھے دیکھ رہے تھے لیکن جیسے ہی میں نے ان کی جانب دیکھا انہوں نے دوڑ لگادی تھی۔ میں نے گردن جھٹکی اور جھیل سے باہر نکل آیا بچے کہیں بھی ہوں کیسے بھی ہوں۔ بچے ہی ہوتے ہیں......... معصوم معصوم پیارے۔ حالانکہ یہ گندے اور غلیظ بچے اس قابل نہیں تھے کہ انہیں منہ لگایا جائے لیکن انسان ہمیشہ سے بچوں کے سامنے کمزوری کا شکار رہا ہے۔ میں دور تک انہیں بھاگتے ہوئے دیکھتا رہا اور پھر واپس نکل کر اپنی جھونپڑی میں آگیا۔ اس رات سردار نے پھر مجھ سے میری جھونپڑی ہی میں ملاقات کی تھی۔ وہ تنہا ہی آیا تھا اور اس کے چہرے پر ایک مکارانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"ہیلو!" وہ بہت آہستہ سے بولا۔

"ہیلو سردار۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں محسوس کر رہے ہوگے۔"

"نہیں تمہاری مہربانیوں سے مجھ ہر طرح کی آسائش حاصل ہے۔"

"اور جو کچھ بھی تم چاہو گے تمہیں مہیا کردیا جائے گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا تمہیں ہر قیمت پر میرا کام کرنا ہے۔ تمہاری زندگی کا مقصد ہی یہی ہے۔"

"میں جانتا ہوں سردار مجھے بار بار اس کا احساس کیوں دلاتے ہو؟"

"صرف احساس نہیں بلکہ تمہیں جس قدر جلد ممکن ہو اس کام کا آغاز کردینا چاہئے۔ مجھے اپنی ضرورتیں بتاؤ تم جس طرح بھی پسند کرو گے تمہیں یہاں زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے گی اور جب یہاں سے جانا چاہو گے تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی لیکن یہ سب کچھ اس وقت ہوگا جب میرے مقصد کی تکمیل ہوجائے گی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تمہارے مقصد کی تکمیل کے لئے فوراً مصروف ہوجاؤں۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اس لڑکی کے بارے میں مختصر تفصیل بتائے دیتا ہوں لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ تم اسے کسی قسم کا کوئی ایسا نقصان نہیں پہنچاؤ گے جس سے اس کی نسوانیت مجروح ہوجائے۔"

"تب پھر سردار اس سے رابطہ کیسے قائم کرسکوں گا؟"

"دھوکا دے سکتے ہو اسے۔ فریب کرسکتے ہو اس کے ساتھ لیکن خیال رہے جو کچھ میں نے کہا ہے وہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا تمہیں دوسرا کام کرنا۔"

"وہ کہاں رہتی ہے؟"

"تمہارے جھونپڑے کے عقب ہی میں اس کی جھونپڑی ہے لیکن ذرا فاصلے پر۔"

"گول جھونپڑی؟" میں نے بے اختیار کہا اور سردار نے مسکراتے ہوئے گردن ہلادی۔

"ہاں وہی ہے تمہیں اسی لڑکی کا شکار کرنا ہے۔"

میرے ذہن میں بہت سے سوالات مچل اٹھے۔ اس لڑکی نے تو مجھے بہت متاثر کیا تھا اور میں اس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا تھا وہی بدنصیب لڑکی میرے ہاتھوں موت کا نشانہ بننے والی ہے لیکن سردار سے کوئی سوال کرنا زبردست حماقت تھی۔ وہ مجھ پر اتنا ہی مہربان ہوگیا۔ مجھے یہ اسرار بہت پریشان کرنے لگا۔ سردار زیادہ دیر تک میرے پاس نہیں رکا تھا۔ وہ مجھے چند ہدایات دینے کے بعد خاموشی سے باہر واپس نکل گیا لیکن میرے لئے وہ بہت سی پریشانیاں چھوڑ گیا تھا۔ دل ہی دل میں میں نے ان حالات پر غور کیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہاں اس سردار کے علاوہ میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ مجھے انتہائی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا کہ کہیں بھی لرزش ہوئی تو موت مجھ سے زیادہ دور نہیں ہے۔ یہ تمام خیالات بے حد پریشان کن تھے لیکن ان کا کوئی حل نہیں تھا میرے پاس۔ میں سونے کے لئے

لیٹ گیا۔ ذہن کو ان الجھنوں سے آزاد کرنے کا یہی ایک ذریعہ تھا کہ سو جاؤں لیکن صبح کو اس وقت آنکھ کھل گئی جب پوری طرح دن بھی نہیں نکلا تھا۔ چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ باہر نکل کر میں نے دور دور تک نگاہیں دوڑائیں اور اس گول جھونپڑی کے بارے میں سوچتا رہا۔ پرندے اپنے آشیانوں سے ابھی نہیں نکلے تھے اس لئے ان کی آواز فضا میں نہیں رچی ہوئی تھی البتہ کہیں کہیں جھینگر یا جھیل سے اٹھنے والی مینڈک کی آواز سنائی دے جاتی اور اس کے بعد چاروں طرف خاموشی پھیل جاتی۔ آہستہ آہستہ وقت گزرنے لگا۔ دور سے یہ جھونپڑیاں بڑے بڑے دھبوں کی سی شکل میں نظر آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں جگار ہو گئی تھی اور کسی بچے کے رونے کی ایک آدھ آواز ابھر آتی۔ میں دیر تک کھڑا صبح کے ستاروں کو ڈوبتے دیکھتا رہا۔ درختوں کے پتوں کے درمیان ہوا سرسرا رہی تھی اور میرے ذہن میں عجیب و غریب کیفیات پیدا ہو رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے دل چاہا کہ اسی وقت جا کر گول جھونپڑی میں رہنے والی لڑکی کا خاتمہ کر دوں اور اس کے بعد سمندر کے راستے اپنی دنیا میں واپس لوٹ جاؤں۔ ابھی میں انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ دفعتاً عقب سے سرسراہٹ سنائی دی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میری توقع کے بالکل خلاف تھا۔ وہ ایک نسوانی بدن ہی تھا جس نے بے اختیارانہ انداز میں آگے بڑھ کر میری گردن پر ایک نوکدار چیز رکھ دی تھی۔ میں سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ جو چیز میری گردن سے لگی ہے۔ وہ خنجر کی نوک ہے لیکن میں فوراً ہی کوئی ایسی کارروائی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے خاموشی اختیار کی۔
پھر جب وہ میرے سامنے آئی تو میں حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔ یہ وہی لڑکی تھی جس کے لئے مجھے متعین کیا گیا تھا اور جسے میں دیکھ چکا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا قرب میرے لئے مدہوشی کا باعث بن گیا۔ اس کے بدن سے ایک انجانی سی مہک اٹھ رہی تھی جیسے مختلف پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہو۔ لڑکی میرے بالکل قریب کھڑی تھی۔ میں اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ نہیں لے پا رہا تھا۔ دفعتاً اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا اور اپنی حسین آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ چند لمحات اسی طرح دیکھتی رہی اور اس کے بعد خاموشی سے واپس چلی گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟ اس طلسم کدے میں کیا ہو رہا ہے؟ کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا میں۔ لڑکی خنجر لے کر آئی تھی تو اس کا کیا مقصد تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ اس کا کیا مطلب تھا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر دن نکل آیا اور میں جھونپڑے سے کچھ فاصلے پر جا کر واپس جھونپڑے میں آ گیا۔ ایک لڑکی صبح میرے لئے ناشتہ لے آئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوا ہی

تھا کہ سردار میرے پاس پہنچا اور پھر اس نے مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھا۔
"کیا ہو رہا ہے؟ کیا تمہاری اس سے ملاقات ہوئی۔"
"ہاں۔ وہ آئی تھی اور اس کے بعد اس نے اچانک ہی میری گردن پر خنجر رکھ دیا۔ میں نہیں سمجھ پایا سردار کہ اس کا کیا مطلب تھا۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔" سردار آہستہ سے مسکرا دیا پھر اس نے سنجیدہ ہو کر کہا۔
"سنو وہ اپنی حفاظت کرنا جانتی ہے شاید اسے اس بات کا شبہ ہو کہ کہیں تم میرے آلہ کار نہ بن جاؤ۔ تمہاری زندگی کا کوئی مقصد تو ضرور ہو گا۔ لوگ یہ سوچ سکتے ہیں لیکن اس کے پاس خنجر کہاں سے آیا۔ کیا تم کسی طرح اس سے وہ خنجر لے سکتے تھے؟"
"نہیں سردار میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا جو تمہاری مرضی کے خلاف ہو۔"
"ہوں۔ کیا تم یہ نہیں کر سکتے کہ رات کو اس کی جھونپڑی میں جا کر سوتے میں اس کی گردن دبا دو۔" سردار اچانک بولا۔ پھر کہنے لگا۔ "مجھے خدشہ ہے کہ کہیں تم اس سے متاثر نہ ہو جاؤ اور وہ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دے۔" میں خاموشی سے سردار کی یہ گفتگو سنتا رہا پھر اس کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔
"بہرطور یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ جس طرح بھی تم چاہو اسے ہلاک کرو لیکن یہ تمہیں کرنا ہے اور دوسروں کے علم میں لائے بغیر۔" دل چاہا کہ سردار سے پوچھوں کہ اس معمولی لڑکی کی زندگی سے سردار کو اتنا خوف کیوں ہے لیکن جانتا تھا کہ یہ بات خطرناک ہو گی۔ سردار پُراسرار لہجے میں بولا۔
"جب تم اس کا گلا دبا دو گے یا خنجر سے اسے قتل کر دو گے اور کسی کو تمہارے بارے میں پتا نہیں چلے گا تو یوں سمجھو کہ تمہاری تمام مشکل آسان ہو جائے گی۔"
"میرے فرار ہونے کا کیا بندوبست ہو گا سردار.........."
"تمہیں اس سلسلے میں فکر نہیں کرنی چاہئے جس طرح بھی ممکن ہو گا ہم تمہارے فرار کا بندوبست کر دیں گے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اب سے تھوڑی دیر کے بعد میں اپنے دو آدمیوں کو بھیجوں گا اور ان کے ذریعے تمہیں اپنی جھونپڑی میں بلاؤں گا تم تیار رہنا مجھے تم سے مزید کچھ گفتگو کرنی ہے۔" سردار چلا گیا۔ اور اس کے کہنے کے مطابق تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں آدمی میرے پاس پہنچ گئے جنہوں نے اشاروں کی زبان میں مجھے بتایا کہ سردار مجھے طلب کرتا ہے۔ میں ان کے ساتھ چل پڑا دونوں آدمی مجھے سردار کے جھونپڑے کے باہر چھوڑ کر واپس چلے گئے۔ جب میں اندر پہنچا تو سردار اکیلا بیٹھا تھا۔ جھونپڑے کے ایک کونے میں سرکنڈوں کا چھوٹا سا دروازہ تھا جس کی دوسری طرف کا کوئی

پتا نہیں تھا۔ میں سردار کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے بڑا سا ایک لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا سردار نے اپنی جگہ سے اٹھ کر صندوق کو آہستہ سے سرکایا تو اس کے نیچے ایک گڑھا نظر آیا جس پر صندوق کے پیندے کے سائز کی ایک چٹائی بھی بچھی ہوئی تھی۔ چٹائی کے نیچے پتھر کی ایک سل تھی۔ سردار نے اسے بھی اٹھاکر ایک طرف رکھا اور گڑھے میں ہاتھ ڈال کر کوئی چیز نکالی۔ جب میں نے اس چیز کو دیکھا تو یہ ایک باقاعدہ لباس تھا۔ جس میں کپڑوں کا ایک شاندار جوڑا اور ایک چمڑے کی جیکٹ تھی۔ اس نے یہ چیزیں مجھے دکھائیں اور آہستہ سے بولا۔

"یہ تمہارے لئے ہیں تاکہ تم جب یہاں سے فرار ہو کر سمندر میں جاؤ اور کشتی میں سفر کرو تو کوئی جہاز تمہیں غیر مہذب انسان نہ سمجھے۔ میرے پاس مزید بندوبست بھی ہے۔" اس نے پھر گڑھے میں ہاتھ ڈال کر ایک دوربین نکالی اور مجھے دکھا کر وہیں رکھ دی۔ اس کے بعد ایک ریوالور نکال کر دکھایا جس کے ساتھ اس کی گولیوں کا ایک بڑا پیکٹ بھی تھا اور آخر میں ایک صندوقچی نکالی اسے کھولا تو اس میں سونے کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے اور بہت سے ہیرے تھے۔ ان ہیروں کی چمک نے میری آنکھوں کو چکاچوند کردیا تھا۔ سردار نے یہ تمام چیزیں واپس گڑھے میں رکھ دیں اور پھرتی سے اس کا پتھر سل اور چٹائی رکھ کر صندوق اس پر اس طرح جما دیا کہ چٹائی نظر نہ آئے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا۔

"میں نے یہ سب کچھ تمہارے لئے محفوظ کیا ہے اور میرے خیال میں یہ کم نہیں ہے۔ ایک معمولی سے کام کے عوض اتنا بڑا اعزاز۔ ان تمام چیزوں سے تم اپنی دنیا میں ایک بہترین زندگی گزار سکتے ہو۔" میں نے سردار کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس مسکراہٹ میں ایک مکاری پوشیدہ تھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ تمام چیزیں سردار کے پاس کہاں سے آگئیں اور وہ کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ کافی دیر تک میں اپنی جھونپڑی میں بیٹھا سردار کی پُراسرار شخصیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ سردار نے ان چیزوں کو بڑی احتیاط سے گڑھے میں چھپا رکھا ہے لیکن یہ اس کے پاس کہاں سے آئیں؟ وہ کیا ہے؟ انگریزی زبان وہ کیسے بول سکتا ہے؟ بہرطور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ تمام چیزیں اس وقت مجھے دے دی جائیں گی جب میں اپنا کام کرلوں۔ پتا نہیں لڑکی کی موت سے اس بدبخت سردار کا کیا تعلق ہے بہرطور وقت گزارنے کے لئے اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ سوجاؤں۔ کم از کم سونے سے بہت سی الجھنیں تو ختم ہوجاتی تھیں۔ میں سو کر اٹھا تو میرا کھانا رکھا تھا لیکن اس وقت کھانے کو دل نہیں چاہ

رہا تھا پھر شام ڈھل گئی۔ مغرب گزر گئی اور رات آگئی۔ تارے جھونپڑی کی چھت کے سوراخوں سے جھانکنے لگے اور میں رات گہری ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جب رات کافی گہری ہوگئی تو میں چپکے سے اٹھ کر پچھلے دروازے سے باہر نکل آیا۔ چند ساعت کھڑا ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے شبہ تھا کہ سردار میری ٹوہ میں ہوگا اور میں سردار کو دیکھنے کے لئے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف کا جائزہ لیتا رہا لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد میں نے گول جھونپڑی کی جانب رخ کیا۔ میں جانتا تھا کہ میں جھونپڑی کا دروازہ تلاش نہیں کرسکوں گا اس لئے اس پر ہاتھ سے دباؤ ڈالتا ہوا قدم قدم آگے بڑھتا رہا۔ نصف گولائی میں نے طے کرلی تھی لیکن دروازہ ہاتھ نہیں لگا۔ پھر میں بڑے اضطراب بڑی الجھن کے عالم میں پریشان انداز میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا کہ اچانک جھونپڑی ایک جگہ سے کھل گئی۔ دوسرے لمحے اس میں سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور مجھے بالوں سے پکڑ کر پوری قوت سے اندر گھسیٹ لیا گیا۔ یہ سب کچھ میرے لئے غیر متوقع تھا۔ میں کھلے دروازے سے جھونپڑی کے اندر جا پڑا لیکن میرے کوئی چوٹ نہیں لگی کیونکہ میرے گھٹنوں اور کہنیوں کے نیچے موٹی موٹی خاص قسم کی گھاس بچھی ہوئی تھی میں نے اپنے سے چند فٹ کے فاصلے پر اسی حسین لڑکی کو دیکھا۔ وہ مسکراتی نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں ابھی حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا۔ لڑکی نے آہستہ آہستہ کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو لیکن میں تمہارے ارادوں کو بدلنے کی خواہشمند ہوں۔" یہ لڑکی بھی صاف ستھری انگریزی بول رہی تھی۔ میری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں میں نے ازراہ ظرافت سوچا کہ کہیں کل یہ سارا قبیلہ ہی انگریزی نہ بولنے لگے اور اس کے بعد اپنے جھونپڑوں سے پتلونیں اور قمیضیں نکال کر نہ پہن لے۔ یہ سب کچھ میرے لئے انتہائی حیرت انگیز تھا۔ دفعتاً ہی مجھے سردار کا خیال آیا۔ مجھے شبہ تھا کہ سردار ہر وقت میری نگرانی کرتا رہتا ہے۔ میں نے لڑکی کے مزید کچھ بولنے سے قبل ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کردیا اور پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"سردار۔" لڑکی بھی ایک دم ساکت ہوگئی تھی۔ میں بہت احتیاط سے اٹھا۔ جھونپڑی سے باہر نکل کر میں نے چاروں طرف جھانکا لیکن قرب وجوار میں کوئی موجود نہیں تھا چنانچہ میں واپس اندر آگیا۔ چند لمحات کے بعد میں نے لڑکی سے کہا۔

"تم۔ تم انگریزی بول رہی ہو؟"

"ہاں۔ تمہیں یقیناً اس بات پر حیرت ہوئی ہوگی لیکن میری کہانی سنو گے تو پھر

تمہیں یہ حیرت نہیں رہے گی۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ اس داستان کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے وہ وقت بہت جلد آئے گا جب میں تمہیں کچھ بتا سکوں گی اس وقت صرف اتنا ہی سنو کہ میں ایک مظلوم اور بے بس لڑکی ہوں جو ان انسان نما درندوں میں گھری ہوئی ہے۔ وہ شخص جسے تم سردار کہتے ہو تمہیں کبھی یہاں سے زندہ سلامت نہیں جانے دے گا۔ وہ ترکیب صرف میرے پاس ہے جس کے ذریعے تم اپنی جان بچا سکو گے اور میری بھی۔ اگر تم میری مدد کرو اور تمہیں اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی ہو تو تمہیں اس سردار کو قتل کرنا ہوگا اور اس کے لئے تمہارے یہاں سے فرار کی ذمہ داری میں قبول کرتی ہوں مجھے اپنے ساتھ یہاں سے لے جانا۔ جہاں دل چاہے چھوڑ دینا یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہوگا۔ میں اپنے ساتھ اتنی دولت لے چلوں گی کہ تمہاری ساری زندگی عیش سے گزرے گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ بس مجھے یہاں سے نکال دو اس جگہ سے مجھے نکال دو۔" میں حیرت زدہ انداز میں لڑکی کی صورت دیکھ رہا تھا۔ سردار نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا اور لڑکی بھی یہی چاہتی تھی اور شاید دونوں ہی یہ بات سمجھتے تھے کہ میں کسی بھی وقت کسی کے بھی جال میں پھنس سکتا ہوں اور ان کی زندگی کا دشمن بن سکتا ہوں لیکن یہ سب کچھ ہے کیا۔ اس کا مقصد کیا ہے؟ لڑکی نے میری کشمکش پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اس سلسلے میں پریشان ہو کہ اسے کس طرح سے ٹھکانے لگاؤ گے تو میں تمہیں اس کی ترکیب بتا سکتی ہوں۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ تمہاری جھونپڑی میں آتا رہتا ہے میں تمہیں ایک خنجر دوں گی تم اس خنجر سے اسے جہنم رسید کر دو اور اس کے بعد میرے پاس پہنچ جاؤ۔ جب تک ہم یہاں سے فرار ہوں گے کسی کو سردار کی موت کا علم نہیں ہوگا کیونکہ وہ کافی دیر تک تنہا کہیں نہ کہیں وقت گزار دیتا ہے۔ میں نے یہاں سے فرار ہونے کا سارا بندوبست کر رکھا ہے اور میں یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں۔ ہم اتنی دور نکل جائیں گے کہ وہ لوگ ہمیں تلاش نہیں کر پائیں گے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ براہ کرم اب کوئی اور سوال مت پوچھنا اور ایک بات اچھی طرح یاد رکھو اگر تم نے میری بات پر عمل نہ کیا تو بالآخر موت کا شکار ہو جاؤ گے۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کسی قیمت پر نہیں چاہے گا کہ کوئی اس علاقے سے باہر نکل جائے۔ سمجھے' براہ کرم اب تم جاؤ۔ تمہارا زیادہ دیر تک یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔" میں لڑکی کو بتانا چاہتا تھا کہ خود سردار نے مجھے اس کے قتل پر مامور کیا ہے لیکن نہ جانے کیوں میں اس سے یہ الفاظ نہ کہہ سکا۔ البتہ اب میرے لئے یہاں سے نکل جانا بے حد ضروری تھا۔

چنانچہ میں خاموشی سے وہاں سے نکل آیا میرے دماغ پر ہتھوڑے برس رہے تھے۔ یہ چکر کیا ہے آخر قتل.......... قتل سردار لڑکی کو قتل کرانا چاہتا ہے اور لڑکی سردار کے قتل کی خواہش مند ہے۔ دونوں ہی نے مجھے اپنا آلۂ کار چنا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہیں؟ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سب کیا ہے بہرطور مجھے بہت غور وخوض کر کے فیصلہ کرنا تھا کہ اگر قتل کرنا بھی پڑے تو دونوں میں سے کسے قتل کروں۔ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ سردار کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مکارانہ مسکراہٹ مجھے اس بات کا احساس دلاتی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ لڑکی کے قتل کے بعد وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو جائے۔ بھلا یہ کام اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ مجھ پر لڑکی کے قتل کا الزام لگا دے اور کہے کہ اس نے مجھ پر اتنے احسانات کئے مجھے زندگی دی اور میں نے اسی کے قبیلے کی ایک لڑکی کو قتل کر دیا۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر کام کرنا تھا۔ بہت کچھ سوچ سمجھ کر۔ ورنہ موت زیادہ دور نہیں تھی۔ مجھے ہر لمحے اس کی آہٹ کان کے قریب سنائی دیتی تھی۔ اول تو یہ سب کچھ میرے لئے بہت عجیب تھا کہ میں یہاں آ کر ان میں سے کسی کو قتل کر دوں۔ لیکن اگر فرض کیجئے میں اس قتل کا فیصلہ کر بھی دیتا ہوں تو کس کی پیشکش کو قبول کروں اور کس کی جان لوں۔ کبھی لڑکی کے بارے میں سوچتا تو مجھے احساس ہوتا کہ وہ کوئی مظلوم لڑکی ہو اور کبھی سردار کی باا ثر شخصیت مجھے متاثر کرنے لگتی۔ میں صرف اپنا تحفظ چاہتا تھا۔ دوسرا دن بڑا پریشان کن گزرا میں نے سارا وقت جھونپڑی میں رہ کر ہی گزارا تھا میرا ذہنی خلفشار بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ شام آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی میں جانتا تھا کہ اب سردار بھی مجھ سے ملاقات کرے گا اور وہ لڑکی بھی۔ ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ کہ کیوں نہ لڑکی سے خنجر لے کر رکھ لوں اور اس کی گردن دبا کر اسے ہلاک کر دوں۔ یہ خنجر کس کا ہے۔ سردار کو بھی اس کا علم نہیں ہوگا لیکن یہ بہت سی جگہ میرے کام آ سکتا ہے۔ مجھے اس لڑکی سے کیا واسطہ اگر وہ مظلوم ہے بھی تو یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔ وہ بڑی صاف انگریزی بول رہی تھی۔ جس کا مقصد ہے کہ اس کا تعلق بھی کم از کم اس سرزمین سے نہیں ہے اور یہی کیفیت شاید سردار کی تھی۔ بہرطور وقت گزرتا رہا۔ اس رات میں اپنے جھونپڑے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ کافی رات گزر گئی تو دفعتاً میرے جھونپڑے سے باہر آہٹ سنائی دی۔ میرا خیال تھا کہ سردار آیا ہوگا لیکن لڑکی کو دیکھ کر میں ششدر رہ گیا۔ اس نے اپنے لباس سے ایک خنجر نکال کر مجھے پیش کیا تو میں نے اس سے ڈرتے ہوئے سوال کیا کہ کہیں سردار وغیرہ نے اسے دیکھ نہ لیا ہو کیونکہ وہ لوگ اس کی تاک میں رہتے ہیں۔

"نہیں یہ ممکن نہیں ہے۔ سردار نشہ آور مشروب استعمال کرنے کا عادی ہے اور رات کے اس حصے میں وہ اپنے ہوش میں نہیں ہوتا۔ تم اسے نہیں جانتے۔ اس نے اس پورے قبیلے کو الو بنا رکھا ہے۔ وہ بے حد چالاک اور مکار ہے۔ قبیلے بھر میں کوئی بھی اس کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔ سب اس سے ڈرتے بھی ہیں اور اس کے وفادار بھی ہیں۔"

"ایسی صورت میں کیا میری یہ کوشش ناکام نہیں ہوجائے گی؟ سردار کی ہلاکت کی خبر سنتے ہی سب کے سب شکاری کتوں کی طرح میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

"میں نے یہ تمام باتیں پہلے ہی سوچ رکھی ہیں۔ تمہیں گھبرانا نہیں چاہئے۔ میں......... میں تمہیں ہر طرح سے محفوظ رکھوں گی۔ چاہے اس کے لئے مجھے اپنی زندگی کیوں نہ قربان کرنی پڑے۔" لڑکی نے یقین دلانے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا اور میں داہنا گال کھجاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔ پھر میں نے کہا۔

"لیکن اس کے لئے وقت کی کوئی قید تو نہیں ہے؟"

"نہیں تم اپنی آسانی سے یہ کام کرلو لیکن جتنی جلد یہ ہو جائے ٹھیک ہے۔ کیونکہ گزرنے والے لمحات کہانی میں تبدیلی بھی پیدا کرسکتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے تمہارا یہ خنجر میرے پاس تمہاری امانت کے طور پر محفوظ ہے۔ میں اس سے اپنا کام کرنے کے بعد ہی تمہیں اس بارے میں اطلاع دوں گا۔" وہ جس طرح آئی تھی اس طرح باہر واپس نکل گئی اور میرے لئے پھر وہی پریشانی کے لمحات پیدا ہوگئے۔ مجھے کوئی صحیح فیصلہ کرنا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ بہرطور سردار کی زندگی لینے سے پہلے کم از کم میں اس راز کو جاننا چاہتا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سردار کیوں اس لڑکی کے قتل کے درپے ہے اور لڑکی کیوں سردار کی زندگی لینا چاہتی ہے۔ ہوسکتا ہے سردار کی جھونپڑی میں مجھے کچھ ایسی چیزیں مل جائیں جن سے یہ بات مجھے معلوم ہوسکے کہ ان دونوں کے درمیان نفرت کا وہ کون سا رشتہ قائم ہے۔ بہرطور اب مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ کب اور کس وقت میں سردار کی جھونپڑی کی تلاشی لے سکتا ہوں۔ میں اس کے لئے کوششوں میں مصروف ہوگیا۔

اس دن تو کوئی داؤ نہ چل سکا لیکن دوسرے دن صبح ہی صبح میں نے سردار کو اپنے چند آدمیوں کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے وہ خاص مشیر بھی اس کے ساتھ تھے جو ہر وقت ہی اس سے چپکے رہتے تھے۔ میں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ سردار کہاں جارہا ہے اور مجھے اس کا اندازہ ہوگیا کہ سردار یقیناً کسی لمبے ہی پروگرام پر جارہا تھا۔ کیونکہ سردار کی طرف سے مجھے اب کافی مراعات مل چکی تھیں اور لوگ میری

جانب توجہ نہیں دیتے تھے۔ چنانچہ میں موقع پاکر اس کی جھونپڑی کے قریب پہنچ گیا اور پھر اس کے عقبی راستے سے اندر داخل ہوگیا۔

یہاں آکر میں نے ایک لمحہ ضائع نہیں کیا کم از کم مجھے یہ اندازہ تھا کہ سردار اپنی خاص چیزیں کہاں چھپا کر رکھتا ہے۔ چنانچہ میں جھونپڑی کے اس حصہ میں پہنچ گیا جہاں موجود گڑھے کو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر صندوق کو چٹائی پر سے ہٹایا اور پھر پتھر کی سل اٹھا کر گھٹنوں کے بل نیچے جھک گیا۔ وہ تمام اشیاء وہاں موجود تھیں جو سردار نے مجھے دکھائی تھیں لیکن وہ چیزیں بھی مل گئیں جو میری طلب ہوسکتی تھیں۔ یہ ایک ڈائری تھی۔ سردار کی اس جھونپڑی میں ان چیزوں کا وجود ہی حیرت انگیز تھا کہ ڈائری بھی نظر آگئی۔ میں نے پھرتی سے ڈائری اپنے قبضے میں کرلی اور باقی تمام چیزیں اسی طرح رکھ کر گڑھا بند کردیا۔ اس کے بعد میں برق رفتاری سے وہاں سے نکل آیا اور جھیل کے کنارے کنارے کافی دور چلتا چلا گیا۔ جب بہت دور نکل آیا تو کھجوروں کے ایک جھنڈ میں بیٹھ کر میں نے ڈائری کھولی۔

ڈائری کیا کھلی گویا انکشافات کے باب کھل گئے۔ سردار مقامی نہیں تھا۔ وہ پرتگالی ماں اور امریکن باپ کی اولاد تھا بچپن ہی سے اس نے جرائم کی زندگی اپنالی تھی۔ پھر اس کے ہاتھوں کئی قتل بھی ہوئے اور اس کے بعد اس نے ایک ڈیوک کی بیٹی کو اغوا کیا تھا اور اسے لے کر فرار ہوگیا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی لیکن وہ پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔ لڑکی کو اس نے قیدی بنا کر رکھ چھوڑا اور پھر اسی لڑکی کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام ایشل رکھا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مکلینو کا طرز زندگی بدلتا چلا گیا۔ مکلینو اسی سردار کا اصل نام تھا اس نے جرم کی زندگی کسی طور کم کردی اور دوسرے کاروبار کرنے لگا۔ چوری کے مویشی اور اسلحہ اسمگل کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس وقت ایشل دس سال کی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کا سودا ایک دولت مند آدمی سے کردیا لیکن اس کی بیوی نے احتجاجاً خودکشی کرلی تھی۔

ایشل ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت آگے تھی۔ سب دیکھتی تھی اور سمجھتی تھی۔ اس کے دل میں باپ کے خلاف نفرت پیدا ہوگئی۔ اس کی دنیا آج تک پہاڑوں اور کھنڈرات تک محدود رہی تھی اور ان پہاڑوں سے نکلنے کے تمام راستے بند تھے لیکن ایک روز پولیس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا اور مکلینو ایشل کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر مختصر سے سامان کے ساتھ بھاگ نکلا وہ کئی راتوں تک مسلسل سفر کرتا رہا۔ دن میں کہیں چھپا رہتا اور راتوں کو سفر کرتا۔ پھر وہ

ایک ساحلی علاقے میں نکل آیا اور یہاں سے ایک مال بردار جہاز کے کپتان کو بھاری رشوت دے کر جہاز میں سوار ہو گیا۔ کئی دن تک جہاز کا یہ سفر جاری رہا اور اس کے بعد وہ یہاں پہنچ گیا۔ اس نے اس علاقے کو اپنی سکونت کے لئے منتخب کیا۔ گمنام دنیا کے سارے خطرات سے وہ آگاہ تھا اور ان سے نمٹنے کے لئے انتظامات کر کے چلا تھا۔ غالباً اس کا یہی منصوبہ تھا کہ کسی ایسے پُراسرار گوشے میں قیام کرے گا جہاں قانون اس کی گردن نہ پکڑ سکے۔

چنانچہ سب سے پہلے اس نے یہاں اپنے قدم جمانے کے لئے انتظامات شروع کر دیئے۔ اس نے دور دور تک درختوں میں ایسے اسپیکر نصب کئے جو وائرلیس سے کنٹرول ہوتے تھے اور اس کے بعد اپنے چھپنے کے لئے بھی ایک جگہ تلاش کر لی۔ ایشل کو بھی اس نے اپنے ساتھ ہی پوشیدہ کر لیا تھا۔ پھر جب مقامی باشندے اس طرف سے نکلے تو ان اسپیکروں کے ذریعے اس نے انہیں پیغام دیا کہ یہاں اس علاقے میں ایک دیوتا آسمان سے اترنے والا ہے جس کے ہاتھ میں بے پناہ قوتیں ہیں۔ وہ ان کی تقدیروں کا مالک ہے اور وہ اس کے استقبال کے لئے تیار ہو جائیں۔

یہ آواز سیدھے سادے مقامی باشندوں کے لئے بڑی حیرت انگیز تھی۔ وہ کئی دن تک انہیں یہ آوازیں سناتا رہا اور اپنے پیغامات انہیں دیتا رہا۔ مکلینو کے اندر لاتعداد صلاحیتیں پوشیدہ تھیں۔ وہ مقامی زبان بول سکتا تھا جس کی وجہ سے اسے مزید آسانیاں حاصل ہوں گی۔ پھر اس نے مقامی باشندوں کو آخری اطلاع دی اور اپنی آمد کے دن کا تعین کر دیا۔

اور جب وہ ایشل کے ساتھ برہنہ بدن ان کے درمیان وارد ہوا تو مقامی باشندے اس کے سامنے سجدے میں گر گئے انہوں نے اسے اپنا دیوتا تسلیم کر لیا۔ مکلینو بہت چالاک تھا اس نے چند ہی دن میں ان پر اپنا سکہ جما لیا اور یہاں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہو گیا لیکن ایشل اس سے اب بھی نفرت کرتی تھی۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی اس کی نفرت پروان چڑھتی گئی۔ اس نے اپنی ماں کا انتقام لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مکلینو بیوقوف نہیں تھا وہ یہ بات محسوس کرتا تھا کہ ایشل اسے ناپسند کرتی ہے۔ ایشل نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اگر اسے کہیں بھی اس کی مرضی کے خلاف مجبور کیا گیا تو وہ اس کا راز کھول دے گی۔ اس طرح مکلینو ایشل کے وجود سے خوفزدہ رہنے لگا۔ اسے ہمیشہ ہی یہ خوف رہتا کہ کہیں ایشل کا منہ نہ کھل جائے۔ وہ ایشل کی زندگی کے درپے ہو گیا۔

لیکن یہ بات بھی اس کے ذہن میں تھی کہ ایشل اس کے ساتھ آئی ہے اگر وہ اے اپنی مرضی سے قتل کرے گا تو مقامی باشندے حیران ہو جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ وہ ایشل کے قتل کو تسلیم نہ کریں۔

صورتِ حال اب میری نگاہوں میں مکمل طور پر واضح ہو گئی تھی۔ یہ دونوں باپ بٹی تھے لیکن ایک دوسرے کے دشمن' مجھے اب یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مجھے کس کا ساتھ دینا ہاہئے اور اس کے لئے میں نے بہت غور و خوض کیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ مجھے مکلینو کا نصہ پاک کر دینا چاہئے اور ایشل کو اپنے ساتھ لے جا کر مہذب دنیا میں چھوڑ دینا ہاہئے۔ میرے دل میں واقعی مظلوم ایشل کے لئے گنجائش پیدا ہو گئی تھی۔

بہرطور یہ دن میں نے بڑے اضطراب میں گزارا۔ شام کو کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ سردار پتا نہیں کب واپس آیا لیکن اسے میری اس کوشش کا کوئی احساس نہیں ہو سکا تھا۔ وہ خاموشی سے میرے عمل کا انتظار کر رہا تھا لیکن میں دوسرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا شام کا ہلکا پن رات کے اندھیروں میں تبدیل ہو گیا تو میں اپنی جھونپڑی میں بیٹھ کر آنے والے وقت کے بارے میں غور کرنے لگا۔ مجھے ایشل کا انتظار تھا۔ میں اسے بتانا ہاہتا تھا کہ اب تمام حقیقتیں مجھ پر کھل گئی ہیں اور میں نے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرلیا ہے۔ رات کا کھانا بھی میں نے مختصر ہی سا کھایا۔ طبیعت پر ایک عجیب سی کیفیت لاری تھی۔ نہ جانے میں کیسی کیسی کیفیتوں کا شکار تھا رات گہری ہو گئی۔ میں ایشل کا نظار کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ آئے گی۔ سردار کی طرف سے ابھی نک مجھ سے کوئی باز پُرس نہیں کی گئی تھی۔ غالباً وہ انتظار کر رہا تھا اس بات کا کہ میں پنے مقصد کی تکمیل کر لوں اور اس تکمیل کے لئے مجھے آزاد چھوڑ دیا گیا تھا۔ سوچنے کے لئے میرے پاس بہت کچھ تھا۔ سردار بار بار مجھے یہ ہدایت کرتا رہا تھا کہ میں اس کی سے کوئی اور رشتہ قائم کرنے کی کوشش نہ کروں۔ اس کی کیفیات کا مجھے بخوبی ندازہ ہو چکا تھا۔

بہرطور ایشل کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ رات کے کسی حصے میں مجھ سے لنے ضرور آئے گی اور میرا یہ یقین غلط نہ ثابت ہوا' وہ آئی۔ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تی۔ پتا نہیں اس نے یہ چادر کہاں سے حاصل کی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے چونکا لیکن پھر جب میں نے اسے پہچانا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ یشل نے ابھی تک مجھے اپنے آپ سے روشناس نہیں کرایا تھا اور گمنام حیثیت سے ے سامنے آتی تھی لیکن آج میں اس کی تمام اصلیت سے واقف ہو گیا تھا۔ اس نے

آہستہ سے کہا۔

"تم نے کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا۔ شاید اگر تم صحیح فیصلہ کر لیتے تو اب تک اپنے کام کی تکمیل کر چکے ہوتے۔ غالباً تم نے میری اس بات پر توجہ نہیں دی کہ جتنا وقت گزرے گا تمہاری اپنی زندگی بھی خطرے میں پڑتی چلی جائے گی۔" اس کے ان الفاظ پر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم موجود ہو میری حفاظت کے لئے پھر میری زندگی کو کیا خطرہ لاحق ہے؟"

"اوہ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکتی۔ اگر میں تمہاری حفاظت کر سکتی اور اس قدر طاقتور ہوتی تو اپنا کام خود بھی کر سکتی تھی۔ میں، میں تمہیں بتاؤں تم مجھ پر یقین نہیں کر رہے حقیقت یہی ہے کہ وہ شخص جو سردار ہے۔ یہاں کبھی کسی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی انسان کو وہ یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں دے گا۔ کیونکہ اگر کوئی یہاں سے باہر چلا گیا اور اس نے کبھی یہ کہانی کہیں اور سنا دی تو سردار کی اپنی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"ہوں! لیکن افسوس میں ابھی تک تمہارے نام سے ناواقف ہوں۔ کوئی نام تو ہوگا تمہارا؟ کسی نام سے تمہیں پکارا جا سکتا ہے۔ کیا تم مجھے اپنا نام بتانا پسند نہیں کرو گی؟"

"نہیں۔ ابھی نہیں۔ میں تم سے کہہ چکی ہوں کہ میں تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گی لیکن ابھی یہ وقت نہیں آیا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے میں خود تمہیں تمہاری کہانی سنائے دیتا ہوں ایشل۔" میں نے کہا اور وہ اس طرح اچھل پڑی جیسے بچھو نے ڈنگ مار دیا ہو۔ اس کی خوبصورت آنکھیں حیرت اور خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح مجھے گھورے جا رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ سردار نے تمہیں ساری کہانی سنا دی؟"

"نہیں ایشل کسی غلط فہمی کا شکار مت ہو۔ بھلا سردار مجھے یہ بتائے گا کہ وہ مہذب دنیا کا ایک شخص ہے؟ کیا وہ مجھے یہ بتائے گا کہ وہ تمہارا باپ ہے؟"

"تو پھر۔ تو پھر تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہو گیا۔ تم یہ سب کچھ کیسے جان گئے؟ آہ۔ میں جانتی ہوں وہ کتنا شاطر ہے۔ اس نے یقیناً تمہیں اپنے جال میں پھانس لیا اور جب تم سردار کے جال میں پھنس گئے تو پھر اس بات کی کیا گنجائش ہے کہ تم میرے لئے

کچھ کرو۔ ناممکن۔ ناممکن گویا میرا منصوبہ فیل ہو گیا۔" اس کے لہجے میں ایک یاسیت سی پیدا ہو گئی۔ چند لمحات وہ اسی طرح مجھے گھورتی رہی۔ پھر دفعتاً پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

"لیکن اس کے باوجود۔ اس کے باوجود تم مجھے قتل نہیں کر سکتے۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ سمجھے تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"ایشل بیوقوف نہ بنو۔ کیسی باتیں کر رہی ہو تم۔ تم، میرے ہاتھوں تمہیں کوئی نقصان کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ اس بات پر بھروسہ کر لو۔"

"لیکن......... لیکن تم......... تم.........."

"ہاں میں تم سے کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی حقیقت ہے۔ میں تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتا میں نے تمہاری مظلومیت تسلیم کر لی ہے۔" وہ عجیب سی نگاہوں سے مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"لیکن تمہیں۔ تمہیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہو گیا۔ تمہیں کیسے علم ہو گیا کہ میں مظلوم ہوں؟ میرا نام ایشل ہے اور سردار.......... سردار..........؟"

"تمہارا باپ ہے۔" میں نے کہا اور اس نے گردن ہلا دی۔ پھر اس کی آنسو بھری آواز ابھری۔

"ہاں وہ میرا باپ ہے لیکن ایسا باپ ہے جسے باپ کہنا اس مقدس رشتے کی توہین ہے۔" اس نے کہا۔

"مجھے تمہاری کہانی معلوم ہے ایشل۔ سردار کی ڈائری میں سے سب کچھ پڑھ چکا ہوں۔" ایشل بے اختیار ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنی ماں پر ہونے والے مظالم کی داستان سنائی۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے باپ سے بے پناہ نفرت کرتی ہے میں نے اسے تسلیاں دیں اور اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

ایشل چلی گئی اور میں اس کے بارے میں غور کرتا رہا۔ کیسی عجیب کہانی تھی بہرحال اب مجھے کوئی تردد نہیں کرنا تھا۔ مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی تھی۔ قتل گلینو ہی کو ہونا چاہئے۔ مظلوم لڑکی ساری زندگی باپ کے ظلم و ستم کا نشانہ رہی ہے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں فروخت ہوئی۔ اس سے زیادہ اذیت اور کس بات کی ہو سکتی تھی۔

مجھے اب نہایت ہوشیاری سے اپنا کام کرنا تھا۔ اب تک ایشل مجھے ترکیبیں بتاتی رہی تھی اور اب مجھے خود اس کی زندگی اور اس کے باپ کی موت سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اب صرف وقت اور موقع کا انتظار تھا۔

اس شام کی رات کو میں اپنا کام کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ سردار نے اچانک مجھ سے ملاقات کی۔ وہ معمول کے مطابق میرے جھونپڑے میں آ گیا تھا۔

"تم نکمے پن کا ثبوت دے رہے ہو۔ کیا اس مسئلے میں میں نے تم پر بھروسہ کر کے غلطی کی ہے۔"

"کیوں سردار؟"

"اتنے دن گزر گئے اور تم ابھی تک اپنی کوشش میں ناکام رہے ہو۔"

"یہ آخری شام ہے سردار۔"

"کیا مطلب؟"

"آج رات میں اپنے مشن کی تکمیل کرلوں گا۔"

"تمہیں یقین ہے۔"

"سوفیصدی۔" میں نے جواب دیا۔

"تب میں تمہاری کامیابی کا انتظار کروں گا۔" سردار نے کہا اور اس کے بعد وہ خوش خوش چلا گیا۔ میں نے دل میں سوچا کہ سردار! افسوس تم میری کامیابی کا منظر دیکھنے میں ناکام رہو گے۔ یہ دیکھنا تمہاری تقدیر میں نہیں ہے۔

معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ میرے لئے رات کا کھانا آ گیا۔ اب چونکہ میں سردار کا خاص آدمی تھا۔ اس لئے میرے لئے کھانا بھی خاص ہی ہوتا تھا۔ پھل وغیرہ کے ساتھ شکار کئے ہوئے پرندوں کا گوشت بھی شامل ہوتا تھا۔ مگر میں نے آج کے کام کے پیش نگاہ کھانا بہت کم کھایا تاکہ ہلکا پھلکا رہوں۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں آرام کرنے لیٹ گیا۔ رات گزرنے کا انتظار کرنا تھا۔ پروگرام کے مطابق مجھے سردار کو قتل کر کے یہاں سے سیدھا ایشل کی جھونپڑی پر پہنچنا تھا اور پھر یہاں سے ہم دونوں کو سیدھا سمندر کے کنارے جہاں ایشل نے فرار کا بندوبست کر رکھا تھا۔

بالآخر وہ وقت آ گیا۔ جب مجھے اپنے کام کا آغاز کرنا تھا۔ دل میں بے چینی تھی ک قتل وغیرہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں تو چیونٹی کو بھی قتل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو بس ایک وقتی اور جذباتی حادثہ تھا۔ اس لئے اس وقت بھی میری بری حالت ہو رہی تھی۔ ایشل کا دیا ہوا خنجر میرے لباس میں پوشیدہ تھا۔

میں جھونپڑی کے قریب پہنچ گیا۔ اطراف میں سناٹا تھا اندر جھونپڑی میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی اور گہرے گہرے خراٹوں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ منحوس مکلینو آرام کی نیند سو رہا تھا۔ میں احتیاط سے جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔ خنجر میرے ہاتھ میں لرز

رہا تھا۔ میں نے سوئے ہوئے سردار کی طرف دیکھا تاریکی میں اس کا ہیولا مزید خوفناک لگ رہا تھا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے اپنے قدم من من بھر کے محسوس ہو رہے تھے۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح اس کے پاس پہنچ گیا۔ ہمت کی اور خنجر والا ہاتھ بلند کر کے پوری قوت سے خنجر سردار کے سینے میں عین دل کے مقام پر گھونپ دیا۔ پھچاک کی آواز کے ساتھ خنجر مکلینو کے بدن میں داخل ہو گیا۔ میں نے اسے کھینچ کر دوسرا اور پھر تیسرا وار کر دیا لیکن کام پہلے ہی وار میں ہو گیا تھا۔ ابھی میں اس تیسرے وار سے فارغ ہی ہوا تھا کہ دفعتاً جھونپڑی میں آہٹ ہوئی اور پھر ایک مشعل روشن ہو گئی۔

میرے بدن میں لہو جم گیا تھا۔ بدن کی رگیں پھٹتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ مشعل کے نزدیک جو شخص کھڑا تھا وہ سردار مکلینو ہی تھا۔ اس کا چہرہ خوفناک ہو رہا تھا اور اس سے بھی زیادہ خوفناک چیز اس کے ہاتھ میں دبا ہوا پستول تھا۔ یہ وہی پستول تھا جو اس نے گڑھے سے نکال کر مجھے دکھایا تھا۔ ذہن کی حالت ناقابلِ بیان تھی۔ سہمی ہوئی نگاہوں سے میں نے لاش کی طرف دیکھا۔ یہ کون ہے جسے میں نے قتل کیا ہے۔ کوئی اندازہ نہیں ہو سکا۔

مکلینو میری ہر کیفیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"تم نے جو کچھ کیا میری توقع کے عین مطابق ہی کیا۔ میں ہمیشہ اس کے لئے تیار رہتا ہوں۔"

"یہ.......... یہ کون ہے؟" میں نے سہمے ہوئے لہجے میں لاش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"میرا ایک غلام' اور یہ اس کے لئے اعزاز ہے کہ اس نے میرے لئے جان دی۔" اس نے جواب دیا۔ پھر کسی قدر غضبناک لہجے میں بولا۔ "تم میری توقع سے زیادہ بے وقوف نکلے نوجوان۔ اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا میں تمہیں۔"

"کیوں؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔

"میری ڈائری سے تمہیں میری سابقہ زندگی کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا اس کے باوجود تم نے مجھے قتل کرنے کے لئے اتنا گھٹیا طریقہ کار اختیار کیا۔ جرم سے میرا ماضی بھرا پڑا ہے ایک ایسے شخص کی ہلاکت کے لئے تو کوئی شاندار منصوبہ بنانا چاہئے تھا تمہیں۔ تم شاطر مجرم کے خلاف جرم کر رہے تھے تم نے یہ بات کیوں نظرانداز کر دی کہ میں تم سے بڑا مجرم ہوں۔" اس کا انداز زہریلا تھا۔ میں خشک ہونٹوں پر زبان پھیر

کر رہ گیا۔ "میرا تجربہ تم سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ کام تمہیں سونپنے کے بعد میں ایک لمحے تم سے غافل نہیں رہا۔ میں عورت کی قوت سے واقف ہوں۔ دو ہی صورتیں ہوتی ہیں سمجھ دار انسان صرف اپنا کام کرتا ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ تم اگر میرے کام کی تکمیل کر سکتے تو پہلے ہی مرحلے میں کر دیتے۔ پہلے مرحلے میں تم وہ نہ کر سکے جو تمہیں کرنا تھا میں نے یہ سمجھ لیا کہ اب تم یہ کبھی نہ کر سکو گے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ تم نے ایشل کو قتل نہیں کیا تو اب اس کے ایما پر مجھے قتل کرنے کی کوشش ضرور کرو گے۔ یہی عورت کی تاریخ ہے یہی مرد کی تاریخ ہے۔ یہ تمہاری بیوقوفی نہیں۔ تاریخ ان حماقتوں سے بھری پڑی ہے۔ مگر تم ذرا اعلیٰ پائے کے احمق ہو۔ تم نے میری ڈائری چرا کر میرے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا۔ ڈائری کے آخری صفحے کی تاریخ نہیں دیکھی یہ نہیں سوچا کہ میں باقاعدہ ڈائری لکھتا ہوں اور اگر ڈائری اپنی جگہ موجود نہیں ہوگی تو میرا ذہن تمہارے علاوہ کسی اور کی طرف نہیں جائے گا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا بیوقوف۔"

میرے بدن میں سرد لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے مجھے معلوم تھا۔ موت میری شہ رگ کے قریب تھی۔ سردار نے پھر کہا۔

"خنجر پھینک دو۔ اب یہ تمہارے لئے بے کار ہے۔" درحقیقت خنجر میرے لئے بیکار تھا۔ سردار کی انگلی کا ایک اشارہ میری موت بن سکتا تھا میں نے ٹھنڈی سانس لے کر خنجر پھینک دیا۔ جسے سردار نے جھک کر اٹھا لیا تھا لیکن خنجر اٹھاتے ہوئے وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا تو پھر اٹھ نہ سکا۔ میں نے اسے گردن جھٹکتے ہوئے دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے چکر آ گیا ہے۔

ایک بار پھر آہٹ ہوئی اور میری نظریں جھونپڑے کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ اندر داخل ہونے والی ایشل تھی۔ وہ زہریلی نگاہوں سے مکلینو کو دیکھ رہی تھی۔ مکلینو اب بھی اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔

"میں نے عورت کی تاریخ نہیں پڑھی میرے باپ لیکن مجھے یقین ہے کہ کسی بھی دور میں عورت اتنی بے بس نہیں ہوئی جتنا مرد اسے سمجھتا رہا ہے تو نے میری ماں کو خودکشی پر مجبور کیا تھا۔ تو نے اس کی حرمت پامال کر دی تھی۔ تو نے میرا بچپن روند ڈالا تھا۔ تو مجھے ان وحشیوں کے درمیان لے آیا جن میں میں ہمیشہ اجنبی رہی ہوں۔ میرے باپ میرا مستقبل کیا تھا؟ تو نے میری نفرت کو محسوس کیا اور میری موت کے درپے ہو گیا لیکن میں بھی تیری اولاد ہوں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ تجھے میرے لوہے کی

طاقت کا بھی اندازہ کرنا چاہئے تھا۔ ہاں میرے باپ تو اس کی نگرانی کر رہا تھا۔ تو میں بھی بڑی نگران تھی۔ تو بہت بڑا مجرم ہے تو میرے بدن میں بھی تیرا ہی خون ہے۔ یہ ہیرے لئے مجھ سے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ یہ مجھے میری دنیا میں لے جائے گا اور کون تھا جو مجھے یہاں سے نکالتا۔ اس لئے میرے باپ تو اسے قتل نہ کر سکے گا۔ تو ابھی تھوڑی دیر قبل بھورے ریٹھوں سے بنی ہوئی جو شراب پی رہا تھا میں نے اس میں سانپ کا زہر شامل کر دیا تھا جارو کا سانپ کا زہر جو کچھ دیر کے بعد اثر کرتا ہے۔"

میں نے چونک کر مکلینو کو دیکھا اب اس کے ہاتھ ڈھلک گئے تھے اور ان میں وہ طاقت نہیں تھا۔ اس کی گردن لٹکی ہوئی تھی۔ پستول اور خنجر نیچے پڑے ہوئے تھے۔

ایشل نے میری طرف دیکھا اور بولی۔ "پستول اٹھا لو اور میرے ساتھ آؤ۔" میں نے خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ جھونپڑے سے باہر تاحد نگاہ خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں دھڑکتے دل سے ایشل کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ ہمیں تقریباً [illegible] میل پیدل چلنا پڑا۔ اس کے بعد ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں درختوں سے گھری کھاڑی نظر آ رہی تھی۔ ایشل درختوں میں گھس گئی اور پھر اس نے گھاس میں پوشیدہ ایک کشتی مجھے دکھائی۔ جو نہ جانے کیسے سامان سے لدی ہوئی تھی۔ خشک پھل کے انبار تھے۔ چھوٹے درختوں کے تنے کھوکھلے کر کے ان میں پانی کا ذخیرہ کیا گیا تھا۔ نہ جانے یہ کام کتنی مدت میں ہوا ہوگا۔ میں ایشل کی قوت کا اندازہ لگا رہا تھا۔

بہرحال ہم دونوں نے کشتی دھکیل کر کھاڑی میں ڈال دی پھر اس میں سوار ہو گئے۔ میں تیزی سے چپو چلا رہا تھا اور ہمیں اس وقت تک شدید محنت کرنی پڑی۔ جب تک کشتی کھلے سمندر میں نہ پہنچ گئی۔ معاون ہواؤں نے رات بھر میں ہمیں بہت دور پہنچا دیا۔ ایشل بہت خوش تھی۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کی تھیں۔ سامان میں اس نے مجھے سونے کے چوکور ٹکڑے اور قیمتی ہیرے دکھائے جو ناتراشیدہ تھے اور مجھے اندازہ ہو گیا یہ سب کچھ بے حد قیمتی ہے۔ پھر سمندری صعوبتوں کا آغاز ہو گیا۔ خونخوار مچھلیاں۔ آکٹوپس اور دوسری بلاؤں نے ہمیں گھیر لیا۔ تیز دھوپ اور نم ہواؤں نے شکلیں بدل دیں۔ رہی سہی کسر ایک طوفان نے پوری کر دی جس میں ہماری کشتی الٹ گئی اور سب کچھ سمندر کی نذر ہو گیا۔ الٹی ہوئی کشتی بمشکل سیدھی کی اور اس میں سوار ہو گئے لیکن اب کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ جب تک ہوش قائم رہ سکے ہم ایک دوسرے کی دلجوئی کرتے رہے اور اس کے بعد موت کے انتظار کے سوا کچھ نہ رہا لیکن موت نہیں آئی۔ بلکہ زندگی ایک جہاز کی شکل میں آ گئی

جس نے ہمیں بچالیا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ میرے وطن کا جہاز تھا۔
آج میں پھر اپنے وطن میں ہوں۔ ایشل میری بیوی ہے اور ہماری ذمہ داریوں میں اضافہ ہونے والا ہے۔ چین و عرب کیا سارا جہاں ہمارا ہے اور افریقہ بھی ہمارا ہے' میں چین یا عرب تو نہیں جاسکا۔ افریقہ اور یورپ میں رہا ہوں یورپ بھی تو ہمارا ہی ہے کچھ چیزیں ایسی ضرور ہیں جو ہماری نہیں۔ جیسے یہ کوارٹر جس میں ہم رہتے ہیں۔ سرکاری ہے' بجلی اور پانی بھی ہمارا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔
مجھے دولت کے انبار نہیں مل سکے لیکن کچھ سفارشوں سے ایک سرکاری محکمے میں نوکری ضرور مل گئی ہے اور اللہ کے فضل سے گزر رہی ہے بس۔

☆------☆------☆

جرائم کی دنیا کے ایک شاطر کی کہانی۔
اس کے اپنے گروہ کے لوگ اس کے
خون کے پیاسے ہو گئے تھے...... کیوں؟
جب کیوں کا راز اس پر منکشف ہوا تو
اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

شعروادب کی دُنیا میں حسن و عشق سے متعلق معلومات کا کافی ذخیرہ موجود ہے لیکن افسوس میرا تعلق آتشِ افروز سے رہا ہے شعروشاعری کے معرکوں سے کبھی واسطہ نہیں پڑا۔ ہاں بچپن میں ایک حادثہ گزرا تھا جس سے کافی عبرت ہوئی۔ ایک شاعر کی جیب کاٹ لی تھی۔ چند بچی ہوئی مونگ پھلیوں کے علاوہ کچھ دستیاب نہیں ہوا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ایک شاعر ہے اس کے بعد شاعروں وغیرہ سے کافی محتاط رہا۔ لیکن یہ غلط ہے انسان کو ہر شعبہ ہائے زندگی سے متعلق رہنا چاہئے پتا نہیں کب کہاں کیا ضرورت پیش آجائے۔ اگر کسی اچھے شاعر کی غزل پر غور کرلیا ہوتا تو نیلا کی آنکھوں کی گہرائیاں پڑھنے میں زیادہ دقت نہ ہوتی اور زندگی کا یہ نیا دور اب سے پہلے شروع ہوجاتا۔

کچھ تھوڑی سی تفصیل اس احقر کے بارے میں۔ نام جلال ہے صرف جلال آگے پیچھے کچھ نہیں ہے اور بڑے سے بڑا محقق اپنی ساری زندگی کی کوششوں کے باوجود یہ نہیں بتا سکتا کہ میرا نام جلال کس نے رکھا ہے اور کیوں رکھا ہے۔ سنا ہے کچھ لوگ ٹولی کی شکل میں آئے اور خاکسار کو یتیم خانہ ابتدا الاسلام میں جمع کراکے رسید لے گئے تھے اس رسید کا انہوں نے کیا کیا اللہ جانے۔ خادم نے اس یتیم خانہ میں مولوی صدمہ کے زیر سایہ ہوش سنبھالا اور گلوکاری کی مشق کرنے لگا۔ یہ گلوکاری اسٹیج فلم یا ٹی وی کے لئے بیک سنگر کے لئے نہیں تھی بلکہ خوش الحانی سے "یتیموں کو دینے سے ہوگا ثواب" گانے کے لئے تھی۔ جتنا آواز میں درد ہوگا اتنا ہی لوگوں کے پیٹ میں بھیک دینے کا درد ہوگا۔ یہ مولوی صدمہ کا فارمولا تھا۔ مگر اپنا حلق کبھی ساتھ نہ دے سکا اور مولوی صاحب کے سترہ ڈنڈے اللہ کے فضل سے صرف اپنی کمر پر ٹوٹے۔ یہ ان ڈنڈوں ہی کی برکت تھی کہ کمر فولاد ہوگئی اور پولیس کے ڈنڈے اس پر بے ضرر رہے کیونکہ بچپن سے فولاد ڈھالا گیا تھا۔

ذرا اور ہوش آیا تو مولوی صدمہ پر غصہ آگیا۔ خوب پھول پھول کر کپا ہوتے جارہے تھے اور بچے سوکھ سوکھ کر چپاتی۔ ایک ہانڈی میں مرغی پکتی دوسری میں دال۔ تقسیم کیسے ہوتی آپ سمجھ رہے ہوں گے چنانچہ یتیم خانہ چھوڑ دیا اور استاد بن عالی کی

شاگردی اختیار کرلی اور انگلیوں کے فن میں کمال حاصل کیا۔ انگلیوں کے فن نے جیل پہنچایا جہاں بھلا استادوں کی کیا کمی تھی۔ ہاں شاگرد کم پڑجاتے ہیں۔ چنانچہ بے شمار استادوں کے زیر سایہ فنون حاصل کرتا رہا اور جب انسان اپنی تعلیم مکمل کرلے تو جیل خانہ وہ واحد جگہ ہے جو اچھے مستقبل کی ضمانت دیتا ہے یہاں کے تربیت یافتہ کو کہیں کام کی کمی نہیں ہوتی مجھے تو بہت سے استادوں سے سند ملی ہوئی تھی اس لئے فوراً ہی میرا اپائنٹ منٹ ہوگیا اور مجھے پاشا کی پہلی مملکت میں پہنچادیا گیا۔

پاشا۔ ہا۔ کمال کی چیز تھا یہ شخص۔ اسمگلروں کی دنیا کا شہنشاہ اس کا کام دنیا بھر میں پھیلا ہوا تھا۔ مجھے سب سے زیادہ مسرت اس بات کی تھی کہ پاشا کی نوکری میں دنیا گھومنے کو ملتی ہے چنانچہ میں نے پاشا کے دل میں جگہ حاصل کی اور یہ جگہ اپنی اسی کارکردگی کی وجہ سے مجھے ملی۔ میں نے دنیا کے کتنے ہی ممالک کی زبانیں سیکھیں اور ان میں مہارت حاصل کرلی۔ جو کام میرے سپرد کیا جاتا اس میں ناکامی کا تصور بھی باقی نہیں رہ گیا تھا چنانچہ پاشا ہمیشہ اہم کام میرے سپرد کرتا تھا اور مجھ پر بے حد اعتماد کرنے لگا تھا۔ اس کاروبار میں اس کا حریفوں سے زبردست مقابلہ رہتا تھا اور پھر خوب چالیں چلی جاتیں۔ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر طرح کے گُر استعمال کئے جاتے اور میں پاشا کا سب سے معتبر جنرل تھا۔ بیرونی مشن عموماً میرے سپرد کئے جاتے تھے۔ شاید میری ہی وجہ سے پاشا نے اپنا کاروبار اسمگلنگ کی حد سے بڑھالیا تھا اب وہ ایسے کیس بھی لینے لگا تھا جن کا اسمگلنگ سے کوئی تعلق نہ ہوتا مگر اس میں اچھی خاصی آمدنی ہوجاتی تھی۔

اس بار بھی پاشا نے میرے لئے ایک مہم منتخب کرلی تھی اور میں نے اس پر آمادگی کا اظہار بھی کردیا تھا۔ اس مہم کے تانے بانے بے حد الجھے ہوئے تھے اور اس کے لئے بڑی دردسری مول لینی پڑی تھی۔ بہرحال اس کام کی تکمیل کے لئے میری پہلی منزل وینس تھی۔ وینس کی آبی سرزمین کا جغرافیہ مجھے اچھی طرح ذہن نشین کرادیا گیا تھا۔ صدیوں پیشتر ایک قبیلے کے لوگ وحشی حملہ آوروں سے بچنے کے لئے پہاڑوں اور میدانوں کو چھوڑ کر چند بے آباد ساحلی جزیروں پر آباد ہوگئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان محنتی لوگوں نے ایک شہر کو جنم دیا جو بالآخر اطالیہ کی طاقتور ترین ریاست بن گیا۔ اس کے باشندے تجارت کی خاطر دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے۔ مشرق کو جانے والی تمام آبی شاہراہیں وینس کے لوگوں کے قبضے میں آگئی تھیں۔ مشرق سے کمائی ہوئی اور بارہا لوٹی ہوئی دولت نے نہروں کے کنارے سنگِ مرمر کے محلات اور عالی شان گرجوں کی تعمیر میں مدد دی اور

دولت کے ساتھ ساتھ یہاں دوسری ترقیاں بھی ہوتی گئیں اور آج وینس دنیا کے عجیب وغریب شہروں میں شمار ہوتا ہے۔

پاشا کا طریقۂ کار بھی عجیب تھا۔ اپنے اہم ترین لوگوں کو وہ کبھی یہ تفصیل نہیں بتایا کرتا تھا کہ انہیں اصل میں کیا کرنا ہے بس ایک سے دوسرے کو چھوٹی چھوٹی اطلاعات ملتی رہتی تھیں اور انہی اطلاعات کے ذریعے اصل کام تک رسائی حاصل ہو سکتی تھی۔ یہ پاشا کا مخصوص طریقۂ کار تھا اور اس کے سلسلے میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس طرح راز، راز ہی رہتے ہیں اور وقت سے پہلے ان کے افشا ہو جانے کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ کسی ایک شخص کو صحیح بات معلوم نہیں ہوتی۔ میں پہلے ہی پاشا کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا اعتراف کر چکا ہوں اور آپ کو بتا چکا ہوں کہ ایسی عجیب و غریب شے میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ چھوٹے سے قد کا یہ سرخ و سفید شخص تقریباً پچپن یا ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ اس کے بارے میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی وقت وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے بہت سے اہم معاملات اس کی اپنی ذات تک محدود تھے اور وہ کبھی کسی کو ان میں شامل نہیں کرتا تھا۔ بہرطور میں وینس پہنچنے کے بعد اپنے لئے وہ رہائش گاہ تلاش کرنے لگا جس کی مجھے ہدایت کی گئی تھی اور اس رہائش گاہ تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی لیکن رہائش گاہ کے حصول کے بعد جو سب سے پہلے شناسا شکل مجھے نظر آئی، وہ نیلا کی تھی۔

نیلا، پاشا کے گروہ میں میرے برابر کی حیثیت ہی رکھتی تھی۔ اس کی جھیل جیسی حسین آنکھوں میں ایک عجیب سی خاموش پُراسرار کیفیت طاری رہتی تھی۔ بہت ہی سنجیدگی سے اپنے کام کرنے کی عادت تھی اور اس کے بارے میں مجھے یہی علم ہوا تھا کہ پاشا اس پر بے حد اعتماد کرتا ہے۔ نیلا کو میرے بعد پاشا کے گروہ میں شامل کیا گیا تھا لیکن اس نے بہت جلد ہی اپنے لئے وہ بڑا مقام بنالیا تھا جس کے نتیجے میں پاشا کے ہاں بڑی حیثیت حاصل ہو جایا کرتی تھی۔ بہرطور کئی بار میرا اور نیلا کا ساتھ بھی رہا لیکن اس کی خاموش آنکھوں میں بس ایک عجیب سی کیفیت نظر آتی رہتی تھی اس سے زیادہ کبھی مجھے اس کی قربت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان خاموش آنکھوں میں جو پیغام تھا اس کے بارے میں، میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ بہرطور یہاں آنے کے بعد جب میں نے نیلا کو دیکھا تو میرے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت بیدار ہو گئی۔ کم از کم ایک ایسی شخصیت میرے پاس موجود ہے جس کا تعلق پاشا کے گروہ سے ہے اور ہو سکتا ہے اسی کے ذریعے مجھے اگلا پیغام ملے۔

یہاں بھی میں نے نیلا کے انداز میں وہی خاموشی محسوس کی تھی۔ اصولی طور پر مجھے اس وقت تک نیلا سے خود ملاقات نہیں کرنی تھی جب تک کہ نیلا کسی مخصوص پیغام کے ذریعے مجھ سے گفتگو کا اظہار نہ کرے۔ یہ ہمارے گروہ کی کارکردگی کے اصول تھے۔ ویسے نہ جانے کیوں نیلا کی یہاں موجودگی سے مجھے ایک خوشی سی ہوئی تھی میں نے اسے نگاہ میں رکھا۔ نیلا نے بھی مجھے اپنے مخصوص انداز میں دیکھا تھا۔ بڑی بڑی حسین آنکھوں میں وہی گہرائی۔ یہ آنکھیں ہمیشہ مجھے کچھ کہتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں لیکن میں آپ لوگوں سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ حسن و عشق کی وادیوں سے کبھی گزر نہیں ہوا تھا اس لئے اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔

اپنی رہائش گاہ میں، میں جس کمرے میں مقیم تھا وہ تمام سہولتوں سے مزین تھا اور مجھے یہاں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ بس اب انتظار تھا اس بات کا کہ مجھے کوئی پیغام موصول ہو تو میں اپنے کام کا آغاز کروں۔ نیلا سے بھی ابھی تک باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی اور اس پہلی ملاقات کے بعد جب میں نے اسے اور اس نے مجھے دیکھا تھا، ابھی تک اس سے سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی بہانے سے ہی سہی کم از کم اس سے یہ تو معلوم کیا جائے کہ ہمارا آئندہ قدم کیا ہوگا؟ لیکن مجھے ابھی تک اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں نے نیلا کو تلاش کیا تو وہ مجھے دوبارہ نظر نہیں آئی۔ البتہ میرے قیام کی دوسری رات مجھے ایک ویٹر کے ذریعہ ایک پیکٹ موصول ہوا جس میں چند کاغذات موجود تھے۔ ان کاغذات میں میرے لئے ایک پیغام موجود تھا۔

کاغذات میں ایک ایسا چھوٹا سا پیکٹ بھی تھا جو بند اور سربمہر تھا۔ میرے لئے یہ ہدایت تھی کہ یہ پیکٹ مجھے اطالوی سرحد عبور کر کے ایک مخصوص قصبے تک پہنچانا ہے جو سوئٹزرلینڈ کی تحویل میں آتا ہے۔ میرے وہاں تک پہنچنے کا تمام بندوبست کر دیا جائے گا اور اس سلسلے میں مجھے ایک شخص سے ملاقات کرنی ہوگی جو خود ہی مجھ تک پاشا کے مخصوص نشان کے ساتھ پہنچ جائے گا۔

میں نے پیکٹ احتیاط سے اپنے لباس میں محفوظ کر لیا اور ہمیشہ کی طرح احتیاطی تدابیر کے مطابق وہ تمام کاغذات جلا کر ضائع کر دیئے جن میں میرے لئے پیغام پہنچا تھا۔

مجھے نیلا کے بارے میں ذرا تشویش تھی اگر وہ یہاں موجود ہے تو پھر میرا رابطہ اس سے کیوں نہیں ہے اور کسی اور شخص کا حوالہ کیوں دیا گیا ہے؟ بہرطور یہ پاشا کا اپنا معاملہ تھا۔ اس کا طریقۂ کار ہی یہی تھا۔ لوگ اس کے فیصلوں کے بارے میں کبھی صحیح اندازہ

نہیں لگا پاتے تھے۔ جس شخص نے اس سلسلے میں مجھ سے ملاقات کی اس کا تعلق شاید وینس ہی سے تھا۔ یقینی طور پر پاشا کے آدمیوں میں سے ایک ہوگا۔ خوش مزاج اور کسی قدر خوبصورت آدمی تھا۔ اس نے اپنا نام سہیل بتایا تھا۔

سہیل نے پاشا کے مخصوص نشان کے حوالے سے مجھ سے ملاقات کی اور پھر اس نے کہا کہ ڈومیسڈولا تک روانگی کے انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ ہمیں گرانڈ کنال کے ذریعے سفر کر کے ایک معروف جگہ تک پہنچنا ہوگا۔ تمام تیاریوں کے بعد ہم وہاں سے نکل آئے۔ ہمارے سامنے گرانڈ کنال ایک عظیم شاہراہ کی مانند ٹریفک سے پُر تھی۔ کاروں اور بسوں کے بجائے اسٹیمر لہروں پر رواں تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ڈرائیونگ کے دوران سڑک پار کرنے والوں کو بچانے کی فکر نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ہم ایک سٹیمر کے ذریعے سفر کرنے لگے۔ خوش مزاج سہیل مجھے وینس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بتاتا جا رہا تھا اور میں اس کی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ بالآخر یہ سفر ختم ہوا ہم اسٹیشن پہنچ گئے اور پھر برقی ریل گاڑی کے ذریعے ہم نے وینس چھوڑ دیا۔

راستے میں بڑے دلچسپ مناظر سامنے آ رہے تھے میں نے ان علاقوں کے بارے میں صرف تفصیلات پڑھی تھیں خود کبھی اس سے پہلے اس طرف نہیں آیا تھا۔ میلان سے باہر نکلنے کے بعد بلند پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا اور جس کے اطراف میں دھند ہی دھند بکھری ہوئی تھی۔ ڈومیسڈولا تک پہنچنے کے لئے ہمیں خاصا لمبا سفر طے کرنا پڑا اور جس وقت ہم ڈومیسڈولا میں داخل ہوئے' شام ہو چکی تھی۔ یہاں مجھے اپنے کام کے سلسلے میں نہ جانے کیا کیا کرنا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا۔ سہیل ہی اس سلسلے میں مجھے تفصیلات بتانے والا تھا۔ بہرطور یہاں اترنے کے بعد ہم پیدل چل پڑے اور ہمیں کافی لمبا سفر کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد ایک مکان کے دروازے پر رک کر سہیل نے آہستہ آہستہ تین بار دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے ایک آواز ابھری جس میں عجیب سی غراہٹ چھپی ہوئی تھی۔

"کالا دل۔" سہیل نے جواب دیا اور چند لمحات کے لئے خاموشی چھا گئی۔

دروازہ کھولنے والا نظر نہیں آیا تھا۔ "کالا دل" بھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہ کوئی نیا کوڈ تھا جو سہیل نے استعمال کیا تھا۔ بہرطور ہمیں آواز سنائی دی۔

"اندر آجاؤ۔"

سہیل نے مجھے اشارہ کیا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔

نیچی چھت والے کمرے میں پھیلی ہوئی مدہم روشنی میں ایک شخص دروازہ بند کرتا دا نظر آیا۔ اس کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی تھی۔ جسم پر پھٹا پرانا سا لباس تھا۔ دروازہ بند لر کے وہ گھوما تو میرے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔۔ کافی خوفناک شخص تھا لکل بن مانس کی مانند۔ اس کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور ان الجھے ہوئے بالوں کے نیچے اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر سہیل کی طرف رُخ کر کے بولا۔

"کیا تمہاری ضرورت ہے؟"

"نہیں بس میرا کام یہیں تک تھا۔ اچھا دوست مجھے اجازت دو۔" سہیل نے اس سے پہلے مجھے یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ مجھے یہاں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اب اچانک ہی س نے اس شخص کے کہنے پر یہ انکشاف کیا تھا۔ بہرطور وہ باہر نکل گیا۔ تب اس شخص نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"بیٹھ جاؤ۔"

میں مشینی انداز میں ایک چھوٹی سی تپائی پر بیٹھ گیا تھا۔ خونخوار آدمی خاموشی سے مجھے گھورتا رہا پھر بولا۔

"کیا لائے ہو؟"

مجھے یہ بات معلوم تھی کہ وہ سر بمہر پیکٹ مجھے اس شخص کے حوالے کرنا ہے چنانچہ میں نے جیب سے پیکٹ نکالا اور اسے اس شخص کے سپرد کر دیا۔ اس نے پیکٹ میرے ہاتھ سے لے لیا چند لمحات میری صورت دیکھتا رہا پھر بولا۔

"بہتر ہوگا کہ تم یہیں آرام کرو۔ میں ذرا دوسرے کمرے میں جا کر اس کا جائزہ لے لوں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے تعاون کرنے والے انداز میں گردن ہلائی اور وہ شخص پیکٹ میرے ہاتھ سے لے کر اندر چلا گیا۔

میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ عجیب بے ہودہ سا آدمی تھا۔ پتا نہیں اس کے بعد مجھے مزید اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ پاشا کی بعض اوقات کی ہدایات ذہن کو گراں گزر جاتی تھیں۔ اب بھلا مجھ جیسا پائے کا آدمی جس پر پاشا اپنے کاموں کے سلسلے میں نہایت بھروسہ کرتا تھا اس جیسے نامعقول آدمی کا انتظار کر رہا تھا اور اس بات کا منتظر تھا کہ وہ مجھے مزید

ہدایات دے مگر کیا کیا جاتا پاشا اپنی فیلڈ کا شیطان تھا اور اس کی منصوبہ بندیاں بے حد مشہور تھیں۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد وہ شخص واپس آگیا۔ پیکٹ اب اس کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس نے چند لمحات میری طرف غور سے دیکھا پھر بولا۔

"کچھ کھانا پینا پسند کرو گے؟"

"نہیں اس وقت کچھ بھی نہیں۔"

"تب تمہیں میرے ساتھ کچھ دور سفر کرنا ہوگا۔"

"کوئی خاص بات ہے؟"

"یہ سوال نہیں کیا جاتا۔ پاشا کے لوگوں کو اس کی اجازت کہاں ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔" میں نے جواب دیا اور اس نے گردن ہلا کر مجھے آنے کا اشارہ کیا۔

باہر نکل کر اس نے ایک سمت اختیار کی تو میں آہستہ سے بولا۔

"کیا پیدل ہی چلو گے؟"

"ہاں زیادہ دور کا سفر نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا اور میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا۔

فضا میں کافی خنکی چھائی ہوئی تھی۔ موسم بھی دھندلایا دھندلایا سا تھا۔ بہرطور میں اس کے ساتھ پُراطمینان انداز میں چلتا رہا اور وہ مجھے لئے ہوئے کئی پُر پیچ راستے طے کرکے بالآخر ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جسے دلدلی علاقہ کہا جاسکتا تھا۔ زمین کچھ اس انداز میں نرم تھی کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ نرمی کس طرح کی ہے۔ اطراف میں چھوٹے موٹے کیچڑ کے ڈھیر سے نظر آرہے تھے۔ اس عجیب وغریب جگہ پہنچ کر وہ رک گیا اور پھر اس نے آہستہ سے میری طرف دیکھا۔

"میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔"

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ کچھ کھانے پینے کا پروگرام تو نہیں ہے تمہارا؟"

"اس وقت اس سوال کا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب۔" اس نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میں تعجب سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" دفعتاً کسی خیال کے تحت میں نے سوال کیا اور اس نے

اچانک ہی پلٹ کر اپنا ہاتھ گھمادیا۔

یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ میں حیران رہ گیا۔ اس کا ہاتھ میری کنپٹی پر پڑا تھا اور کافی زوردار ہاتھ تھا۔ شاید اسے یہ توقع ہو کہ میں اس ہاتھ سے چکرا جاؤں گا لیکن اس نے میرے بارے میں بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں لگایا تھا۔ میں بھپر سا گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" میں نے غصیلے لہجے میں سوال کیا اور اس بار اس نے بھرپور ٹکر میرے سینے پر ماری تھی۔

چوٹ اچھی خاصی زوردار تھی۔ پتا نہیں یہ شخص پاگل ہوگیا تھا یا یہ سب کچھ کیا تھا؟ میں سنبھل گیا۔ اس نے دوبارہ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کی تو میں نے اپنے جوتے کی ٹھوکر اس کی ایک پنڈلی پر پھر دوسری پنڈلی پر اور بالآخر کمر پر ماری وہ کسی بھینسے کی طرح ڈکارتا ہوا چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا تھا۔ شاید اسے مجھ سے اتنے شدید اور فولادی عمل کی توقع نہیں تھی۔ زمین پر گرنے کے بعد وہ چند منٹ یونہی ساکت پڑا رہا اور اس کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جو حرکت اس نے کی تھی اس سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ میرے خلاف بھرپور جنگ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا اور لپک کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ میں اس مردود کو اس کی اس حرکت کا مزہ چکھانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے منہ پر پے در پے کئی زبردست گھونسے رسید کئے اور اس کی گردن اپنے بازوؤں میں جکڑلی۔ میں نے پوری قوت سے اسے اپنے شانوں پر لادا اور ایک زوردار جھٹکا دے کر نیچے زمین پر چھوڑ دیا۔ وہ چاروں شانے چت گرا تھا۔ یہ داؤ زبردست ہوتا تھا اور اس سے عموماً گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔ میں اس پر یہ داؤ نہیں آزمانا چاہتا تھا لیکن کچھ اس طرح کی جھلاہٹ مجھ پر بھی سوار ہوگئی تھی کہ ایک لمحے کے لئے سوچنے سمجھنے کی قوتیں کھو بیٹھا تھا۔ وہ زمین پر اس طرح گرا کہ اس کے بدن میں جنبش تک نہ ہوئی اور میں نے وحشت زدہ نگاہوں سے جھک کر اسے دیکھا اور میرا اندازہ غلط نہیں تھا اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ منہ کھلا ہوا تھا اور گردن ڈھلک چکی تھی۔ دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میرا شکار مرچکا ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی مجھے پھریری سی آگئی اور میں اس پر سے اتر گیا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی کہ شاید میرے اس داؤ سے وہ صرف بے ہوش ہو مگر جب میں نے اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کی تو مجھے مکمل طور پر ناکامی ہوئی اور یہ یقین کرلینا پڑا کہ گردن ٹوٹ جانے کے باعث وہ مرچکا ہے۔

اس پر حملہ کرتے وقت میری نیت بالکل یہ نہیں تھی کہ میں اسے ٹھکانے لگادیتا مگر وہ کم

بخت میری ایک ضرب بھی نہیں سہہ سکا تھا۔

اب کیا کروں؟ پاشا نے مجھے کسی اور ہی مقصد کے تحت بھیجا تھا لیکن یہ جو کچھ بھی ہوا تھا میری سمجھ سے بالکل باہر تھا۔ اس نے مجھ سے کہیں اور چلنے کے لئے کہا تھا اور اس کے بعد یہاں لا کر اس نے مجھ پر حملے شروع کر دیئے تھے آخر اس کی وجہ کیا تھی؟ کیا اسے میری جانب سے کوئی شبہ ہو گیا تھا؟ کیا اسے یہ یقین نہیں تھا کہ میں وہ آدمی ہوں جسے پاشا نے بھیجا ہے؟ مگر یہ ذمہ داری تو سہیل کی تھی۔ سہیل کو اسے یہ یقین دلانا چاہئے تھا کہ میں درحقیقت پاشا کا صحیح فرستادہ ہوں۔ یہ سب کچھ ناقابلِ یقین تھا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ دفعتاً مجھے اس پیکٹ کا خیال آیا جو میں نے اسے دیا تھا اور جو پاشا کی طرف سے مجھے موصول ہوا تھا۔ اگر یہ پیکٹ اسی کے پاس پڑا ہوا ہے تو پھر یہ مجھے واپس حاصل کر لینا چاہئے کم از کم سہیل کو یہ اطلاع تو دے دی جائے کہ اس دیوانے نے مجھ پر ہی حملے کرنے شروع کر دیئے تھے اور غلط فہمی کی بنیاد پر میرے ہاتھوں مارا گیا۔ یہاں سے جانے سے پہلے میں نے اس کے لباس کی تلاشی لی لیکن وہ سربمہر پیکٹ اس کے لباس میں نہیں تھا چنانچہ میں واپس اس طرف پلٹ پڑا جہاں پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ پیکٹ یقیناً اسی رہائش گاہ میں ہونا چاہئے تھا جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ رہائش گاہ تک پہنچتے ہوئے مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی اور میں نے اندر داخل ہونے کے بعد اس کے ایک ایک گوشے کا جائزہ لے لیا مگر نہ جانے اس پیکٹ کو زمین نگل گئی تھی یا وہ آسمان میں پرواز کر گیا تھا۔ وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ میں سخت پریشان ہو گیا۔ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ سوائے اس کے اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ واپس یہاں سے چلا جاؤں اور کسی اور جگہ قیام کروں۔ اس کی لاش کسی نہ کسی طرح دستیاب ہو جائے گی اور پھر کہیں یہ نہ ہو کہ لوگ ہم تک پہنچ جائیں۔ یہ خطرناک ہوتا۔ میں نے پاشا کے لئے بیش بہا کارنامے انجام دیئے تھے لیکن یہ کارنامہ میرے ناکام کارناموں میں شامل نہ ہو۔ ابھی اسی سوچ بچار میں تھا کہ باہر گاڑی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور میں چونک پڑا۔

میں نے اپنے آپ کو پوشیدہ کرنے کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کی اور اس کے بعد آنے والوں کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے بڑے اطمینان سے سہیل کو پہچان لیا تھا جس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ سہیل کو دیکھ کر میں ایک لمحے کے لئے خاموش رہا اور اس کے بعد پھر اپنی چھپی ہوئی جگہ سے باہر نکل آیا۔ سہیل نے مجھے دیکھا اور پھر دوسرے لمحے یوں محسوس ہوا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو لیکن وہ منہ سے کچھ نہیں بولا تھا۔

اس کے دونوں ساتھی مجھے گھور رہے تھے۔

"کہو ابھی تک یہاں کیوں موجود ہو؟"

"تم سے کچھ بات کرنی ہے سہیل ان لوگوں کی غیر موجودگی میں۔"

"کیا مطلب؟"

"ان کو تھوڑی دیر کے لئے باہر بھیج دو۔" میں نے کہا اور سہیل نے ان کی طرف رخ کر کے گردن ہلا دی۔

وہ دونوں باہر نکل گئے تھے۔

"تمہارے لئے ایک بری خبر ہے سہیل۔" میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟ جلدی سے بتاؤ کیا ہوا؟ وہ کہاں ہے؟"

"وہ مارا گیا۔"

"کیوں؟" سہیل نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں سہیل کہ تم مجھے اس کے پاس کیوں لائے تھے؟ اور پیکٹ دینے کے بعد مجھے کیا کرنا تھا؟"

"تم جانتے ہو دوست کہ پاشا کے راز کسی کو نہیں معلوم ہوتے۔ مجھے جس قدر ہدایت ملی تھی میں نے اتنا ہی کیا لیکن تم۔ تم عجیب خبر سنا رہے ہو۔"

"وہ مجھے یہاں سے لے کر ایک ویرانے میں گیا جہاں دلدل جیسی جگہ پائی جاتی تھی اور پھر وہاں پہنچ کر اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ حملہ قاتلانہ نوعیت کا ہے۔ اگر میں ذرا بھی بے پروائی کرتا تو یقیناً وہ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں نے جوابی حملہ کیا لیکن اس وقت میرے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ میں اسے قتل کردوں۔"

"اوہ۔ پھر تو صورتِ حال خاصی گڑبڑ ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟"

"پوائنٹ زیرو فور۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"افسوس اس کے بارے میں مجھے کسی کو کچھ بتانے کی اجازت نہیں ہے لیکن تمہارا ساتھ چلنا بے حد ضروری ہے۔ کیا تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گے؟"

"اس کی لاش کا تم کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں اب میرا اس سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ اب تم میرے ساتھ پوائنٹ فور پر چلو اگر تم مناسب سمجھتے ہو لیکن ایک بات ضروری ہے وہ یہ کہ تمہیں انتہائی خاموشی سے اور جس طرح میں لے جانا چاہتا ہوں پوائنٹ فور تک چلنا پڑے گا۔ دیکھو دوست میں جانتا ہوں کہ پاشا کے گروہ میں تمہاری حیثیت معمولی نہیں ہے لیکن یہ سب جو میں کر رہا ہوں میری ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ یہاں تمہیں اس کی اجازت ہے کہ تم اپنے طور پر کوئی فیصلہ چاہو تو کرلو لیکن اگر تم میرے ساتھ پوائنٹ فور تک چلے تو پھر میری مرضی کے مطابق عمل کرنا ہوگا۔"

"میں جانتا ہوں کہ یہاں میں اپنی پسند کے مطابق کچھ نہیں کرسکتا کیونکہ مجھے راہنمائی کی ضرورت ہے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

"تمہاری آنکھوں پر کالی پٹی باندھنی پڑے گی۔ راستے میں کہیں گاڑی روکی جائے تو تم بالکل خاموش رہو گے اور اگر تمہارا نام براہ راست لے کر بھی مخاطب کیا جائے تو تم گونگے بنے رہو گے۔"

"یہ سفر کتنا طویل ہے؟"

"یہ سوال کرنے کی کوشش نہ کرو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

میں تیار ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں آدمی اندر آگئے اور سہیل نے انہیں کچھ ہدایات دیں۔ آنے والوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر ریشم کے سیاہ تسموں والی عینک اس طرح چڑھا دی کہ میرے لئے کچھ دیکھنا ممکن نہ رہا۔ پھر مجھے باہر لایا گیا اور دونوں بازوؤں سے سہارا دے کر کسی جیپ کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ ان میں سے ایک شخص میرے پہلو میں بیٹھ گیا اور دوسرے نے جیپ کا انجن اسٹارٹ کردیا۔ مجھے لے جانے والوں اور سہیل کے درمیان رسمی فقروں کا تبادلہ ہوا۔ پتا نہیں سہیل میرے ساتھ جا رہا تھا یا نہیں۔ بہرطور جیپ حرکت میں آگئی۔ نامعلوم اور خاموش راستوں پر جیپ کا یہ سفر جاری رہا۔ میرے کانوں میں انجن کے شور کے سوا کوئی دوسری آواز نہیں آرہی تھی۔ جس کی بنا پر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ یہ سفر کسی ویرانے میں کیا جا رہا ہے۔ ویسے بھی مجھے اس علاقے کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں تھیں۔ ہوا کی خنکی اور رخ کی بنا پر بھی یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ سفر کون سے علاقے میں ہے۔ کافی آگے بڑھنے کے بعد ناہموار راستہ شروع ہوگیا۔ جیپ بری طرح اچھل کود رہی تھی۔

میرے برابر میں بیٹھے ہوئے شخص کی وجہ سے آنکھوں تک ہاتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے انتہائی کوشش کی کہ اس سیاہ تسموں والی عینک سے نجات حاصل کرلوں لیکن اس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ جسم کا جوڑ جوڑ ہلا جا رہا تھا۔ یہ سفر کم وبیش چار گھنٹے جاری رہا۔ اس کے بعد جیپ آہستہ سے روک دی گئی۔

میں اس دوران جن ذہنی حالات سے گزرا۔ میرا دل ہی جانتا ہے لیکن یہ بات بھی میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پاشا اپنے کام پُراسرار بنانے کا عادی ہے۔ سیدھے سادے راستوں کا سفر بھی وہ پُراسرار ذریعے سے ہی طے کیا کرتا تھا۔ اسے الجھنوں کی عادت تھی اور ہر کام میں الجھن پیدا کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا لیکن بعض اوقات اس کا یہ محبوب مشغلہ دوسروں کے لئے کتنا پریشان کن بن جاتا ہے۔ اس کا اندازہ اس وقت مجھ سے زیادہ کسے ہوسکتا تھا۔ یہاں میری آنکھوں سے وہ عینک اتار دی گئی۔ باہر ہلکی روشنی پھیلی ہوئی تھی ایک دم مجھے بہت ناگوار لگی اور میں نے آنکھیں تیزی سے بند کرلیں۔ پھر میں آگے بڑھ گیا۔ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ہم نے کتنا سفر طے کیا ہے اور یہ جگہ کون سی ہے؟ لیکن بہرطور وہ لوگ مجھے ساتھ لئے آگے بڑھ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس عمارت میں داخل کردیا گیا جو میرے سامنے ہی تھی۔ عمارت کی غالباً تیسری منزل کے ایک کمرے میں مجھے پہنچانے کے بعد ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ میں یہاں آرام کرسکتا ہوں۔

کمرے میں آرام کرنے کے لئے آرام دہ بستر موجود تھا اور میں نے اس وقت کچھ سوچے سمجھے بغیر بستر ہی کا رخ کیا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا لیکن ابھی غالباً میری گلوخلاصی ممکن نہیں تھی۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوگیا۔ تیز روشنی میں میں نے سرخ چہرے اور نیلی آنکھوں والی اس لڑکی کو دیکھا جو دیکھنے کے قابل تھی۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے۔ جسم پر انتہائی چست اسکرٹ موجود تھا اور اس کا بدن کچھ عجیب وغریب انداز میں نمایاں تھا۔ چلنے کے انداز میں بھی مارلن منرو جیسی کیفیت تھی۔ میرے قریب آکر وہ بے تکلفی سے ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"میرا نام ڈینش ہے۔"

"ہیلو! اور مجھے اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ تمہارا یہاں آنا یہ بتاتا ہے کہ تم مجھ سے واقف ہو۔"

"سو فیصدی مسٹر جلال آپ سے ناواقفیت کیا معنی رکھتی ہے؟"

"پاشا کے ڈیپارٹمنٹ میں تمہارا کیا عہدہ ہے؟"

"تفصیلات اتنی ضروری نہیں ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں صرف تمہاری مزاج پُرسی کے لئے آئی تھی تمہیں زیادہ پریشان نہیں کروں گی۔ کیونکہ جانتی ہوں کہ تم تھکے ہوئے ہو لیکن میں اس عمارت میں موجود ہوں۔ اگر میری ضرورت پیش آئے تو کسی بھی ملازم سے مجھے پیغام بھجوا سکتے ہو۔"

میں نے اسے دیکھا اور پھر پُرخیال انداز میں گردن ہلادی۔ وہ جس طرح آئی تھی اسی طرح چلتی ہوئی واپس چلی گئی لیکن میرے ذہن میں اپنے نقش چھوڑ گئی تھی۔

دوسرے دن میں نے جاگنے کے بعد اس عمارت کے بارے میں اندازہ لگایا۔ غسل وغیرہ کرکے فارغ ہوا ہی تھا کہ ناشتا آگیا اور ناشتے کے ساتھ ساتھ ہی ڈینش میرے پاس پہنچ گئی۔

"میں نے سوچا کہ ناشتا تمہارے ساتھ ہی کیا جائے۔"

"بہت بہت شکریہ ڈینش لیکن میرا ذہن شاید پریشانیوں کا شکار ہے۔"

"افسوس تمہاری پریشانیوں کا حل میرے پاس نہیں ہے۔ مجھے ہدایت کردی گئی ہے کہ نہ خود تم سے اس بارے میں کوئی سوال کروں اور نہ تمہیں کسی ایسے سوال کا جواب دوں جس کا جواب پاشا سے ٹکراتا ہو۔"

"پاشا۔" میں نے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "وہ بعض معاملات میں بہت ہی عجیب انسان ہے۔"

"ہاں لیکن کیا تمہیں اس کی کارکردگی دلکش محسوس نہیں ہوتی؟"

"دلکش!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اپنا۔ اپنا خیال ہے۔ میں تو اس کے طریقۂ کار کو بہت پسند کرتی ہوں۔ بہرحال یہ سب بعد کی باتیں ہیں مجھے تمہارے ساتھ ایک مشترکہ مہم میں شامل ہونا ہے جس کی تفصیلات ہم دونوں ہی کو کہیں اور سے موصول ہوں گی۔"

"فی الحال میں صرف ناشتا کرنا چاہتا ہوں۔ پاشا کی مہمات میرے لئے جس قدر خوفناک بن گئی ہیں میں اب ان سے ذرا اکتاہٹ محسوس کرنے لگا ہوں۔ بہرطور میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پاشا کی ہدایت سے رُوگردانی کروں گا لیکن اس وقت تک میں اس کے بارے میں کچھ نہیں سننا چاہتا' جب تک میں پُرسکون نہ ہوجاؤں۔ ویسے تمہیں میرے ساتھ کب تک روانہ ہونا ہے؟"

"اتنی جلدی بھی نہیں ابھی کچھ وقت باقی ہے۔"

"بے حد شکریہ۔" میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ ہلکے عنابی رنگ کے سلیپنگ گاؤن میں ملبوس تھی اور اس کی شخصیت اس حال میں بھی بے حد خوبصورت نظر آرہی تھی۔ بہرحال میری یہ میزبان میرے لئے پسندیدہ حیثیت رکھتی تھی۔

اس بار پاشا نے جو مہم میرے سپرد کی تھی' درحقیقت اس کا کوئی سرپاؤں میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ پاشا کے اس طریقۂ کار کے خلاف احتجاج کا مؤثر ذریعہ کیا ہوسکتا ہے۔ کم ازکم اس سے یہ کہنا پڑے گا کہ جو لوگ ہربار اپنی مہمات میں کامیاب رہتے ہیں انہیں اگر اس بات سے آگاہ کردیا جائے کہ آنے والے وقت میں ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں تو یہ ذمہ داریاں آسانی سے پوری ہوجاتی ہیں۔ میں اس بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ڈینش کہنے لگی۔

"کہو جلال اب کس سوچ میں ڈوبے ہوئے ہو؟"

"کچھ نہیں مس ڈینش تمہارے اس قیامت خیز حسن کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم تو بہت سوں کے لئے عذاب بن چکی ہوگی۔"

"تمہارے لئے نہیں بنوں گی بے فکر رہو۔"

"خوش بختی سے میں اس دنیا کا انسان نہیں ہوں۔"

"یہی تو خطرناک بات ہے اور اس طرح کے لوگ ہمیشہ ہی مصیبتوں سے بچ جاتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم آئندہ بھی کبھی کسی ایسے جال میں نہیں پھنسنا ورنہ عذاب میں گرفتار ہوجاؤ گے۔"

"میں جانتا ہوں مگر جو سب سے بڑا ذہنی عذاب اس وقت میرے لئے موجود ہے وہ پاشا کی ہدایات ہیں۔ وینس میں اب اور اس کے بعد یہاں ڈومیسڈولا میں' میں نے جو کارروائیاں کی ہیں ان کا کوئی سرپاؤں میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"پاشا کے طریقۂ کار سے مجھے بھی اختلاف ہے ڈیئر جلال مگر کیا کیا جائے؟ اب دیکھو ہمیں ایسی مہم کے لئے مقرر کیا گیا ہے جس میں ہمیں مرکزی کردار ادا کرنے ہیں لیکن ہمیں کیا کرنا ہے اس بارے میں نہ مجھے معلوم ہے نہ تمہیں۔"

"میں تو اس پیکٹ کے لئے پریشان ہوں جو میرے ذریعے کسی شخص کو بھجوایا گیا تھا اور اس شخص نے مجھ پر ہی قاتلانہ حملہ کردیا۔ کیا یہاں پاشا سے کوئی غلطی ہوئی اور اس

نے کسی غلط شخص کا انتخاب کرلیا تھا یا پھر مجھ سے ہی غلطی ہوئی۔"

"میرا خیال ہے اب تم اس واقعے کو بھول جاؤ۔ پاشا کو یقینی طور پر یہ اطلاع مل چکی ہوگی کہ صورتِ حال کیا ہوگئی ہے۔ اگر اسے کوئی اعتراض نہیں ہوا اس بدلی ہوئی صورتِ حال پر تو پھر تم کیوں پریشان ہو۔ ہوسکتا ہے پاشا کا یہی مقصد ہو کہ وہی شخص تم پر قاتلانہ حملہ کرے اور تم اسے ہلاک کردو۔"

"بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی مجھے اس گھماؤ پھراؤ کے بغیر ہی یہ ہدایت دی جاسکتی تھی۔ بہرحال میں اس واقعہ کو نظرانداز کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا ہے؟"

"موصول شدہ ہدایات کے مطابق اب سے تھوڑی دیر کے بعد ہم روانہ ہوجائیں گے۔ مجھے ایک مخصوص لباس پہننے کی ہدایت کی گئی ہے اور اس کے بعد ہم دونوں کو ایک ہوٹل میں پہنچنا ہے۔"

میں خاموش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے مجھ سے جانے کی اجازت چاہی وہ لباس تبدیل کرنے کے لئے جانا چاہتی تھی مجھ سے بھی وہ یہی کہہ گئی تھی کہ میں تیار ہوجاؤں۔

جب وہ تیار ہوکر باہر آئی تو میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ ویسے ہی حسین صورت تھی اور جسمانی طور پر تو وہ بہت ہی خوبصورت عورت تھی لیکن اس وقت اس نے جو میک اپ کیا تھا۔ وہ عجیب وغریب کیفیت کا حامل تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، خم دار لمبی لمبی پلکیں جو خمار سے ڈھلکی ہوئی تھیں۔ پتلی اور ستواں ناک۔ بھرے بھرے رخسار۔ رنگت ویسے ہی سرخ وسفید تھی ہلکے سے میک اپ نے کمال دکھایا تھا۔ گہرے اور چمکیلے سرخ رنگ کی لپ اسٹک پر پڑنے والی روشنی کے سبب اس کے ہونٹوں پر شبنم کے قطرے چمکتے نظر آرہے تھے۔ بہرطور میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ باہر نکل کر اس نے گاڑی کی چابی میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ڈرائیونگ تم خود کروگے۔"

میں نے خاموشی سے گاڑی کی چابی لی اور گاڑی میں جابیٹھا۔ وہ میرے نزدیک آکر بیٹھ گئی تھی۔ ایسا عجیب وغریب سا ماحول پیدا ہوگیا تھا کہ میں اپنے حواس پر قابو پانے میں ناکام سا محسوس کررہا تھا۔

سڑک ویران پڑی ہوئی تھی۔ ہم لوگ زیادہ دور نہیں گزرے تھے کہ دفعتاً عقب

نا آئینے میں مجھے ایک گاڑی کی جھلک نظر آئی۔ وہ یقیناً ہمارا تعاقب کررہی تھی۔ شاید میں
ں کی طرف متوجہ نہ ہوتا کیونکہ اس وقت میری تمام توجہ ڈینش پر مبذول تھی لیکن وہ
ڑی اپنے آپ کو چھپا نہیں پائے تھے۔ جب بھی ایک دو گاڑیاں ہمارے درمیان حائل
ہوتیں وہ انہیں اوورٹیک کرکے ہمارے عقب میں آجاتے۔ دوسری گاڑیوں کو اوورٹیک
کرکے میری گاڑی کے پیچھے آنا اور پھر میری گاڑی سے آگے نہ نکلنا اس بات کی نشاندہی
کرتا تھا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہے ہیں۔ میں چند لمحات سوچتا رہا پھر میں نے ڈینش سے کہا۔

"ڈینش ہمارا تعاقب ہورہا ہے۔"

ڈینش نے بے اختیار پیچھے پلٹ کر دیکھا تو میں نے اس کی ران پر زور سے ہاتھ
ادیا۔

"یہ کیا بے وقوفی ہے؟"

وہ ایک دم سنبھل گئی تھی اور پھر اسے اندازہ ہوگیا کہ بے ساختگی میں اس سے
لطی ہوئی تھی میں چند لمحات اس گاڑی کے تعاقب کا اندازہ کرتا رہا پھر میں نے ڈینش سے
چھا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

"میرا خیال ہے ہمیں ہوٹل فزارو پہنچ جانا چاہئے جس کی ہمیں ہدایت کی گئی ہے۔"

"اور یہ لوگ؟"

"جو کچھ بھی ہے اس سے انہیں واقف ہونا چاہئے۔ جنہوں نے ہمیں ہوٹل فزارو
پنچے کی ہدایت کی ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر گردن ہلائی اور تھوڑی دیر کے بعد میں فزارو کے
لنگ لاٹ میں پہنچ گیا۔

جب میں احاطے میں گاڑی پارک کررہا تھا تو میں نے اس کار کو دیکھا جو رینگنے کے
انداز میں ہوٹل کے صدر دروازے کے سامنے سے سڑک پر آگے بڑھ گئی تھی۔ مجھے
میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہوسکا۔ بہرطور میں ڈینش کے
تھ ہوٹل میں داخل ہوگیا۔

ڈینش اس وقت واقعی دیکھنے کی چیز بنی ہوئی تھی اس لئے بہت سے لوگوں کی نظروں
مرکز بن گئی۔ ہم دونوں ابھی ہوٹل کے ہال میں داخل بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک
لے پتلے سے بدن کا آدمی بڑبڑانے کے سے انداز میں ہم سے کچھ کہتا ہوا آگے بڑھا میں
لے تو اس کے الفاظ نہیں سنے تھے لیکن ڈینش نے سن لئے وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

"جلال، تمہیں ہوٹل کے بغلی حصے میں پارک میں جانا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"میں اندر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ ابھی تم نے اس شخص کی بڑبڑاہٹ نہیں سنی؟"

"نہیں تو۔"

"اس کا احساس بھی نہیں کیا جو ہمارے قریب سے گزر کر اندر داخل ہو گیا؟"

"نہیں۔"

"وہ یہ کہتا ہوا گزرا ہے کہ مسٹر جلال ہوٹل کے بغلی لان میں پہنچ جائیں۔ وہاں ان کا انتظار کیا جا رہا ہے۔"

"تم نے سنا تھا؟"

"بہت اچھی طرح اور اس شخص کو بھی کم از کم صورت کی حد تک جانتی ہوں۔ ایک دو بار ہمیں اس کے ذریعہ پیغامات مل چکے ہیں۔"

"اوہ! تب تم اندر جاؤ میں آرہا ہوں۔" میں نے کہا اور پھر میں ہوٹل کے بغلی لان کی جانب چل پڑا۔

بغلی لان اس وقت بالکل خالی تھا۔ صرف ایک آدمی ایک درخت کی آڑ میں کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے گردن خم کی اور مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ چونکہ اور کوئی یہاں موجود نہیں تھا اور پھر اس شخص نے شناساؤں کے سے انداز میں مجھے بلایا چنانچہ میں پھرتی سے اس کے قریب پہنچ گیا۔

"مسٹر جلال؟" اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا اور دفعتاً ہی اس کا ہاتھ باہر آگیا۔

میں نے اس کے ہاتھ میں ریوالور صاف دیکھ لیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں حیران رہ گیا لیکن مجھے موقع مل گیا تھا۔ ریوالور سامنے آتے ہی میں نے پوری قوت سے اس کے ہاتھ پر اپنی ایک ٹانگ ماری اور اسے موقع دیئے بغیر اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا میں نے عقب سے اس کے شانے پر سر کی زور دار ٹکر رسید کی تھی۔ اس شخص کو شاید اس قدر فوری ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ لہٰذا وہ کراہتا ہوا اوندھا گر گیا اور میں نے اسے زمین سے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کے سینے پر چڑھ کر اس کے ہاتھوں میں دبا ہوا ریوالور چھین لیا اور اس کے بعد اس کی گردن پر ایک زور دار مکہ رسید کر دیا۔ جس کی وجہ سے اس کا سر چکرا گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ زمین سے ٹکا کر مجھے اپنی پشت پر سے

پھینکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ تب میں نے اسے سیدھا کر دیا اور پھر پوری قوت صرف کر کے اس کے جبڑے پر زور دار گھونسے برسائے۔ وہ بھی لڑائی بھڑائی کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگیں پیچھے سے اٹھا کر میری گردن پر پنڈلیوں کی قینچی لگا دی اور میں اپنے ہی زور میں گھاس پر جا گرا۔ گردن کی ہڈی پر پڑنے والا زور اتنا شدید تھا کہ ریوالور میرے ہاتھ سے بھی نکل گیا۔ اس نے میری گردن اپنی ٹانگوں میں جکڑے میری پسلیوں پر ایک شدید ضرب لگائی اور مجھے چھوڑ دیا۔ میں اس کی گرفت سے نکلتے ہی زمین سے اٹھا تو ایک بار پھر ریوالور کی نال میرے سینے کی جانب اٹھی ہوئی تھی اور وہ آستین سے اپنا دہانہ صاف کر رہا تھا۔

"کتے کے بچے میں تجھ سے اس بدتمیزی کا بدلہ ضرور لوں گا۔" اس نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ریوالور کے زور پر!" میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو چلو پارکنگ لاٹ کی جانب چلو۔ یاد رکھنا اگر بھاگنے کی کوشش کی تو پورے بدن میں سوراخ ہی سوراخ ہو جائیں گے۔"

میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب اس کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے چنانچہ میں آگے بڑھ گیا اور تھوڑی دیر کے بعد لان کے قریب پہنچ گیا جہاں پارکنگ لاٹ تھی۔ اس نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر میری طرف بڑھائی اور بولا۔

"وہ نیلے رنگ کی ڈاج گاڑی جو کھڑی ہے اس کا دروازہ کھولو اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لو۔"

"لیکن تم؟"

"فکر مت کرو میری جان' میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"اور وہ لڑکی؟"

"ہر قسم کی لڑکی پر اس وقت لعنت بھیج دو موت جب سامنے نظر آئے تو لڑکیوں کی پرواہ نہیں کی جاتی۔" اس نے کہا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ بہت چوکنا آدمی ہے اور میری کوئی بھی حرکت اس بار میرے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے اس کی ہدایت پر عمل کئے بغیر اور کوئی چارہ کار نہ پایا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا ور گاڑی اسٹارٹ کر کے بڑھا دی۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گیا تھا تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ فرازو سے کافی دور نکل آئے میں اس کے

اشارے پر سفر کر رہا تھا اور ڈاج ان طویل اور ویران شاہراہوں پر چل رہی تھی جس کے دونوں طرف بے آب وگیاہ میدان اور بھوری پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں چند لمحات سوچتا رہا اپنے اس طرح پھنس جانے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ نہ جانے ڈینش میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہوگی میں نے چور نگاہوں سے اپنے نزدیک بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اگر اس بار پھر میں اس پر وار کروں تو اس کا طریقۂ کار کیا ہوسکتا ہے۔ تھوڑی دور نکلنے کے بعد جب میں نے چاروں طرف سنسان اور غیر آباد علاقے دیکھے تو آہستہ سے اس سے کہا۔

"ہمیں کہاں جانا ہے؟"

"جہنم میں۔" وہ جلے بھنے لہجے میں بولا۔

"لیکن جہنم کا راستہ تو اس طرف سے نہیں گزرتا۔"

"زیادہ بکواس کی تو اس کا نتیجہ بھگتو گے۔" اس نے کہا اور میں نے گردن ہلادی۔

دفعتاً میں نے گاڑی کے بریک پر پورا دباؤ ڈالا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گیئر نیوٹرل کردیا تھا اس دباؤ سے وہ ایک دم آگے کی جانب جھکا اور اس کا سر ڈیش بورڈ سے ٹکرا گیا میں نے فوراً ہی گاڑی کا رخ تبدیل کرکے اس کو کچے راستے میں اتار دیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑا گیا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں موجود تھا۔ چنانچہ کوئی بھی حرکت ہوسکتی تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ مجھے کچھ عمل کرنا چاہئے۔ چنانچہ ایک بار پھر میں نے بریکوں پر پورا دباؤ ڈالا گاڑی جو سڑک سے اترنے میں ویسے ہی الٹ پلٹ ہوگئی تھی اس زوردار طریقے سے رکی کہ اس بار وہ شخص باقاعدہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر سامنے والے شیشے سے ٹکرایا تھا۔ میں نے اس کا سر شیشے میں گھسیڑ دیا اور اس کی گردن پر زور آزمائی کرنے لگا پھر میں نے نیچے ہاتھ ڈال کر اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ اب اس پر زور آزمائی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے گاڑی کا سوئچ آف کردیا اور دروازہ کھول کر پھرتی سے باہر کود گیا۔ اب میرے ہاتھ میں پستول دوبارہ آچکا تھا۔ چنانچہ میں نے سرد لہجے میں اس سے نیچے اترنے کے لئے کہا۔ وہ دہشت کے عالم میں فوراً ہی باہر نکل آیا تھا۔

"ہاں میری جان وقت پھر آگیا ہے کہ تم مجھے میرے سوالات کے جواب دو۔ اندازہ لگا چکے ہو کہ اطراف میں کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ تمہاری کوئی بھی حرکت تمہارے لئے نقصان دہ ہوسکتی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے بارے میں تفصیلات بتادو۔"

وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر دفعتاً اس نے اپنے لباس کی

جانب ہاتھ بڑھائے لیکن میں نے پستول کی نال اس کی پیشانی پر رکھ دی۔

"خبردار۔ خبردار تم جانتے ہو کہ میرے لئے تمہاری موت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ ٹھہرو ہاتھ اوپر اٹھادو۔"

اس نے بے چارگی کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھ بلند کردیئے تھے۔ میں نے اس کے جسم کے اس حصے کو ٹٹولا' جدھر اس نے ہاتھ بڑھائے تھے اور وہاں سے مجھے ایک لمبا چاقو حاصل ہوگیا۔ ویسے یہ اس کی اضطراری کیفیت ہی تھی کیونکہ پستول کے سامنے چاقو بھلا کیا حیثیت رکھتا تھا۔ میں نے چاقو نکال لیا اور پھر کسی خیال کے تحت میں نے پستول جیب میں رکھ کر چاقو کھول لیا۔ یہ اندازہ ہوچکا تھا کہ اب اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں ہے۔

"ہوں! اب اگل دو دوست' ورنہ کیا فائدہ کہ میں پہلے تمہاری ناک کاٹ دوں۔ اس کے بعد تمہارے دونوں ہونٹ پھر تمہارے دونوں کان تمہارے چہرے سے جدا کردوں اور اس کے بعد یہ چاقو تمہارے حلق میں پیوست کردوں۔"

"نہیں۔ نہیں مجھے قتل کرکے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

"اسی لئے میں تمہیں قتل نہیں کرنا چاہتا مگر یہ بتانا ضروری ہے کہ تم مجھے کہاں لے جارہے ہو؟"

"لیول کراس۔" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"وہاں کچھ لوگ تمہارے استقبال کے لئے موجود ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کس طرح کا استقبال؟"

"وہ.......... وہ تمہیں قتل کریں گے۔ وہ.......... ان کے سپرد یہی ذمہ داری کی گئی ہے۔"

"مگر کیوں؟ کون ہے جو میرے قتل کا خواہش مند ہے؟"

"یہ.......... یہ میں نہیں جانتا۔" اس نے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔ تمہیں جواب دینا ہے۔"

"میں نہیں بتاؤں گا تم مجھے قتل کردو۔ میں نہیں بتاؤں گا۔"

"مجھے پتا چل جائے گا میرے دوست۔ تم اس سلسلے میں پریشان نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے مگر میں تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میں نے چاقو والا ہاتھ سیدھا کیا اور اس کے پیٹ میں پیوست کردیا پھر میں نے چاقو کو حلق تک کھینچ دیا تھا لیکن مجھے فوراً ہی پیچھے ہٹنا پڑا کیونکہ اس کا اچھلتا ہوا خون میرے اوپر آیا تھا جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا تھا میں نے گاڑی میں واپس بیٹھنے کے بعد اس کا اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ چاقو میں نے وہیں صاف کرکے پھینک دیا تھا لیکن میرا حلیہ خراب ہوگیا تھا۔ لباس پر شکنیں تھیں۔ قمیض پر خون کے کئی دھبے چمک رہے تھے۔ بہرطور یہ پریشان کن بات ہی تھی کیونکہ میں اس حالت میں واپس ہوٹل فزارو نہیں جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فزارو جانے کا ارادہ بدل دیا اور اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ یہاں داخل ہونے کے لئے میں نے خون کو چھپانے کی زبردست کوشش کی تھی اور جہاں تک ممکن ہوسکتا دوسروں کی نگاہوں سے بچتا بچاتا لفٹ تک پہنچا تھا۔ یہ بھی خوش بختی تھی کہ اس وقت لفٹ میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ چنانچہ لفٹ نے مجھے میری منزل تک چھوڑ دیا اور میں تیزی سے راہداری کو عبور کرتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے پر آرکا۔ میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوگیا لیکن سوئچ آن کرتے ہوئے دفعتاً ہی مجھے احساس ہوا کہ کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور موجود ہے۔ اس سے قبل کہ میں پستول نکالنے کی کوشش کرتا کسی ریوالور کی ٹھنڈی نال میری گردن سے آچپکی تھی اور دوسرے لمحے میرے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا گیا تھا۔ میرے ہاتھ سوئچ تو دبا ہی چکے تھے چنانچہ اس کے ساتھ ہی تیز روشنی میں، میں نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے شخص کو دیکھا۔ وہ کافی قدآور آدمی تھا اور اس کے ہاتھ میں اعشاریہ سات تین کا ریوالور دبا ہوا تھا۔ اس کا بدن چوڑا اور کسرتی معلوم ہوتا تھا سر پر چھوٹے چھوٹے بال، پیشانی کے عین درمیان تلوار کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی مگر چمکیلی تھیں اور وہ ان چمکیلی آنکھوں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے کوٹ پر ہاتھ پھیرا غالباً کسی دوسرے ریوالور کی موجودگی کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ جب اسے یہ یقین ہوگیا کہ میرے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں ہے تو اس نے انگلی چبھو کر مجھے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے بولا۔

"دیکھو یہ ریوالور جو ہے نا اس کے اوپر نفیس قسم کا سائیلنسر لگا ہوا ہے اور گولی چلنے کی آواز اتنی ہلکی ہوگی کہ شاید میرے اور تمہارے علاوہ اور کوئی نہ سن سکے میں اطمینان سے تمہیں قتل کرکے تمہاری لاش کھڑکی کے نیچے پھینک دوں گا اور کوئی نہیں جان سکے گا کہ تم کبھی یہاں آئے تھے۔"

"تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

"میں کون ہوں اس سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہئے جہاں تک میری چاہت کا سوال ہے تو میرے پیارے دوست تمہیں واپس نیچے اترنا ہے اور میرے ساتھ لیول کراس تک چلنا ہے۔ اس معمولی سے آدمی کو قتل کرنے کے بعد تم نے اپنے آپ کو شاید کوئی زبردست قاتل سمجھ لیا ہوگا لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔"

میں سناٹے میں رہ گیا۔ یہ پھرتی قابل تعریف تھی میں ابھی تو واپس آیا تھا لیکن میرے پہنچنے سے پہلے یہ شخص معلومات حاصل کرکے یہاں تک پہنچ گیا کہ میں اپنے دشمن کو قتل کرکے واپس فزارو جانے کی بجائے اس طرف آگیا ہوں۔ مجھے تو یہ سب جادوئی کارنامہ معلوم ہوتا تھا لیکن ایک بار پھر میرے اندر وہی تجسس جاگ اٹھا تھا۔ ان تمام چیزوں کے پس پشت کون ہے؟ البتہ یہ اندازہ میں نے لگالیا تھا کہ اگر کسی طرح میں اس شخص کو زیر کرنے میں کامیاب ہوجاؤں تو اس کے چہرے کی بناوٹ سے یہ پتا چلتا تھا کہ وہ سخت گیر آدمی ہے۔ جان دے دے گا لیکن زبان نہیں کھولے گا۔ ایسے حالات میں کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہئے تھی کہ اصلیت بھی کھل جائے اور مجھے کوئی نقصان بھی نہ پہنچ سکے۔ میں نے پُرخیال انداز میں ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔

"لیول کراس تک جانے کی کیا ضرورت ہے جو شخص مجھے لیول کراس لے جارہا تھا اس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو کیا قتل کرکے لئے یہ جگہ موزوں نہیں ہوگی؟"

"نہیں ہرگز نہیں۔ چلو اب زیادہ دیر نہیں کرو۔ تم نے پہلے ہی کافی وقت ضائع کردیا ہے" اس نے کہا۔

بچنے کی کوئی صورتِ حال سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ویسے مجھے ہوٹل کی سیڑھیاں طے کرنی تھیں، ہوسکتا تھا راستے میں کوئی ایسا موقع مل جائے کہ میں اس شخص کو چکر دینے میں کامیاب ہوجاؤں۔ اس تصور کے ساتھ میں واپس پلٹ پڑا وہ ریوالور جیب میں ڈال کر میرے پیچھے آرہا تھا لیکن دروازے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے کہا۔

"میرے تمہارے درمیان فاصلہ چار فٹ رہے گا اور تم بالکل سیدھے دونوں ہاتھ زمین کی طرف کئے باہر نکلو گے۔ میں نے جہاں بھی تمہاری پوزیشن میں تبدیل محسوس کیا ذہن میں تمہاری پشت میں عین دل کے مقام کا نشانہ لے کر گولی اتار دوں گا۔ اس بات کو ذہن میں رکھنا۔ میں جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں۔"

میں نے اس بات کو ذہن میں رکھ لیا کہ یہ جو کچھ کہتا ہے وہی کرتا ہے چنانچہ اب اس کے علاوہ اور کیا چارۂ کار تھا کہ میں اس کے ساتھ ساتھ ہی باہر نکل آؤں۔ چنانچہ میں آگے بڑھ گیا وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے راہداری میں نکل آیا۔ کمرے کا خود کار درواز ہمارے پیچھے مقفل ہوگیا تھا میں اس کے ہمراہ لفٹ کے بجائے سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کررہا تھا۔ پہلی منزل پر وہ دانستہ مجھ سے کافی پیچھے رہ گیا۔ کافی وقت ہوگیا تھا۔ زندگی کے ہنگامے عروج پر تھے اور دبے دبے قہقہوں کی آوازیں آرکسٹرا کے ساتھ ابھر رہی تھیں۔ وہ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر جیب میں ہاتھ ڈالے بے پروائی سے چلا آرہا تھا۔ میں نیچے اتر کر اس کے بتائے ہوئے راستے پر سیدھا چل پڑا۔ باہر موسم کافی سرد تھا اور ہوا کے تیز جھونکے برف کے ذرات کی مانند چہرے سے ٹکرا رہے تھے۔ فٹ پاتھ ویران پڑا تھا میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا تو وہ کم بخت شیطان کی مانند میرے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا لیکن اس کے قدموں کی آواز نہیں ہورہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی کار میں بیٹھنے کی بجائے پیدل ہی سفر کرنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد جب آس پاس کوئی نظر نہیں آیا تو وہ میرے قریب آگیا۔

"چلتے رہو۔ چلتے رہو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے کیا پیدل ہی سفر کروگے؟ جانا کہاں ہے؟"

"چلتے رہو میری جان تمہیں سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔" اس نے کہا اور میں پریشانی سے آگے بڑھ گیا۔

میں اس کے ساتھ چند گز آگے بڑھا تو عقب سے ایک کار ہمارے قریب رک گئی اور ڈرائیور نے نیچے اتر کر دروازہ کھول دیا۔ میں نے ایک گہری سانس لی تھی۔ اس کا مقصد ہے وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ کوئی اور تو میرے عقب میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ اب واحد موقع تھا کہ اگر کچھ کیا جاسکتا ہے تو کرلیا جائے ورنہ صورتِ حال خراب ہوجائے گی۔ جونہی کار کا دروازہ کھولنے والا نیچے جھکا اور اس نے ہمارے بیٹھنے کے لئے دروازہ کھولا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی گردن پکڑ کر اپنی ڈھال بنالیا تھا۔ میرا اندازہ درست تھا۔ ٹھس کی ایک آواز ہوئی اور گولی اس شخص کے سینے میں اتر گئی جسے میں نے ڈھال بنایا تھا لیکن اب دوسرا لمحہ ضائع کرنا موت کو آواز دینا تھا۔ میں نے پوری قوت سے زخمی شخص کو اپنے عقب میں کھڑے ہوئے شخص پر اچھال دیا۔ وہ اس غیر متوقع حرکت کو برداشت نہ کرسکا اور زخمی کے نیچے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ سنبھلنے بھی

نہیں پایا تھا کہ میری بھرپور ٹھوکر اس کی پیشانی پر پڑی اور یہ چونکہ زندگی بچانے کا مسئلہ تھا اس لئے اپنی اس طاقتور ٹھوکر کا اندازہ مجھے خود بھی نہیں ہوسکا۔ اس ٹھوکر نے اس کی پیشانی کی ہڈی توڑ دی تھی۔ وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی مانند زمین پر تڑپنے لگا اور میں اس سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوکر اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس کے سر سے خون کی دھار نکل کر زمین پر پھیل رہی تھی اور وہ بری طرح زمین سے منہ رگڑتا ہوا اِدھر اُدھر ٹکریں کھا رہا تھا۔ غالباً میرے جوتے کی ٹھوکر اس کے دماغ پر پہنچ گئی تھی مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص اس طرح ہلاک ہوجائے گا۔ میں چند لمحات تو بدحواس سا رہا اور اس کے بعد مجھے احساس ہوا کہ آس پاس کوئی نظر بھی آسکتا ہے چنانچہ یہاں سے ہٹ جانا بہتر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ان دونوں آدمیوں کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوجاؤں۔ وہ شخص جس نے کار سے اتر کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی تھی اور میرے دشمن کی گولی کا شکار ہوگیا تھا دم توڑ چکا تھا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد میں نے اس شخص کو بھی ساکت ہوتے ہوئے دیکھا۔ ظاہر ہے اس کے بچنے کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک عجیب صورتِ حال درپیش تھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ اس بے چاری ڈنیش کو میں ہوٹل میں چھوڑ آیا تھا اور اس کے بعد ان مصیبتوں سے دوچار ہورہا تھا۔ اب اس بات کا امکان تو نہیں تھا کہ ڈنیش وہیں فرارو میں مل جائے اور واپس ہوٹل میں جانا مزید خطروں کو دعوت دینا تھا۔ چنانچہ بہتر یہی تھا کہ کہیں اور وقت گزاروں۔ سوچنے سمجھنے کے لئے کچھ لمحات درکار تھے اور ان کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ ایک لمحہ کے لئے میرے ذہن میں خیال آیا کہ اگر میں ابھی فوراً واپس جاکر ہوٹل سے اپنا مختصر سا سامان لے لوں تو کم از کم کسی کو یہ اندازہ نہیں ہوسکے گا کہ میں یہاں پھر واپس آگیا ہوں۔ کپڑے تبدیل کرنا بھی ضروری تھا۔ میں تمام خطرات کو نظرانداز کرکے واپس ہوٹل کی طرف دوڑا اور تھوڑی دیر کے بعد بغیر کسی حادثے کے دوچار ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوگیا۔ یہ کمرہ اب میرے لئے جس قدر خطرناک بن چکا تھا اس کا مجھے خود بھی اندازہ تھا لیکن کیا کیا جاتا کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔ میں نے لباس تبدیل کیا اور وہ تمام چیزیں اپنی جیبوں میں ٹھونس لیں جو میرے لئے بہت اہمیت رکھتی تھیں اور اس کے بعد کمرے سے خاموشی سے باہر نکل آیا۔ رات گزارنے کے لئے اب کسی ایسے شبینہ کلب یا ہوٹل کی ضرورت تھی جہاں تھوڑا سا سکون مل سکے اور میں ان واقعات کے بارے میں سوچ سکوں۔ اس سلسلے میں مجھے زیادہ جستجو نہیں کرنا پڑی۔ تھوڑا سفر طے کیا تھا کہ ایک شراب خانے کے

نیون سائن نظر آئے اور میرا رخ اسی جانب ہوگیا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ اس بار میرے ساتھ کیا بیتے گی۔ بہرطور میں اندر داخل ہوگیا۔ نیچی چھت والے ہال میں رنگین روشنیوں کی جھالریں جگمگا رہی تھیں۔ ایک رقاصہ میزوں کے درمیان تھرکتی پھر رہی تھی۔ ہال کے ایک سرے پر بنے ہوئے دو فٹ اونچے اسٹیج پر سازندے ساز تیز آواز سے ساز بجا رہے تھے اور رقاصہ ہر بدلتے ہوئے سُر کے ساتھ اپنے بدن کو ڈھال رہی تھی۔ میزوں پر ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ موجود تھے۔ فضا شراب اور تمباکو کی ملی جلی بُو سے بوجھل تھی۔ بہت سے لوگ بہک رہے تھے۔ میں نے اپنے لئے ایک میز منتخب کی اس پر بیٹھ کر میں نے ویٹر کو کچھ آرڈر دے دیئے۔ پھر میں ان تمام ہنگاموں کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب تک تو کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دے سکا تھا جس سے یہ اندازہ ہوسکتا کہ میں پاشا کے لئے کچھ کررہا ہوں۔ پتا نہیں اس بدبخت پاشا نے کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے کوئی مقصد تو ہو۔ کوئی ایسا کام تو ہو جس سے یہ اندازہ ہوسکے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ بہت دیر تک سوچتا رہا پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا کیوں نہ پاشا کے آدمیوں سے رابطہ قائم کروں اور اپنی موجودہ صورتِ حال بتا دوں۔

اس کا ایک مخصوص طریقۂ کار تھا یعنی جہاں جہاں پاشا کے نمائندے کام کررہے ہوتے تھے وہاں کے ٹیلی فون نمبروں کی فگرز کے مطابق اتنی ہی دفعہ زیرو ڈائل کرکے پاشا سے رابطہ قائم کیا جاسکتا تھا۔ یعنی اگر کسی شہر میں ٹیلی فون کے نمبر پانچ تک ہیں تو وہاں پانچ دفعہ صفر ڈائل کرلیا جائے۔ پاشا کے آدمیوں سے رابطہ قائم ہوسکتا تھا اور اگر کہیں چھ یا سات نمبر ہوں تو اسی تناسب سے اتنی دفعہ صفر ڈائل کرکے کام کیا جاسکتا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا شراب خانے کے اس ہنگامے میں تو ٹیلیفون کرنا مشکل تھا لیکن شراب خانے میں داخل ہونے سے پہلے میں نے سڑک پر ٹیلی فون بوتھ دیکھا تھا۔ چنانچہ میں جلدی جلدی اپنی منگائی ہوئی اشیاء ختم کرکے اور بل کی رقم ادا کرکے اپنی جگہ سے اٹھ گیا اور باہر نکل آیا۔

ٹیلی فون بوتھ تک پہنچنے میں مجھے ایک ڈیڑھ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوا تھا میں نے بوتھ میں داخل ہونے کے بعد وہاں کے نمبروں کے مطابق صفر ڈائل کئے اور ریسیور کان سے لگالیا چند لمحات کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی۔

"کالا دل۔"

"میں جلال بول رہا ہوں تم جو کوئی بھی ہو شاید میرے بارے میں........" ابھی میں

نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اوہ! ڈیئر جلال میں سہیل ہوں۔"

"کہاں ہو؟ کہاں مر رہے ہو؟ تمہیں کم از کم میرے بارے میں معلومات رکھنا چاہئے تھیں۔"

"کیوں خیریت، تمہیں کیا ہوا؟"

"ٹیلی فون پر ہی تفصیل بتا ڈالوں کیا تم مجھ سے ملاقات نہیں کرسکتے؟"

"کیوں نہیں؟ کیوں نہیں؟ میں تمہارے پاس آسکتا ہوں کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

جواب میں، میں نے سہیل کو شراب خانے کے نام کے بارے میں بتایا اور پھر کہا کہ میں اس کے سامنے کے ٹیلی فون بوتھ پر ہوں۔ سہیل نے مجھ سے کہا کہ وہ دس منٹ کے اندر اندر میرے پاس پہنچ جائے گا۔ ٹیلی فون بند کرکے میں باہر نکل آیا اور پھر یہ دس منٹ میں نے ٹیلی فون بوتھ کے آس پاس ٹہلتے ہوئے گزارے تھے۔ آٹھویں منٹ پر ہی میں نے سرخ رنگ کی ایک کار کو دیکھا جو آہستہ آہستہ میرے قریب آکر رک گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر سہیل موجود تھا۔ میں خاموشی سے اس کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا اور سہیل نے کچھ کہے بغیر کار آگے بڑھا دی۔ اس بار وہ کئی مختلف راستے طے کرتا ہوا ایک عمارت میں داخل ہوا تھا۔

عمارت کی دوسری منزل کے ایک فلیٹ کے دروازے پر پہنچ کر سہیل نے دروازے کے لاک میں چابی گھمائی اور مجھے ساتھ لئے ہوئے اندر داخل ہوگیا۔ اس دوران میرے اور اس کے درمیان ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا تھا۔ اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد وہ خود بھی میرے سامنے آبیٹھا اور پھر مسکراتی نگاہوں سے مجھے دیکھ کر بولا۔

"ہاں مسٹر جلال کہئے خیریت کیا بات ہے؟"

"مجھ سے کہا گیا تھا کہ اس بار مجھے جو مہم درپیش ہے اس کی تفصیلات مجھے یہاں معلوم ہوں گی لیکن ابھی تک میں کسی بھی قسم کی تفصیل سے محروم ہوں۔ اس کے برعکس مجھ پر مسلسل قاتلانہ حملے ہورہے ہیں۔ ان کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔"

"قاتلانہ حملے؟" سہیل نے متحیرانہ انداز میں کہا۔

"جس شخص کے پاس تم مجھے چھوڑ کر آئے تھے اس کے بارے میں تفصیل میں نے تمہیں نہیں بتائی؟"

"میرا خیال ہے مسٹر جلال کہ یہ سب کچھ اسکیم کا حصہ تھا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں........."

"ہاں۔ ہاں میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن میں اب ان حالات سے نکلنے کا خواہش مند ہوں۔ پاشا تک میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ میں تفصیل بتائے بغیر اب کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"مگر میرا خیال ہے مسٹر جلال جو کچھ آپ کر رہے ہیں وہ پاشا کی اسکیم کے مطابق ہی ہے۔"

"مگر یہ کیسی اسکیم ہے جس کا کوئی فائدہ یا نقصان ابھی تک میرے سامنے نہیں آیا۔"

"میرے خیال میں پاشا اس بارے میں زیادہ جانتا ہوگا۔"

"بہرطور میں اب ان حالات سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

"اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو میرا خیال ہے مجھے اس سلسلے میں اپنے ڈیپارٹمنٹ کو اطلاع دے دینی چاہئے۔"

"ہاں بہتر یہی ہے۔" میں نے جواب دیا اور سہیل اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

"براہ کرم مجھے چند منٹ کی اجازت دیں۔"

میں نے کچھ نہ کہا۔ وہ باہر نکل گیا اور میں خاموشی سے صوفے پر بیٹھا اپنی پیشانی مسلتا رہا۔ پھر دروازے پر آہٹ ہوئی۔ غالباً سہیل کچھ بات کر کے اندر آیا تھا لیکن دروازے سے داخل ہونے والا سہیل نہیں تھا۔ جو شخصیت اندر آئی تھی اسے دیکھ کر میں ایک لمحے کے لئے حیران رہ گیا۔ یہ ڈینش ہی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے آٹو میٹک کی نال میری جانب اٹھی ہوئی تھی دفعتاً اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاتھ اوپر اٹھالو۔"

میں حیرت سے منہ کھول کر رہ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ یقیناً یہ ڈینش ہی تھی۔ ڈینش کے پیچھے ہی سہیل بھی اندر آگیا اور ڈینش نے سرد لہجے میں کہا۔

"اس کی تلاشی لو۔"

سہیل خاموشی سے میرے قریب پہنچ گیا اور اس نے میری جیبوں کی تلاشی لے ڈالی لیکن اس وقت میری جیبوں میں کرنسی، سگریٹ، لائٹر اور رومال وغیرہ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں حیرانی سے ڈینش کو دیکھتا رہا اور پھر میں نے آہستہ سے کہا۔

"یہ سب کیا ہے؟ کیا بدتمیزی ہے یہ؟"

لیکن جواب میں ڈینش کا بھرپور ہاتھ میرے گال پر پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی تھی

"شٹ اپ۔"

میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ڈینش پیچھے ہٹ گئی تھی اور اس نے سہیل کو ہدایت کی تھی کہ میرے ہاتھ پشت پر کر کے باندھ دیئے جائیں۔ میرے لئے یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا کہ میں ششدر رہ گیا۔ سہیل غالباً اس کی تیاریاں پہلے ہی کر کے آیا تھا چنانچہ اس نے ایک رسّی کا لچھا نکالا اور میرے ہاتھ کھینچ کر پشت پر کر لئے۔ پستول کی وجہ سے میں کوئی مدافعت نہیں کر سکا تھا لیکن ہاتھ بندھواتے ہوئے میں ذرا سی کاریگری دکھا گیا۔ میں نے ہاتھوں کا فاصلہ مضبوطی سے اتنا کر لیا کہ وہ پوری طرح سے کسے نہ جا سکیں۔ سہیل کو اس کا احساس بھی نہیں ہو سکا تھا کہ میرے ہاتھ ڈھیلے ہیں اور جو رسّی وہ کس کر باندھ رہا ہے وہ صرف میرے ہاتھوں کی قوت پر کسی جا رہی ہے۔ یہ ایک مخصوص طریقۂ کار تھا جس کی میں نے مشق کی تھی۔ بہرطور اس نے میرے ہاتھ پشت پر کس دیئے میں پاگلوں کی طرح ڈینش کو دیکھ رہا تھا پھر میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سب کچھ......... یہ سب کچھ کیا ہے؟"

"اس کا جواب تمہیں پاشا ہی دے سکتا ہے۔ تمہاری اس کیفیت کی ذمہ داری بھی تم پر ہی عائد ہوتی ہے فی الحال یہاں آرام کرو۔ تمہارے بارے میں مجھے پاشا سے ہدایات لینی ہیں لیکن یہ سب کچھ ضروری تھا۔"

میں نے گہری سانس لے کر گردن جھٹکی اور پھر ہاتھوں کو پیچھے کئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ڈینش نے سہیل کو اشارہ کیا اور باہر نکل گئی۔ میں نے صاف محسوس کیا تھا کہ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا ہے۔ میرے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے۔ حواس ذہن کا ساتھ چھوڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ اس بار کیفیت کچھ بہتر نہیں تھی۔ پتا نہیں یہ سب کچھ کیا ہو رہا تھا؟ جتنے واقعات ہوئے تھے سب کے سب ناقابلِ یقین تھے کیوں آخر کیوں؟ اور اس کیوں کا جواب میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک میں اسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ میرے اندر ایک جنون سا ابھرتا جا رہا تھا یہ سب کچھ مجھے اپنے خلاف ایک سازش کے طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں اپنی فطرت کے مطابق اس تمام کارروائی پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا پاشا کے اور میرے درمیان ایک معاہدہ تھا اور یہ

معاہدہ بالکل ایمانداری سے عمل میں لایا جارہا تھا لیکن یہ سب کچھ میری توقع کے برعکس تھا۔ اور اگر اس سلسلے میں پاشا مجھے موردِ الزام ٹھہرائے تو اس میں کم از کم میرا قصور نہیں تھا۔ اب جو کچھ ہونے جارہا تھا۔ وہ صرف پاشا کی وجہ سے تھا۔ میں انتظار کرتا رہا اور تقریباً چالیس منٹ کے بعد دروازے پر پھر آہٹیں ابھریں میری نگاہیں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ اندر داخل ہونے والی ڈینش ہی تھی لیکن اب اس کا انداز بدلا ہوا تھا۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں ملبوس تھی اور اس کے بدن کی لطافتیں لباس کا بوجھ برداشت نہیں کرپارہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھی اور میرے قریب پہنچ گئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سوری جلال جو کچھ ہوا یا ہورہا ہے اس میں ہم میں سے تو کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پاشا کی ہدایات سے رُوگردانی کرنا کس قدر خطرناک ہوسکتا ہے اس کا تمہیں اندازہ نہیں۔"

وہ کچھ اور آگے آئی اور میرے بالکل نزدیک پہنچ گئی۔ میرے آہستہ آہستہ ہاتھ کام کررہے تھے۔ وہ ڈوری جو میرے ہاتھوں کے گرد کسی ہوئی تھی اب کھل کر میری ہتھیلیوں کی زد میں آگئی تھی اور میں نے اسے اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لپیٹ لیا تھا۔ ڈینش مسکرارہی تھی اور اس کی آنکھوں میں میرے لئے مذاق اڑانے والے تاثرات تھے لیکن پھر دفعتاً ہی جب میرے ہاتھ پھرتی سے آگے بڑھے اور ڈوری اس کی گردن کے گرد کس گئی تو وہ دہشت زدہ ہوگئی۔ اس نے تڑپ کر میری گرفت سے نکل جانا چاہا مگر میرے ہاتھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ حرکت میں آئے اور ڈوری اس کی گردن کے گرد سخت ہوگئی۔ پھندہ تنگ ہونے سے پہلے ڈینش نے میرا گریبان اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیا۔ گرہ سخت ہوئی تو اس کی مٹھیاں کھل گئیں اور میرے سینے پر کئی کمزور مکے پڑے لیکن اس کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ اور میں نے رسّی کے اس پھندے کے سہارے ڈینش کو زمین پر ڈال دیا پوری قوت سے ڈوری کھینچی تو ڈینش کے کانوں اور ناک کے نتھنوں سے خون بہہ نکلا۔ اس کا چہرہ بے حد بھیانک ہوگیا تھا چند ہی منٹ کے بعد اس کا بدن بے جان ہوگیا اور میں نے اسے ٹھوکر مار کر ایک طرف ہٹا دیا۔ میرے چہرے پر درندگی پھیلی ہوئی تھی بہرحال وہاں سے مجھے مزید کچھ نہیں لینا تھا میں نے پہلے فلیٹ میں سہیل کو تلاش کیا اور اگر اس وقت وہ مجھے مل جاتا تو یقیناً اس کی کیفیت بھی ڈینش سے مختلف نہیں ہوتی۔ جب یہاں اس کے علاوہ اور کوئی مجھے نہ ملا تو میں

دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی فلیٹ کے دروازے کا تالا اس قسم کا تھا کہ اسے صرف اندر ہی سے کھولا جاسکتا تھا۔ باہر سے چابی کے بغیر کھلنا ناممکن تھا۔ میں سیڑھیوں سے اتر کر فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل پڑا ذہن اس طرح الجھا ہوا تھا کہ کچھ سوچنے سمجھنے کی قوت نہ رہی تھی ایسے طلسمی واقعات تھے کہ عقل ساتھ ہی نہیں دے پارہی تھی لیکن میں چلتا رہا اور اب میرے لئے یہاں کوئی پناہ گاہ نہیں تھی۔ میں ایک طرح سے دشمنوں میں گھر گیا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ دشمن میرے اپنے ساتھی ہی تھے۔ کسی کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ہوسکتا ہے پاشا خود بھی کسی سازش کا شکار ہوگیا ہو میں اب کم از کم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کہ یہاں رکوں اور پاشا کے آدمیوں کا انتظار کروں۔ اس کے لئے بہتر یہی تھا کہ یہ علاقہ ہی چھوڑ دیا جائے اور میں واپس وینس پہنچ کر کوئی کارروائی کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے اس فیصلے پر آخری مہر لگادی اور یہ طے کرلیا کہ کل صبح کی روشنی نکلتے ہی یہاں سے واپس وینس کی جانب روانہ ہوجاؤں گا۔

راستے جانے پہچانے تھے اور طریقۂ کار بھی مجھے معلوم تھا۔ چنانچہ میں نے صبح تک کا وقت ایسے ہی آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا۔ کنپٹیاں تڑپ رہی تھیں اور آنکھوں میں جلن ہورہی تھی لیکن دشمنوں کے اس شہر میں اب زیادہ وقت نہیں گزارا جاسکتا تھا۔ میں نے ڈومیسڈولا سے واپسی کا بندوبست کیا اور پھر اسی طرح وینس واپس چل پڑا جس طرح یہاں آیا تھا۔ اب مجھے پاشا کی بازپُرس کی بھی پروا نہیں تھی۔ پاشا نے پے در پے حماقتیں کی تھیں اور میں ان حماقتوں کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ وینس پہنچنے کے بعد میں واپس لوٹ جاؤں گا اور پاشا سے اس سلسلے میں جواب طلبی کروں گا۔ ہر چند کہ میں اس کے ساتھیوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا تھا' لیکن پاشا اپنے آدمیوں کو کسی باز پُرسی کی اجازت نہیں دیتا تھا لیکن حالات ایسے ہوگئے تھے کہ میں اس کے لئے مجبور تھا۔ اگر ان حالات کی وجہ سے مجھے پاشا کے گروہ سے الگ بھی ہونا پڑے گا تو میں علیحدگی اختیار کرلوں گا نتائج کچھ بھی ہوں۔ میرا ذہن غصے کی چنگاریوں سے بھرا ہوا تھا۔

واپسی کے سفر میں ایسا کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا جس کا اظہار کیا جائے۔ وینس میں قدم رکھنے کے بعد میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ مجھے یہاں ایک دو روز قیام کرکے اپنی واپسی کا بندوبست کرنا چاہئے' جو تھکن اعصاب پر طاری ہوگئی تھی اسے دور کرنا بھی ضروری تھا چنانچہ میں نے ایک خوبصورت قیام گاہ کا انتخاب کیا' اور اس میں منتقل

ہوگیا۔ یہ صرف اتفاق تھا کہ اس قیام گاہ کے بارے میں ایک بار پہلے بھی مجھے ہدایت دی جاچکی تھی اور یہاں پاشا کے آدمی اکثر ٹھہرا کرتے تھے۔

یہ قیام گاہ ایک خوبصورت ہوٹل کی شکل میں تھی' اور مجھے اس میں ایک خوبصورت کمرہ مل گیا تھا جو ہوٹل کی آٹھویں منزل پر تھا۔ اطراف کے مناظر بے پناہ حسین تھے لیکن ان شدید الجھنوں میں مجھے ان مناظر کا حسن بھی متاثر نہیں کررہا تھا میرا دماغ کھول رہا تھا۔ میں نے ان پانچ سالوں میں پاشا کے لئے ایسے ایسے کارنامے انجام دیئے تھے جو شاید کسی اور کے لئے مشکل ہوتے۔ اس ریکارڈ کو مدِنگاہ رکھتے ہوئے پاشا کو مجھ پر اعتماد کرنا چاہئے تھا لیکن وہ خود پرست انسان خود سے زیادہ ذہین کسی کو نہیں سمجھتا تھا اگر وہ مجھے صورتِ حال سے آگاہ کردیتا تو یہ سب مشکل نہ ہوتا۔ مگر اس کا رویہ عجیب تھا خاص طور سے اس کیس میں۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ میں واپس چلا جاؤں پاشا سے ملوں اور احتجاج کروں۔ اس سے کہوں کہ اگر آئندہ وہ مجھ سے کام لینا چاہتا ہے تو مجھے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا کرے ورنہ شاید اس کے اور میرے معاملات آگے نہ بڑھ سکیں۔ کچھ وقت گزرنے کے ساتھ یہ ذہنی بحران کسی قدر کم ہوگیا اور میں نے خود کو پُرسکون کرلیا لیکن یہ فیصلہ اٹل تھا کہ اب پاشا سے ملاقات کئے بغیر یہاں وینس میں اس کے کسی اور آدمی سے ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

خوبصورت ہوٹل کی تفریحات میں حصہ لے کر میں خود کو پُرسکون کرسکتا تھا اس کے لئے لازم تھا کہ میں سب کچھ بھول کر خود کو ان تفریحات میں گم کرروں۔ چنانچہ میں نے اس فیصلے کے تحت لباس تبدیل کیا اور اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔ ہوٹل کی نچلی منزل کے کشادہ ہال میں آرکسٹرا کی دھنیں بکھری ہوئی تھیں جوڑے رقص کررہے تھے۔ میں ایک میز پر جا بیٹھا اور پھر میری نگاہ قریب کے میز کی طرف اٹھ گئی۔ میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔

دو بولتی آنکھیں ہمیشہ کچھ کہتی آنکھیں اس وقت بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔ یہ نیلا ہی تھی تنہا نیلا۔ خاموش ہمیشہ کی مانند لیکن اس وقت مجھے اس کی آنکھوں میں جھانکنا ہی پڑا۔ میں نے کبھی ان آنکھوں کی کہانیاں نہیں پڑھی تھیں کبھی ان پر غور نہیں کیا تھا لیکن آج میں نے ان پر پوری توجہ دی یہ آنکھیں کیا کہنا چاہتی ہیں لیکن آنکھوں کی زبان پر توجہ کیوں دی جائے۔ زبان موجود ہے تو پھر یہ سب کیوں؟

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور نیلا کے پاس جا بیٹھا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم ابھی تک یہیں ہو۔"

"ہاں۔"

"کسی کام میں مصروف ہو؟"

"ہاں۔"

"اتنی مختصر گفتگو کروگی۔" میں نے تھکے تھکے انداز میں کہا اور وہ مسکرادی۔

"بے یقینی کی منزل میں ہوں۔"

"کیوں؟"

"اس سے قبل تم نے کبھی مجھے مخاطب نہیں کیا۔"

"اس سے قبل تو بہت کچھ نہیں ہوا۔"

"اسی سے حیران ہوں۔"

"پاشا کہاں ہے؟"

"خدا جانے۔"

"تم یہاں کیا کررہی ہو؟"

"خدا جانے۔"

"کیا میں یہاں سے اٹھ جاؤں؟" میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں۔"

"تمہارے گفتگو کرنے کا انداز یہی بتاتا ہے۔ مگر میرا ذہن تھکا ہوا ہے۔ میں کھلے الفاظ میں کھلی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میرا ذہن کوئی بوجھ برداشت کرنے کے قابل نہیں ہے۔" میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

"اب یہاں سے اٹھ جاؤ۔" وہ پُراسرار انداز میں بولی اور میں چونک پڑا۔

"کہاں چلوں؟"

"جہاں میں لے چلوں۔"

"چلو۔" میں نے کہا اور پھر دونوں اٹھ گئے۔ نیلا مجھے لے کر چل پڑی۔ گرانڈ کنال کے ایک خوبصورت گنڈولے پر اترتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ جگہ ہر خطرے سے پاک ہے۔"

"خطرہ؟"

"ہاں پاشا کا خطرہ۔ میں نے یہ گنڈولا مستقل ہائر کرلیا ہے۔" نیلا نے کہا۔

"اوہ۔" میں نے اس کی سجاوٹ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تم اپنی موت کے بعد بھی جی رہے ہو اور اس کا ایک ہی مطلب ہے وہ یہ کہ روک اور ڈینش ریٹائر ہو چکے ہیں۔"

"پھر الجھی ہوئی باتیں۔"

"ہم لوگوں میں ایک بڑی کمی ہوتی ہے وہ کرتے ہیں جو نہیں کرسکتے۔ میں، تم روک، ڈینش اور دوسرے بہت سے لوگ پاشا کے لئے آگ اور خون سے کھیلتے رہے ہیں لیکن ہم نے کبھی پاشا کے بارے میں نہیں سوچا کہ وہ خود ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے ہم اس کے وفادار ہیں لیکن وہ۔"

"وہ چیف ہے ہمارا۔"

"اور مالک بھی۔"

"کیوں؟"

"افسوس تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتی ہوں۔ میں بھی نہ جان پاتی اگر پاشا کے بارے میں جاننے کی کوشش نہ کرتی۔"

"نیلا پلیز، میرا ذہن چیخ رہا ہے۔"

"سنو جلال میں کسی اور کے بارے میں نہیں تمہیں تمہارے بارے میں بتاتی ہوں۔ پاشا سے تمہارا پانچ سال کا کنٹریکٹ ہے۔ ہے نا۔"

"ہاں۔"

"اور پانچ سال کے بعد وہ تمہیں ریٹائر کردے گا یہ اس کا طریقۂ کار ہے اور اس کے لئے وہ ہم لوگوں سے ایک اگیری منٹ فارم پُر کراتا ہے۔"

"سو فیصدی۔"

"اگیری منٹ میں چھ کالم ہیں۔ کالم نمبر ایک کی عبارت ہے۔ تم اپنے آپ کو مکمل طور پر پاشا کے مفادات کے لئے وقف کرتے ہو۔ کالم نمبر دو۔ اس پانچ سالہ دور میں تم پاشا کے ہر مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دو گے۔ کالم نمبر تین۔ پاشا کے کسی کام کے سلسلے میں تم

چھان بین نہیں کرو گے اور صرف اس کے احکامات کی تعمیل کرو گے۔ کالم نمبر چار تم شادی نہیں کرو گے۔ کالم نمبر پانچ، پانچ سالہ ملازمت کے بعد تم ریٹائر کرویئے جاؤ گے اور کالم نمبر چھ..........." نیلا خاموش ہوگئی میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

"کالم نمبر چھ میں کیا ہے؟"

"مجھے یاد نہیں۔"

"یاد کرو۔" وہ بولی۔

"غالباً وہ بلینک ہے اضافی نمبر لکھ دیا گیا ہے۔"

"نہیں۔ وہ اضافی نمبر نہیں ہے بلکہ اس کی تحریر پوشیدہ ہے اگر اس کی تحریر اس میں درج کردی جاتی تو کوئی پاشا کی ملازمت نہ کرتا۔"

"کیا تحریر ہے اس کی؟"

"اور اس کے بعد تم دنیا چھوڑ دو گے۔" نیلا نے کہا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بولی۔

"پاشا سنسنی پسند ہے اس کے ہر کام میں ڈرامائیت اور چونکا دینے والا انداز ہوتا ہے۔ وہ اپنے آدمیوں کو کبھی یہ نہیں بتاتا کہ ان کے سپرد جو مہم کی گئی ہے اس کا مقصد کیا ہے اس طرح اس نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ پانچ سالہ عیش کی زندگی کے بعد انہیں یہ دنیا چھوڑنی ہوگی کیونکہ پاشا نہیں چاہتا کہ اس کے ذہین ساتھی اس سے زیادہ طاقتور ہو کر اس کے خلاف محاذ بنالیں۔ وہ پانچ سال کے دورِ ملازمت کے بعد ان لوگوں کا خاتمہ چاہتا ہے جو پانچ سال پورے کرچکے ہوں اور تم ڈیئر جلال۔ تمہیں یاد نہیں کہ تم اپنے پانچ سال پورے کرچکے ہو۔"

میرے بدن میں سرد لہروں کا بسیرا ہوگیا تھا اور میں حیرت سے نیلا کو دیکھ رہا تھا۔ بمشکل تمام میں نے کہا۔ "لیکن.........."

"سنو۔ روک وہ شخص تھا جس کے پاس سہیل تمہیں لے گیا تھا اور روک کو ہدایت تھی کہ وہ تمہیں قتل کردے۔"

"اوہ میرے خدا۔" میں نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"روک تمہارے ہاتھوں مارا گیا تو تمہیں ڈینش کے سپرد کردیا گیا۔"

"وہ بھی۔ وہ بھی میرے ہاتھوں ماری گئی۔"

"ہاں شاید پاشا کو یہ امید نہیں تھی۔" نیلا نے کہا۔

"لیکن اس طرح تو اس کا ریٹائرمنٹ کا منصوبہ فیل ہو گیا۔"

"ہرگز نہیں۔" نیلا نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ روک اور ڈینش کے پانچ سال بھی پورے ہو چکے تھے۔ اگر تم ان کے ہاتھوں مارے جاتے تو وہ دونوں کسی اور کے ہاتھوں قتل کرا دیئے جاتے۔"

میرا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ دیر تک میری زبان نہ کھل سکی۔ پھر میں نے کہا۔

"اور میں اب واپس پاشا کے پاس جا رہا تھا۔"

"تمہاری تیسری قاتل میں ہوں۔ میرے سپرد اب یہ ذمہ داری کی گئی ہے کہ تمہیں قتل کردوں۔"

"اوہ۔" میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ موت مجھے اپنے سامنے نظر آ رہی تھی۔

"نہیں ڈیئر جلال۔ ڈرو مت۔ میں اس مفاد سے واقف ہو گئی ہوں اور تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسی لئے یہ خفیہ جگہ منتخب کی تھی کہ تم آجاؤ تو تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کردوں اور اس کی وجہ جانتے ہو کیا ہے۔"

"کیا؟"

"یہ کہ میرے بھی پانچ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس لئے آؤ ہم جتیں۔ پاشا کے چنگل سے نکل کر کہیں پوشیدہ ہو جائیں ایسی جگہ جہاں وہ ہمیں تلاش نہ کر سکے۔"

"چلو۔" میں نے سراسیمہ لہجے میں کہا اور ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆------☆------☆

غیر معمولی

خزانے کی ہوس انسان کی ازلی کمزوری ہے

مگر کچھ لوگ غیر معمولی ہوتے ہیں۔

ایک غیر معمولی انسان کی حیران کن سرگزشت۔

ایک معمولی عورت کی کہانی جسے غیر معمولی

انسان کی تلاش تھی۔

نام حمیرا خاقان۔ جسم مضبوط' آنکھیں زندگی سے بھرپور اور کسی قدر بھوری آنکھوں ہی کی رنگت جیسے بال۔ دیکھنے میں بہت خوبصورت شخصیت کی مالک۔ عمر تقریباً تیئس سال۔ کچھ عرصے سے ایک خاص حلقے میں کافی شہرت پا رہی تھی۔ وہ فری لانسر فیچر رائٹر تھی۔ عموماً اخبارات میں اس کے ترتیب دیئے ہوئے فیچر اور رسائل میں انٹرویو چھپا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ٹیلیویژن پر بھی مشہور ترین شخصیات کے انٹرویو کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ بہت ہی پُروقار شخصیت کی مالک تھی وہ۔

اس پیشے میں اس نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک مقام پیدا کیا تھا۔ ماضی کیا تھا یہ کسی کو نہیں معلوم تھا لیکن شناساؤں میں بے حد مقبول تھی۔ اتنی بے تکلفی سے بڑی بڑی شخصیتوں سے چبھتے ہوئے سوالات کیا کرتی تھی کہ عام لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہی چیز اس کی مقبولیت کا سبب بنی تھی اور اس کے اپنے شناسا حلقوں میں اسے بہت بڑا مقام حاصل ہوگیا تھا۔ اپنے طور پر بھی مختلف لوگوں کو تلاش کرکے ان کے انٹرویو کرتی تھی اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کو یہ انٹرویو فروخت کردیا کرتی تھی۔ فیروز نعمانی بھی اسی کی تلاش تھا۔

نہ جانے کیوں حمیرا خاقان نے اس کی شخصیت کا انتخاب کیا تھا۔ غالباً اسے یہ احساس ہوگیا تھا کہ فیروز نعمانی اس کے فیچر کے لئے ایک اہم کردار ثابت ہوسکتا ہے اور کچھ لوگ یقیناً اس سے دلچسپی لیں گے۔ چنانچہ وہ فیروز نعمانی کے اسٹوڈیو پہنچ گئی۔ بہت شاندار علاقے میں سٹوڈیو تھا انتہائی جدید قسم کا۔ وہ کوئی باقاعدہ دکان نہیں تھی بلکہ ایک شاندار بنگلے میں بنایا گیا تھا۔ ایک لڑکے نے اس کی راہنمائی کی اور جب وہ اس کے ائرکنڈیشنڈ دفتر میں پہنچی تو اس نے تقریباً چالیس سال کے ایک سرخ وسفید خوش لباس شخص کو ایک موٹی سی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے پایا۔ اس کے سامنے فوٹوگرافی سے متعلق بہت سی چیزیں بکھری ہوئی تھیں اور وہ اس کتاب کے اوراق جلدی جلدی الٹ رہا تھا۔ غالباً کسی خاص چیز کی تلاش تھی اسے۔ لڑکے نے اسے یہاں چھوڑا اور باہر نکل گیا۔ وہ دبیز قالین پر

چلتی ہوئی فیروز نعمانی کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے چہرے پر بلا کا سکون تھا۔ کنپٹیوں کے بال سفید تھے اور اس کی شخصیت میں ایک وقار پیدا کررہے تھے۔

"جی.........." اس نے خوش خلقی سے کہا۔

"کچھ وقت لینا چاہتی ہوں آپ کا۔"

"تعارف حاصل کرسکتا ہوں۔" اس نے شائستہ لہجے میں پوچھا اور حمیرا خاقان نے اپنا کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کارڈ پڑھا اور اس کے چہرے پر ایک دم تبدیلی رونما ہوئی۔

"تشریف رکھئے۔ آپ اس طرح بغیر اطلاع کے میرے پاس تشریف لے آئیں گی مجھے امید نہیں تھی۔ میں تو بڑا غیر اہم آدمی ہوں۔"

حمیرا خاقان کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اور مسکرا کر بولی۔

"میں جانتی ہوں کہ بہت سے بڑے آدمی کسرِ نفسی سے کام لیتے ہیں لیکن بہت زیادہ کسرِ نفسی مناسب نہیں ہے۔ بعض اوقات انسان کو وہی سمجھ لیا جاتا ہے جو وہ انکساری میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔" فیروز نعمانی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"شکریہ.......... آپ نے مجھے بروقت باخبر کردیا۔ بہرحال آپ کی آمد میرے لئے باعثِ دلچسپی ہے۔ خصوصی طور پر آپ سے شناسائی کا اظہار اس لئے کرتا ہوں کہ کسی حد تک میرا پیشہ آپ کے پیشے سے ملتا ہے۔"

"یقیناً اور اسی لئے میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں۔"

"اوہو انٹرویو.......... بھئی میرے انٹرویو سے کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ آپ نے بلاشبہ بڑے بڑے لوگوں کے انٹرویو کئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو اس سلسلے میں مایوسی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"یعنی آپ انکار کردیں گے؟" وہ بولی۔

"ارے نہیں.......... بھلا میری کیا مجال ہے کہ میں آپ جیسی شخصیت کو انکار کرسکوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک غیر اہم انٹرویو ہوگا۔"

"یہ خیال آپ میرے لئے چھوڑ دیجئے۔ شکر گزار ہوں گی۔"

"آپ کی مرضی۔"

"میں آپ کو دس پندرہ برس پیچھے لے جانا چاہتی ہوں جب آپ فلم انڈسٹری کے

مانے ہوئے کیمرا مین تھے اور آپ نے کئی غیر ملکی فلم کمپنیوں کے ساتھ مختلف علاقوں میں کام کیا تھا۔ خصوصاً میں آپ سے میزل بارونا کے علاقے کا تذکرہ کروں گی۔"

"اوہ........." فیروز نعمانی کی آنکھوں میں سنجیدگی پیدا ہوگئی اس نے آہستہ سے کہا۔

"آپ مجھے اس دور میں لے جانا چاہتی ہیں جسے فراموش کرنے کے لئے میں برسوں کوشش کرتا رہا ہوں۔ ویسے آپ کو اس کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ یہ تذکرہ تو صرف چند لوگوں تک محدود رہا ہے۔"

"جناب آپ نے مجھ سے شناسائی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ میں ایسے لوگوں کو تلاش کرلیتی ہوں جو بڑی اہمیت کے حامل لیکن کسی پوشیدہ گوشے میں ہوتے ہیں اور بس یہ سمجھ لیجئے کہ میری یہ تلاش ہی میرا ساتھ دیتی ہے۔"

"بہرحال یہ آپ کی پسند ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کے واقعات کسی کے لئے باعثِ دلچسپی نہیں ہوں گے۔"

"آپ کے الفاظ مجھے مایوس نہیں کرسکتے اگر آپ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ میرا انتخاب غلط ہے تو میں اسے تسلیم نہیں کروں گی کیونکہ میرا فن اس بات کا گواہ ہے۔"

"اوہو نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اچھا خیر لیکن محترمہ بغیر کسی اطلاع کے آپ تشریف لائی ہیں میں تو ذہنی طور پر انٹرویو کے لئے تیار بھی نہیں ہوں۔"

"اس وقت صرف آپ سے ملاقات کرنا مقصود تھا۔ یوں کیجئے کہ مجھے کوئی وقت دے دیجئے۔ میں اس وقت حاضر ہو جاؤں گی۔"

"تو پھر ٹھیک ہے آپ یوں کیجئے کہ میرے گھر تشریف لے آیئے۔ آج ہی شام اگر مناسب سمجھیں تو پانچ بجے۔"

"بہت بہتر........." وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فیروز نعمانی نے اسے اپنا کارڈ دے دیا تھا اور پھر شام کو ٹھیک پانچ بجے حمیرا اس کے گھر پہنچ گئی۔ بہت مناسب قسم کا چھوٹا سا بنگلہ تھا۔ جس میں مختصر مگر خوبصورت لان تھا۔ فیروز نعمانی نے لان ہی میں بیٹھ کر گفتگو کی تجویز پیش کی جسے حمیرا نے بخوشی قبول کرلیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مسز نعمانی سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"جی ہاں......... بدقسمتی سے وہ ابھی تشریف نہیں لائیں۔"

"اوہو کہیں گئی ہوئی ہیں۔"

"خدا جانے کہاں گئی ہیں۔ مجھے تو کبھی نظر نہیں آئیں۔" فیروز نعمانی شگفتہ لہجے میں بولا۔

"نہیں سمجھی۔"

"مطلب یہ کہ ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے تو نظر کیسے آئیں گی؟"

"اوہو آپ کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔"

"یہ ابھی تک پر آپ نے اتنا زور کیوں دیا؟" فیروز نعمانی نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ "اگر آپ مجھے بڑھاپے کا احساس دلانا چاہتی ہیں تو محترمہ ابھی میری عمر کل چالیس سال ہے۔ میرا مشاہدہ تو یہ ہے کہ لوگ اس سے زیادہ کی عمر میں بھی حماقت کرگزرتے ہیں۔"

"پھر بھی......... اس تاخیر کی وجہ جاننا چاہوں گی؟" حمیرا خاقان بولی اور فیروز نعمانی ہنس پڑا۔

"بس یوں سمجھ لیجئے کہ کسی غیر معمولی خاتون کا زندگی بھر انتظار رہا اور اسی انتظار میں وقت گزر گیا۔"

"خوب......... تو آپ ابھی تک انتظار کررہے ہیں؟"

"جی......... اور یقین ہے کہ اسی انتظار میں عمر گزر جائے گی۔ ارے ہاں آپ اخبارات میں اپنے فیچر کے ساتھ کبھی تصویر نہیں چھپواتی ورنہ میں نے کچھ خواتین کو دیکھا ہے خصوصاً ایک خاتون میری نگاہ میں ہیں جن کے کالم کے ساتھ ان کی بیس سال پرانی تصویر آج تک چھپتی ہے۔"

"جی......... ہوسکتی ہے' اب ہم کام کی بات کریں۔" حمیرا خاقان نے کہا۔

"ضرور!"

"آپ کی یادداشت کیسی ہے مسٹر فیروز۔" اس نے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے مناسب۔" فیروز مسکرایا اور پھر جلدی سے بولا۔ "ویسے میں صرف اہم باتیں یاد رکھتا ہوں بیکار باتوں کو بھول جایا کرتا ہوں۔" اتنی دیر میں ایک ملازم چائے لے آیا اور فیروز نعمانی خود ہی چائے تیار کرنے لگے۔

"تو پھر آپ مجھے اپنی اس ناقابلِ فراموش مہم کی داستان سنایئے جس کی میں نے آپ سے خصوصی طور پر فرمائش کی تھی۔" حمیرا خاقان نے کہا اور فیروز نعمانی چند لمحات خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"فلم انڈسٹری کی حالت آج بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے اور میں جس زمانے کی بات کررہا ہوں اس زمانے میں بھی بس کوئی خاص صورتِ حال بہتر نہیں تھی تاہم میں اپنے اسٹوڈیوز کے ساتھ پرانے اور زنگ آلود سامان سے کام چلا رہا تھا اور ترقی یافتہ ملکوں کی کوششوں کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ تھوڑی بہت تعلیم بھی تھی اور اپنے شوق کے تحت محنت بھی کرتا تھا۔ اس لئے مجھے اچھا کیمرا مین سمجھا جاتا تھا۔"

"جی بے شک.......... لیکن ایک سوال۔ جب آپ فلمی دنیا میں اتنے کامیاب کیمرا مین تھے تو آپ نے اس فیلڈ کو کیوں چھوڑا؟"

"ویری گڈ' ایک تو یہی مہم جس کے بارے میں' مَیں آپ کو بتانے لگا ہوں فلمی دنیا سے میری علیحدگی کا باعث بنی۔ اس مہم کی وجہ سے میں فلمی دنیا سے کچھ عرصے کے لئے کٹ کر رہ گیا تھا اور فلمی دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ اِدھر آپ پیش منظر سے ہٹے اور اُدھر لوگ آپ کو بھول گئے۔ بس یوں سمجھیں کہ چلتی کا نام گاڑی ہوتا ہے۔ ذرا سی رفتار سُست پڑی اور دوسری گاڑی پٹڑی پر آگئی۔ میں چاہتا تو دوبارہ اپنا مقام حاصل کرسکتا تھا لیکن مجھے اس میں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا۔ ایسے ٹیکنیکل شعبوں میں ترقی کی بس ایک حد ہوتی ہے اور وہ حد بہت جلد آجاتی ہے آپ اس سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ البتہ میرا یہ پرائیویٹ اسٹوڈیو میرے لئے زیادہ سودمند ہے۔"

"بہت خوب.......... چلیے ہم دوبارہ اس مہم کی جانب آتے ہیں۔"

"ضرور.......... وہ ہالی وڈ کا ایک معروف ڈائریکٹر تھا اور مخصوص طرز کی مہماتی فلموں میں اس کا اس وقت کوئی ثانی نہیں تھا۔ ایک بار اپنا فلم یونٹ لے کر ہمارے ہاں آیا اور اس نے میزل بارونا کے علاقے میں شوٹنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اجازت نامہ وغیرہ اس نے حاصل کرلیا تھا۔ چند مقامی لوگ اس کے یونٹ میں شامل ہوچکے تھے۔ میرے بارے میں جاننے کے بعد اس نے مجھ سے خود ہی رابطہ قائم کیا اور مجھے اپنے یونٹ میں شامل ہونے کی پیشکش کی۔ میرے لئے یہ ایک طرح کا اعزاز تھا اور میں سمجھتا تھا کہ مجھے کچھ سیکھنے کا موقع بھی ملے گا چنانچہ میں تیار ہوگیا اس کے علاوہ میزل بارونا کا روایتی علاقہ دیکھنے کا شوق بھی مجھے اس کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کررہا تھا۔

یہاں آباد قدیم قبیلے عجیب عجیب داستانیں رکھتے ہیں۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ مختصر یہ کہ بہت سے شہروں میں قیام کرتے ہوئے ہم بالآخر میزل بارونا کی برف پوش وادیوں میں پہنچ گئے۔ چند مقامی افراد کو راہنمائی کے لئے ساتھ لے لیا گیا تھا۔ فلم کی

شوٹنگ کیا تھی اچھی خاصی کوہ پیمائی کی ایک مہم تھی جس کے لئے ہمارے ڈائریکٹر نے زبردست انتظامات کئے تھے۔ ڈائریکٹر کا نام مسٹر آئزک گراہم تھا۔ یقیناً آپ نے ان کی فلموں کے بارے میں بہت کچھ سنا ہوگا اور کچھ فلمیں بھی دیکھی ہوں گی۔"

"جی بے شک.........." حمیرا خاقان نے جواب دیا۔

"بظاہر یہ ایک شوٹنگ کی مہم تھی لیکن میرے لئے درحقیقت سیاحت تھی۔ باہر سے آنے والوں کی تو بات ہی کیا' ہم خود ان مناظر سے سحرزدہ تھے۔ مسٹر آئزک نے دو روز پہاڑ کے دامن میں ہی شوٹنگ کی اور اس کے بعد چڑھائی کا آغاز ہوا۔ کوہ پیمائی کا سارا سامان ہمارے پاس موجود تھا۔ بارونا کے جو باشندے ہماری راہنمائی کررہے تھے وہ محض ہمارے لئے مزدوروں والا ہی کام انجام دے رہے تھے۔ کیونکہ اس سے زیادہ بلندی پر وہ کبھی نہیں گئے تھے۔ تاہم انہیں موسم کے بارے میں بخوبی اندازے تھے۔ پہاڑوں کی بلندیوں پر موسم پل پل میں رنگ بدلتا ہے۔ جس انداز سے اور جن جن زاویوں سے مسٹر آئزک شوٹنگ کرنا چاہتے تھے وہ بھی ایک بہت مشکل کام تھا۔ دو دن کی شوٹنگ میں ہمارے دو کیمرا مین زخمی ہوئے لیکن ہمارے پاس طبی امداد کا سامان موجود تھا اس لئے صورتِ حال خراب نہیں ہونے پائی۔ البتہ جوں جوں ہم بلندی کی طرف بڑھ رہے تھے موسم بہت خراب ہوتا جارہا تھا۔ تقریباً چودہ دن کے بعد ہم تین ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ میزل بارونا کے اس علاقے کو چونکہ ناقابلِ تسخیر قرار دیا جاچکا تھا اس لئے آگے جانے کی کسی نے زحمت ہی نہیں کی تھی اور مزید بلندی کے بارے میں ہمیں کسی قسم کی معلومات بھی حاصل نہیں تھیں۔ بہرطور آئزک بڑے پُرجوش تھے اور ان کا جوش بڑھتا جارہا تھا۔ ان کی عمر پچاس سے کچھ اوپر ہی تھی اس عمر میں ہمارے ہاں انسان بوڑھا کہلانے لگتا ہے اور چھوٹے موٹے کام بھی اس کے لئے مشکل ہوجاتے ہیں لیکن مسٹر آئزک کی ہمت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی انہیں اپنے کام سے عشق تھا۔ بہرحال ہم آگے بڑھتے رہے۔ اب ہم ایک کہر زدہ پہاڑی پر بلندی کا سفر کررہے تھے۔ بیٹریوں اور جنریٹر سے جلنے والی روشنی کے باوجود ہم بمشکل تمام ہی شوٹنگ کرپاتے لیکن اس کہر اور دھند نے ہمیں کئی ایسے مناظر بھی فلم بند کرنے میں مدد دی جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ شاہکار ثابت ہوں گے لیکن مسٹر آئزک اب تک جو کچھ کرچکے تھے اس سے مطمئن نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مزید بلندی پر بہت سی انوکھی چیزیں ان کی منتظر ہیں جن تک پہنچنے کے لئے وہ بیتاب تھے۔ اِدھر یونٹ کے تقریباً سب ہی ارکان دھند میں لپٹی ہوئی اس

پُراسرار دنیا کی طرف جانے سے گھبرا رہے تھے۔ خصوصاً موسم کے تیور دیکھ کر انہیں خوف آرہا تھا۔ یہاں تک کہ خود میزل بارونا کے باشندے بھی سہمے سہمے لگ رہے تھے۔ بالآخر مسٹر آئزک کے ایک غیر ملکی اسسٹنٹ نے کہہ ہی دیا کہ انہیں مزید بلندی کی طرف نہیں جانا چاہئے۔ مسٹر آئزک ناراض ہوگئے۔ انہوں نے کہا۔

"جس قسم کی لوکیشنز پر ہم نے اب تک کام کیا ہے ایسی لوکیشنز تو مجھے اپنے ملک اور اس کے آس پاس بھی دریافت ہوسکتی تھیں۔ میں ایک غیر معمولی فلم بنانا چاہتا ہوں اور اس مقصد کے لئے بے دریغ دولت خرچ کررہا ہوں۔ بجائے اس کے کہ آپ دوسروں کا حوصلہ بڑھائیں آپ خود ایسی باتیں کررہے ہیں۔" مسٹر آئزک کا وہ اسسٹنٹ خاموش ہوگیا لیکن وہ خوش نہیں تھا۔ آپ اسے میری شیخی نہ سمجھیں تو عرض کروں کہ اس یونٹ کا سب سے مطمئن، مسرور اور بے خوف شخص میں تھا۔ ایک مُسلم گھرانے میں پیدا ہونے کے ناتے یہ میرا ایمان ہے کہ موت برحق ہے اور کسی بھی لمحے آسکتی ہے۔ اس کے علاوہ میں اپنی زندگی کے بہترین تجربات کررہا تھا اور اس ایڈونچر سے بے پناہ خوش تھا۔ اس کا احساس مسٹر آئزک کو بھی ہوگیا اور سب سے زیادہ اہمیت مجھے ہی دی جانے لگی۔ ایک روز انہوں نے علیحدگی میں مجھ سے کہا۔

"مسٹر نعمانی میں تو اپنے ساتھیوں کی طرف سے فکر مند ہو چلا ہوں۔ ابھی سے سب کے چہرے اتر گئے ہیں اور حوصلے پست ہیں۔ ان سے بہتر طور پر کام لینے کی کوئی تدبیر آپ کے ذہن میں ہے۔"

"میرے خیال میں ایک کوشش کی جاسکتی ہے۔" میں نے کچھ دیر سوچ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا؟"

"ہم سب مسلسل سفر نہ کریں بلکہ ایک مناسب سی جگہ کیمپ لگادیں۔ کام کے اختتام تک ہمارا وہ کیمپ قائم رہے۔ روزانہ ہم میں سے صرف کام کے چند لوگ آگے جاکر لوکیشنز تلاش کریں۔ شوٹنگ کرکے واپس کیمپ میں آجایا کریں اس طرح چند لوگوں کو زیادہ مشقت اٹھانی پڑے گی باقی لوگوں کے حوصلے بھی پست نہیں ہوں گے۔ شوٹنگ کے لئے بھی ہم باری باری کام لیں تو سب کو آرام بھی ملتا رہے گا۔"

مسٹر آئزک بے حد خوش ہوئے اور میرا کندھا تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ "مسٹر فیروز آپ اچھے کیمرا مین ہی نہیں اچھے منتظم بھی ہیں۔ میں نے آپ سے جو کانٹریکٹ کیا تھا

آپ اسے بھول جائیں۔ میں آپ کی خدمت میں اس سے کہیں زیادہ معاوضہ پیش کروں گا اور اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو اپنے ساتھ ہالی ووڈ لے جاؤں گا۔" ان کی اس پیشکش سے مجھے خوشی ہوئی۔ جلد ہی ایک مناسب جگہ تلاش کرلی گئی اور کیمپ لگا دیا گیا۔ سب کے چہروں پر رونق لوٹ آئی۔ دوسرے روز میں مسٹر آئزک اور دیگر دو افراد کے ساتھ لوکیشنز کی تلاش میں نکلا۔ آدمی کم ہونے کی وجہ سے ہمارا سامان اور سفر نسبتاً آسان ثابت ہوا۔ ہم نے جلد ہی لوکیشن تلاش کرلی۔ شام سے پہلے پہلے ہم نے وہاں شوٹنگ بھی کرڈالی تھی۔ دوسرے دن بھی ہم چاروں ہی دوسری لوکیشن کی تلاش میں نکلے۔ اس روز مطلع صاف تھا اور چاروں طرف سفید برف چمک رہی تھی۔ بعض جگہ چڑھائیاں مشکل تھیں۔ ہم نے کوہ پیمائی کے سامان کی مدد سے ان چٹانوں کو بھی سر کیا اور انوکھی لوکیشن کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ ہمیں یہ احساس بھی نہیں ہوسکا تھا کہ ہم کیمپ سے میلوں دور نکل آئے ہیں۔ ہمیں تجربہ نہیں تھا کہ بعض ضروری اقدامات کے بغیر اس قسم کے پہاڑی راستوں کو یاد رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب موسم نے اچانک تیور بدل دیئے۔ بادل یکایک ہی بلندیوں سے کافی نیچے اتر آئے۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ سرد ہوا میں تیزی آگئی۔ اردگرد پھیلی برف سے ڈھکی ڈھلانیں اب صحیح طور پر دکھائی نہیں دے رہی تھیں اور ہوا ہمارے تمام تر حفاظتی ملبوسات کے باوجود جسم میں سوراخ کئے دے رہی تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد بارش ہونے لگی۔ چند منٹ بعد ہی یہ بارش برف باری میں تبدیل ہوگئی اور برف کے روئی جیسے گالے ہوا میں اڑنے لگے۔ پے در پے تبدیلیوں نے ہمیں بدحواس کردیا رگوں میں خون جمنے لگا تھا۔ گھبراہٹ میں ہم نے فوراً ہی واپسی کا سفر شروع کردیا گو کہ ہمیں سمت وغیرہ کا اندازہ نہیں رہا تھا۔ اگر ہم کہیں پناہ لے کر مطلع صاف ہونے کا انتظار کرتے تب بھی خطرہ ہی تھا کہ طوفان جانے کب تک جاری رہے اور اس وقت تک سردی سے ہماری حالت خراب نہ ہوجائے۔ گرتے پڑتے ہم کافی دور تک چلتے رہے۔ دفعتاً ایک ساتھی نے ہماری توجہ ایک طرف مبذول کرائی۔ ادھر جنگل نظر آرہا تھا یہ اس حقیقت کا ایک واضح ثبوت تھا کہ ہم لوگ راستہ بھول چکے ہیں کیونکہ آتے وقت ہمیں دور دور تک کسی جنگل کا نام ونشان نہیں ملا تھا لیکن اس وقت درختوں کا یہ سلسلہ ہمیں بہت غنیمت محسوس ہوا اور ہم اس کی جانب لپکے۔ درختوں کے درمیان پہنچ کر ہمیں برف کے گالوں اور سرد ہوا کے تھپیڑوں سے نجات مل گئی۔ تاہم جو حالت ہوچکی تھی اس کی بہتری کی کوئی صورت ہمارے سامنے

نہیں تھی۔ اب ہمارے دونوں ساتھی باقاعدہ مسٹر آئزک سے لڑنے لگے تھے اور خاصی بدمزگی پیدا ہوگئی تھی۔ بہرحال ایک بار پھر راستے کی تلاش میں سفر شروع کیا گیا۔ جنگل بھی ڈھلان پر پھیلا ہوا تھا اور یہاں بھی سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ ہم ایک تنگ سی گھاٹی میں داخل ہوئے جس پر بہت ہی گھنے درختوں کا سائبان سا بنا ہوا تھا اور گھاٹی کی زمین تقریباً خشک تھی۔ یہاں ستانے کے لئے رکا جاسکتا تھا ہم میں ویسے بھی اب مزید چلنے کی سکت نہیں تھی پاؤں رکھتے کہیں تھے پڑتے کہیں تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان کافی مقدار میں موجود تھا۔ گھاٹی میں پناہ لے کر ہم نے مخصوص برتنوں سے بسکٹ اور سینڈوچز نکال کر کھائے اور گرم گرم کافی پی تو تب جان میں کچھ جان آئی اور اوسان کسی حد تک بحال ہوگئے۔ اس وقت شام ہوچکی تھی جب درختوں سے گھری اس گھاٹی پر گھپ اندھیرا پھیلتا جارہا تھا۔ پھر نہ جانے کہاں سے گھاٹی میں پانی آنے لگا اور خاصی تیزی سے اس کی سطح اونچی ہونے لگی۔ اب ہمارے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ ہم گھاٹی میں بلندی کی جانب چڑھنے لگیں جس طرف پانی نہیں بڑھ رہا تھا۔ پناہ گاہ سے نکلنا پڑا تو ہمارے دونوں ساتھی ایک بار پھر لڑاکا بلیوں کی طرح مسٹر آئزک پر غرانے لگے۔

"ان تمام مشکلات کے ذمہ دار آپ ہیں مسٹر آئزک' آپ نے تمام خطرات کو سامنے نہیں رکھا۔ کم از کم ایک مقامی باشندے کو ساتھ لے لیا ہوتا اگر وہ ہماری راہنمائی کرسکتا تو ہم راستہ نہ بھٹکتے۔ اگر ہم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا تو اس کا نتیجہ آپ کو بھگتنا پڑے گا۔"

"وہ تو میں بھگت لوں گا۔" مسٹر آئزک نے خشک لہجے میں کہا۔ "فی الحال جان بچانے کی کوشش کرو۔ ورنہ نتیجہ بھگتنے والا باقی نہیں رہے گا۔" کچھ دیر کی بک بک جھک جھک کے بعد ہم نے گھاٹی میں بلندی کی جانب سفر شروع کردیا۔ ہم نے پناہ گاہ سے نکلنے کا فیصلہ بہت مناسب وقت پر کیا تھا۔ اب وہاں اتنا پانی بھر چکا تھا کہ اگر ہم وہاں ہوتے تو ڈوب جاتے۔ گھاٹی کے کنارے اب خود بخود ٹوٹ ٹوٹ کر پانی میں گرنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ پانی میں مینڈک بھی پھدکتے نظر آرہے تھے۔ ہانپتے کانپتے آخر کار ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک بار پھر ہمیں درخت نظر آئے لیکن یہ درخت کچھ چھدرے تھے۔ تاہم برف باری تھم چکی تھی ہم نڈھال ہوکر وہیں چت لیٹ گئے۔ حالت اتنی خراب تھی کہ ایک دوسرے سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اب ہماری دو پارٹیاں بن

چکی تھیں۔ میں مسٹر آئزک کا ساتھی تھا اور ہمارے دوسرے دونوں ساتھیوں نے آپس میں اتحاد کرلیا تھا حالانکہ یہ حماقت تھی ہم سب اتفاقیہ واقعہ کا شکار ہوئے تھے اور اب ہم سب کا ایک ہی مسئلہ تھا کہ کسی طرح کیمپ تک پہنچا جائے۔ پھر آئزک نے اطراف کا جائزہ لیا ہمارے تین طرف پتھریلی چٹانیں تھیں اور ان پر بھی درخت نظر آرہے تھے۔ کچھ درختوں کی شاخیں رسیوں کی طرح لٹک رہی تھیں لیکن ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ میں نے مسٹر آئزک سے مشورہ کیا اور بالآخر کوہ پیمائی کی رسی نکالی۔ حالانکہ کوہ پیمائی کا کوئی تجربہ مجھے نہیں تھا لیکن ایسے حالات میں جان بچانے کی خواہش ہی ہر طرح کا تجربہ کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ کسی نہ کسی طرح میں اوپر پہنچ گیا۔ اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ درخت تو بہت کم رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں ان سے آگے تاحدِ نگاہ سفید برف زار پھیلا ہوا ہے۔ برف دھنی ہوئی روئی کی طرح بکھری ہوئی تھی اور کہیں کہیں ٹھوس برف بھی جھلملا رہی تھی۔ میں نے چیخ کر نیچے کھڑے ہوئے تینوں آدمیوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ مسٹر آئزک سوچ میں ڈوب گئے اور دونوں ساتھیوں کے چہرے کچھ اور بگڑ گئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ پیچھے جانے کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ بالآخر مسٹر آئزک نے فیصلہ کیا کہ اوپر ہی آکر قسمت آزمائی کی جائے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہی وہ دونوں ساتھی بھی اوپر آگئے۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے برف زاروں کو دیکھ کر ان کے چہروں پر وحشت کے آثار گہرے ہوگئے۔ وہ حوصلہ ہار چکے تھے اور انہیں اب شاید اپنی زندگی کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ کوئی اندازہ نہیں ہوپاتا تھا کہ ہمارا کیمپ کس سمت ہے۔ بالآخر تقدیر کا سہارا لے کر ایک طرف چلنا شروع کردیا۔ یہ سفر آسان نہیں تھا۔ کہیں تو پاؤں جیسے ریتلی دلدل میں دھنس جاتے تھے اور کہیں ایسے ڈھلان آجاتے تھے جن پر پاؤں اس طرح پھسلتے تھے گویا شیشے پر صابن کا پانی۔ سب سے زیادہ خطرناک وہ گڑھے تھے جن پر برف کائی کی طرح جمی ہوئی تھی۔ بظاہر ٹھوس نظر آتی لیکن پاؤں پڑتا تو برف کی تہہ ٹوٹ جاتی اور اگر کوئی سنبھلنے میں کامیاب نہ ہوپاتا تو موت یقینی تھی۔ اس کے علاوہ تیز ہوا آنکھوں پر بہت برا اثر ڈال رہی تھی۔ ہم نے جب تک ممکن ہوسکتا تھا سفر کیا اور اس کے بعد ایک جگہ آرام۔ پھر دوسرے دن دوبارہ سفر شروع ہوگیا۔ جیسے جہاں سے چلے ہیں وہیں کھڑے ہوئے ہیں۔

دوسری رات بھی ہم نے برف کے ایک بڑے تودے کی آڑ میں پڑاؤ ڈال لیا۔ رات جوں توں گزارنے کے بعد ہم وہاں سے چل پڑے۔ اب برف میں چھپے ہوئے گڑھوں سے واسطہ ذرا کم ہی پڑ رہا تھا۔ میں تو اب بھی ہمت سے کام لے رہا تھا مگر ہمارے

ساتھی بار بار تھک کر بیٹھ جاتے اور ہمیں ان کا انتظار کرنا پڑتا۔ ایک بار جبکہ وہ ہم سے کافی پیچھے رہ گئے اور بہت ہی سست رفتاری سے آرہے تھے اچانک ہمیں ان کی چیخیں سنائی دیں۔ میں نے اور مسٹر آئزک نے خوفزدہ ہو کر پلٹ کر دیکھا چند لمحے پہلے ہم نے جہاں اپنے ساتھیوں کو دیکھا تھا وہاں بڑا سا شگاف نمودار ہو چکا تھا اور اس شگاف سے پانی ابل رہا تھا۔ مسٹر آئزک نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"آہ میرے دوست فیروز نعمانی مجھے اپنے ان ساتھیوں کو یہیں چھوڑ کر بھاگنا اچھا نہیں لگتا۔ اگر تم میری مدد کرو تو ہم ان کا سراغ لگانے کی کوشش کریں شاید ہم اب بھی ان کی جان بچا سکیں۔"

میں نے مسٹر آئزک سے آمادگی کا اظہار کر دیا ہم نے کچھ رسیاں نکال کر اس طرح جوڑیں کہ ایک کا سرا میری کمر میں اور دوسرا مسٹر آئزک اپنی کمر میں باندھ سکیں۔ ہم نے ٹھوس برف میں کوہ پیمائی والی لمبی کیل گاڑی اور تیسرا سرا اس سے باندھ دیا۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے ہم اس گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے۔ گڑھے پر نظر پڑتے ہی سر چکرا کر رہ گیا۔ معلوم نہیں گڑھے کا پانی ہی سیاہ تھا یا روشنی کا زاویہ کچھ ایسا کہ گڑھا سیاہ پانی سے بھرا ہوا نظر آرہا تھا اور اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ مجھے اور مسٹر آئزک کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اس گڑھے میں دو تو کیا اگر ایک ہزار آدمی بھی گر جائیں تو ان کا پتہ نہ چلے۔ بہت دیر تک ہم اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیتے رہے لیکن پانی کی سرسراہٹ کے سوا کچھ جواب نہ آیا۔

"میں اپنے ساتھیوں کی موت کو کبھی فراموش نہیں کرسکوں گا۔" مسٹر آئزک نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

☆------☆------☆

دن بیتا رات آئی پھر دوسرا دن آگیا۔ ہمارے پاس کھانے پینے کی اشیاء بھی ختم ہو چکی تھیں اور اب ہمارے اطراف میں برف کے ویرانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ہم برف کے اس سمندر پر کیڑوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ کس طرف جا رہے ہیں۔ بالآخر وقت کا احساس بھی ختم ہو گیا اور ہم غیر ارادی انداز سے دھیرے دھیرے بڑھتے رہے۔

نہ جانے کیوں مسٹر آئزک کا چہرہ سرخ ہونے لگا تھا اور سانس کافی تیز چلنے لگا تھا لیکن میرے اصرار کے باوجود اس شخص نے رکنے کی حامی نہ بھری اور یہاں تک کہ ایک جگہ

وہ منہ کے بل نیچے گر پڑا اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے چلتے چلتے کسی کھلونے کی چابی ختم ہو جائے۔ میرے خیال میں اس پر شدید نمونیے کا حملہ ہوا تھا لیکن آخری وقت تک اس شخص نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ میں بہت دیر تک وحشت زدہ اس کے قریب بیٹھا رہا۔ مسٹر آئزک کے بے جان جسم کو میں عجیب نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور اب یہ سرد جہنم تنہا میرے لئے منہ کھولے کھڑا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آخری وقت میں میری نبض ٹٹولنے والا بھی کوئی نہیں ہوگا اس سے بہتر تو یہ تھا کہ میں بھی مسٹر آئزک کے ساتھ مرجاتا۔ مجھ میں اب اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ برف میں گڑھا کھودتا اور مسٹر آئزک کو اس میں دفن کر دیتا۔ نہ جانے کب تک وہاں بیٹھا رہا۔ پھر ان کی لاش کو وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ میرے اندر کا خود غرض انسان یا شاید وہ درندہ کسمسایا جو انسان کی ذات میں چھپا ہوتا ہے یا پھر غرض مندی کہہ سکتی ہو تم اسے۔ میں واپس آیا اور میں نے مسٹر آئزک کے جسم سے ہر وہ چیز اتار لی جو میرے کام آسکتی تھی۔ گرم کپڑے اور ان کے سامان کا تھیلا اور اس کے بعد پھر میں نیم بے ہوشی کی سی کیفیت میں آگے چل دیا۔ پھر پتا نہیں کتنا وقت گزرا میں اس وقت چونکا جب میں نے محسوس کیا کہ اب میں جس حصے میں سفر کر رہا ہوں اس پر بہت دور تک چٹانیں چھت کی طرح جھکی ہوئی ہیں اور یہ حصہ برف سے بھی محفوظ ہے۔ یہاں سردی کا احساس بھی کچھ کم ہو رہا تھا۔ میرے اندر تھوڑی سی قوت پیدا ہو گئی اور میں نے یہ سفر جاری رکھنے کے بجائے کسی پناہ گاہ کی تلاش شروع کر دی جہاں رات گزاری جاسکے۔ پھر مجھے ایک غار کا دہانہ نظر آیا اور میں اس میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دور تک ایک سرنگ میں چلنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک کشادہ ہال جیسی جگہ میں پایا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس ہال کی سنگی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں ان دیواروں پر کسی چمکدار مادے سے عجیب سے نقوش بنے ہوئے تھے اور اس کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ غاروں کا سلسلہ بھی خاصہ طویل معلوم ہوتا تھا عجیب بھول بھلیاں سی تھیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ واپس اسی ہال نما حصے میں پہنچ کر اپنے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کروں لیکن واپسی پر میں راستہ بھول کر ایک ایسے حصے میں پہنچ گیا جو کسی بہت بڑے گنبد سے ملتا جلتا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں ٹھٹک گیا۔ یہاں بہت سے لکڑی کے صندوق رکھے ہوئے تھے اور ان کا رنگ بالکل سیاہ پڑ گیا تھا۔ ان صندوقوں میں قدیم قسم کے تالے لگے ہوئے تھے۔ انسان اگر موت کے قریب بھی ہو تب بھی جذبۂ تجسس کو موت نہیں آتی۔ میں نے ایک چھوٹے سے پتھر سے ایک صندوق کا

تالا توڑ کر اسے دیکھا تو میری آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ وہ صندوق جواہرات اور سونے کے جڑاؤ زیورات سے بھرا ہوا تھا۔ جواہرات کی چمک دمک سے غار روشن ہوگیا تھا۔ وہ یقیناً دنیا کا عظیم الشان خزانہ تھا۔ میری ہمت نہ پڑی کہ میں اور کسی صندوق کو کھول کر دیکھوں۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی اسی طرح جواہرات اور زیورات سے بھرا ہوا ہوگا۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو مِس خاقان' کہ اس خزانے کو دیکھ کر میرے دل میں کوئی لالچ پیدا نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ اس وقت زندگی کی طلب ہر جذبے پر حاوی تھی بس ایک ہی خواہش تھی میری کہ کسی طرح جان بچ جائے۔ سوکھی روٹی کا ایک ٹکڑا اس وقت اس صندوق میں سے نکل آئے تو یقیناً ہزاروں ہیروں سے زیادہ قیمتی ہو۔ بے دلی کے عالم میں' میں نے صندوق کا ڈھکنا بند کردیا اور کچھ دیر اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد بالآخر اسی ہال میں واپس آگیا۔ جہاں دیواروں پر چمکیلی تحریریں موجود تھیں۔ انہی تحریروں کی وجہ سے یا شاید دہانہ قریب ہونے کی وجہ سے یہاں تھوڑی بہت روشنی موجود تھی اور زمین بھی ہموار تھی۔ میں نے ایک تھیلا سامنے رکھا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر اس خوفناک آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوتے ہی میں بدحواس ہوگیا۔ غار کا فرش چھت اور دیواریں لرز رہی تھیں جیسے وہ کوئی چھوٹا سا ڈبا ہو اور کوئی جناتی ہاتھ اسے الٹ پلٹ کرنے لگا ہو۔ کونے کھدروں میں پڑے ہوئے بڑے بڑے پتھر اِدھر اُدھر لڑھک رہے تھے۔ شاید بہت خوفناک زلزلہ آگیا تھا۔ دفعتاً غار کی ایک دیوار میں سوراخ ہوگیا اور نہ جانے کہاں سے اس سوراخ کے راستے تیزی سے پانی غار میں گرنے لگا۔ میں گھبرا کر غار سے نکل آیا۔ ایک تودے کی آڑ میں پناہ لی ہی تھی کہ کہیں سے ایک پتھر ٹوٹ کر میری گُدی سے ٹکرایا اور میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

ہوش آیا تو میں چت لیٹا ہوا تھا لیکن مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا گھور اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میرے سر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن کچھ دیر سر سہلانے کے بعد میں نے سوجانا ہی بہتر سمجھا۔ شاید اس طرح میری قوت کچھ بحال ہوجائے۔ صبح کو میں پھر سفر کا آغاز کرسکوں۔ جلد ہی مجھے دوبارہ نیند آگئی۔ زلزلہ اس وقت تھم چکا تھا۔ دوبارہ آنکھ کھلی تب بھی چاروں طرف اندھیرا ہی پھیلا ہوا تھا۔ خدایا یہ رات اتنی طویل کیسے ہوگئی۔ میں نے سوچا۔ دفعتاً ایک سوال نے میرے جسم میں اذیت کی لہر دوڑا دی جیسے کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ میں نے ہاتھ آنکھوں کے سامنے لہرایا لیکن مجھے اس کا معمولی سا احساس بھی نہ ہوسکا اس کا مطلب یہ تھا کہ میں بینائی کھو چکا ہوں۔ سر کی چوٹ نے مجھے بینائی سے

محروم کردیا تھا۔ میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا پھر میں خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگیا اور گڑگڑا کر دعائیں کرنے لگا۔ "خدایا! مجھے موت دے دے لیکن اندھے پن سے میری موت کو زیادہ اذیت ناک نہ بنا۔"

نہ جانے کتنی دیر میں خدا کے حضور گڑگڑاتا رہا اور کس کس انداز سے رحم کی بھیک مانگتا رہا۔ سجدے سے اٹھنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بے حد پُرسکون محسوس کیا۔ میرے باطن کی آنکھوں میں جیسے بینائی آگئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بے حد پُراعتماد محسوس کیا کچھ دیر بعد میں اٹھا اور سنبھل سنبھل کر چلنے لگا۔ میں حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا تاہم مجھے اب اس خیال سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ میرا کوئی قدم مجھے موت کے منہ میں بھی لے جاسکتا ہے۔ موت کا خوف اب میرے دل سے نکل گیا تھا۔ کبھی کبھی راستوں میں آنے والی رکاوٹوں کو ہاتھوں سے ٹٹولنا پڑتا اور کبھی میری حسیات مجھے بتاتی تھیں کہ میں کس قسم کی جگہوں سے گزر رہا ہوں۔ نشیب و فراز' خشکی اور تری سب ہی کچھ میں عبور کرتا چلا گیا۔ رفتار گو کہ رینگنے کے برابر ہی تھی لیکن سفر بہرحال خیر و عافیت سے ہی جاری رہا۔ مجھے معمولی سی بھی کوئی چوٹ نہیں آئی۔ کب دن ہوا اور کب رات آئی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ دفعتاً مجھے کچھ مانوس سی انسانی آوازیں سنائی دیں جو تیزی سے میرے قریب آتی گئیں۔ بہت سے لوگوں نے بیک وقت مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی تھی۔ مسٹر فیروز نعمانی یہ آپ کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ آپ پر کیا گزری مسٹر آئزک کہاں ہیں دوسرے لوگ کہاں ہیں؟ یہ مجھے خواب کی آوازیں معلوم ہو رہی تھیں۔ مسرت سے میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ کمزوری اتنی ہوگئی تھی کہ میں اس خوشی کی تاب نہیں لاسکا اور نہ جانے میری کیا کیفیت ہوئی۔ بہرطور میں اپنے کیمپ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کیمپ کی تلاش میں میرے تینوں ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔ کچھ دیر آرام کیا گیا۔ میں نے کسی سے بھی اس خزانے کا ذکر نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ذکر سننے کے بعد کیا ہوگا۔ انسان بہت کمزور ہے۔ مِس خاقان' خزانے اُسے دیوانہ بنا دیتے ہیں لیکن درحقیقت کوئی مجھ سے پوچھے کہ دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ کیا ہے۔ بھوکے کو مل جانے والی روٹی کا ایک ٹکڑا۔ بعد کی کہانی میں کوئی اور بات نہیں ہے جو خصوصاً قابلِ ذکر ہو۔ ہم واپس آگئے۔ میری آنکھوں کا آپریشن ہوا اور خدا کی مہربانی سے میری بینائی لوٹ آئی۔ یہ ہے میری زندگی کا ناقابلِ فراموش ایڈونچر۔" کہانی ختم کرکے فیروز نعمانی نے حمیرا خاقان کا چہرہ دیکھا تو وہ چونک کر بولی۔

“خدا کی پناہ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے اس ایڈونچر میں‘ میں بھی آپ کی ہمسفر تھی لیکن مسٹر فیروز نعمانی آپ نے دوبارہ کبھی اس مقام کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی۔”

“سر کی چوٹ نے مجھے بینائی سے محروم کیا تھا محترمہ عقل سے نہیں۔” فیروز نعمانی مسکرا دیا اور حمیرا خاقان ہنس پڑی۔ اس نے کہا۔

“اس خزانے سے آپ کو کوئی دلچسپی نہیں۔”

“جی نہیں.......... میں نے اپنی محنت سے اپنی زندگی کے لئے بہت بڑا خزانہ حاصل کرلیا ہے۔” فیروز نعمانی نے بتایا حمیرا خاقان کی آنکھیں خلا میں کچھ گھور رہی تھیں۔

☆------☆------☆

کہانی حمیرا خاقان کی پسند کے مطابق اور پھر اس کا انداز بیان‘ ایک بہترین کہانی منظرِ عام پر آئی تھی اسے بہت سے حلقوں میں سراہا گیا تھا لیکن حمیرا خاقان خود کسی کہانی سے بہت کم متاثر ہوتی تھی۔ یہ واحد کہانی تھی جس نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔ نہ جانے کس طرح اس نے زندگی کا آغاز کردیا تھا اور نہ جانے کون کون سے مراحل سے گزر کر اس کے اندر یہ خود اعتمادی اور قوت ارادی پیدا ہوئی۔ اس کا طرزِ زندگی بہتر تھا لیکن اندازہ یہ ہوتا تھا کہ بہت سی چیزوں سے محرومی کا احساس ہے اسے اور وہ ان کو حاصل کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس کہانی سے نہ جانے اس نے اپنے ذہن میں کیا کیا خواب بُنے تھے لیکن ان خوابوں کی تکمیل کا راستہ اسے حاتم پاشا نے دکھایا۔ اس دن وہ اپنے گھر میں تنہا تھی اور کسی نئی کہانی کے تانے بانے بُنے جا رہے تھے کہ دروازے کی بیل بجی اور جب دروازہ کھلا تو اسے ایک شناسا چہرہ نظر آیا۔ یادداشت اتنی خراب نہیں تھی کہ حاتم پاشا کو نہ پہچان لیتی۔ حاتم پاشا ترکی کا باشندہ تھا اور مہم جو کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کے بارے میں بہت سے واقعات مختلف ممالک کے اخبارات میں چھپتے رہتے تھے اور اسی بنا پر حمیرا خاقان اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ پھر جب اسے علم ہوا کہ حاتم پاشا اس کے ملک میں آیا ہے تو وہ اس سے انٹرویو کرنے پہنچ گئی اور اس نے حاتم پاشا کا بہترین انٹرویو کیا۔ جسے مہم جوئی کی دنیا سے دلچسپی رکھنے والے ایک رسالے نے بڑے اہتمام سے چھاپا تھا۔ حاتم پاشا کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی۔ حاتم پاشا نے کہا۔

“اور مجھے یقین ہے کہ آپ جیسی خاتون کسی ایک شخصیت کو اگر ایک بار دیکھ لیں تو اسے بھلا نہیں سکتیں۔”

“یقیناً.......... اور اتنا بڑا مہم جو میرے گھر نظر آئے تو میری حیرتوں کا کیا ٹھکانہ۔ براہ کرم تشریف لائیے۔” حاتم پاشا شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ اندر داخل ہوا حمیرا خاقان نے اسے بڑے احترام سے اپنے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور اس کی خاطر مدارات کا بندوبست کیا۔ حاتم پاشا نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

“انسان بے حد خود غرض ہے بے بی.......... اور وہ بے مقصد کسی کے پاس نہیں جاتا۔ یوں سمجھ لو میں بے مقصد تمہارے پاس نہیں آیا۔”

“میں بڑی متجسس ہوں کہ آپ کی آمد کا راز مجھے معلوم ہو۔”

“تمہاری ایک کہانی جو ابھی تازہ ترین چھپی ہے اور جس میں کسی فلمی فوٹوگرافر فیروز نعمانی کے بارے میں تفصیلات ہیں۔”

“جی.......... جی۔”

“بس یوں سمجھ لو وہ کہانی مجھے بہت دور سے کھینچ کر یہاں لے آئی ہے۔ ان دنوں میں ناروے میں تھا اور میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہارے خاندان میں کتنے افراد ہیں۔ تمہارے مسائل کیا ہیں۔ صرف ایک سوال کروں گا تم سے۔ کیا تمہیں کبھی خزانوں سے دلچسپی رہی ہے۔”

حمیرا خاقان نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا اور کہنے لگی۔

“سر‘ خزانے کسے پسند نہیں ہوتے۔”

“تو پھر تم یہ سمجھ لو کہ ہم مل جل کر ایک ایسے خزانے کے حصول کے لئے کوششیں کرسکتے ہیں جو اگر واقعی ہمارے ہاتھ آجائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم دنیا کے دولت مند ترین لوگوں میں شمار ہونے لگیں۔” حمیرا خاقان سوالیہ نگاہوں سے حاتم پاشا کو دیکھنے لگی پھر اس نے کہا۔

“کچھ تفصیل جاننا چاہتی ہوں سر۔”

“اس سے پہلے میں تم سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ زندگی میں جدوجہد کی قائل ہو؟ ایسی کسی مہم کے لئے اپنے آپ کو تیار کرسکتی ہو‘ جس کا اختتام ایک روشن زندگی پر ہو؟”

“کیوں نہیں.......... میرا خیال ہے ہر شخص ایک روشن زندگی ہی کے لئے جیتا ہے۔”

“تو پھر میں تمہیں اس بارے میں تفصیل بتانے سے گریز نہیں کروں گا۔” حاتم

پاشا نے کہا اور حمیرا خاقان حاتم پاشا کا چہرہ دیکھنے لگی۔ چند لمحات سوچتے رہنے کے بعد حاتم پاشا نے کہا۔

”اس کہانی میں میزل بارونا کے بارے میں تفصیلات ہیں اور یہ درج ہے کہ ایک نامعلوم مقام پر ایک عظیم خزانہ پوشیدہ ہے اور اس بارے میں مجھے کچھ معلومات حاصل ہیں۔ سینکڑوں سال پہلے بارونا کی پہاڑیوں میں ایک وسیع ریاست پھیلی ہوئی تھی جس پر میزل خاندان حکومت کرتا چلا آرہا تھا۔ آخری میزل حکمراں ایک بے رحم اور لالچی انسان تھا اس نے اپنے اطراف کے سارے علاقے تباہ و برباد کئے اور ایک عظیم الشان خزانہ جمع کرلیا۔ یہ خزانہ اس نے ان پہاڑیوں میں چھپا کر رکھا اور اس کی شدید حفاظت کرتا رہا۔ اسے خطرہ تھا کہ قرب وجوار کے قبیلے اس کی ہلاکت کی کوشش کریں گے اور ایسا ہی ہوا۔ ان قبیلوں نے اس ظالم حکمراں کے خلاف اتحاد کرکے اس پر حملہ کیا اور اس کا نام ونشان مٹادیا۔ ریاست کی پوری آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی۔ ریاستی خزانہ بھی لوٹ لیا گیا لیکن حملہ آوروں کو وہ خزانہ نہیں مل سکا جس کی کہانیاں مشہور تھیں۔ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے ایک مہم جو مہم جوئی کے دوران ان غاروں تک پہنچ گیا۔ جہاں اسے دیواروں پر چمکدار تحریریں نظر آئیں اسے اس خزانے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور نہ وہ ان تحریروں کو سمجھ سکا لیکن اس نے وہاں تصویریں ضرور بنائیں اور پھر اپنے وطن واپس پہنچنے کے بعد اس نے ان تحریروں کا راز حل کرلیا۔ یہ تحریریں اسی معزول حکمراں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں اور ان میں بتایا گیا تھا کہ خزانہ کہاں موجود ہے۔ اس پچھتاوے سے کہ خزانے کے قریب پہنچ کر وہ اس کے حصول کے بغیر واپس آگیا وہ مہم جو سخت بیمار ہوا اور مرگیا۔ اس نے مرنے سے قبل بڑے افسانوی انداز میں اپنی ڈائری میں اس سلسلے میں تفصیلات لکھی تھیں اور وہ ڈائری تھوڑے عرصے پہلے میرے ہاتھ لگی تھی۔ پوری ڈائری تو اس کی زندگی کے واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن اس کا وہ حصہ میرے لئے باعث دلچسپی تھا اور اس کے بعد جب میں نے اس کی تفصیلات پڑھیں اور پھر تمہاری کہانی تو یوں سمجھ لو کہ میری طلب دو آتشہ ہوگئی اور میں اپنے دل میں اس خزانے کے حصول کا لالچ پیدا ہونے سے نہ روک سکا۔“

”اوہ.......... گویا فیروز نعمانی کی سنائی ہوئی کہانی ایک مکمل حقیقت ہے۔“

”حقیقت.......... سو فیصد حقیقت.......... بس یوں سمجھ لو کہ وہ خزانہ آج

بھی ان پہاڑیوں میں کسی ایسے ہاتھ کا انتظار کررہا ہے جو اس تک پہنچ جائے اور اس وقت میں تمہارے پاس اسی غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ تم اس کے حصول کے لئے کوشش کرو۔ ہم تین افراد مل کر اس خزانے کو حاصل کرسکتے ہیں۔“

”تین؟“

”ہاں۔“

”کون کون؟“

”میں.......... تم.......... اور فوٹوگرافر۔ فیروز نعمانی۔“

”لیکن سر.......... وہ.......... کیسے تیار ہوگا؟“ حمیرا خاقان کے چہرے پر دلچسپی کی جو لکیریں پیدا ہوئی تھیں وہ حاتم پاشا کو مطمئن کررہی تھیں کہ وہ خزانے کے جال میں پوری طرح گرفتار ہوچکی ہے۔ حاتم پاشا نے مخلصانہ انداز میں کہا۔

”بے بی اگر خزانوں کی تاریخ پڑھو تو تمہیں یہ اندازہ ہوجائے گا کہ ان کے حصول کے لئے ہر وہ عمل کرڈالا گیا ہے جو ممکن اور ناممکن ہو چنانچہ تمہیں اس فوٹوگرافر سے گہرے تعلقات قائم کرنے پڑیں گے۔ جس طرح بھی مناسب سمجھو اسے اپنی گرفت میں لو اور اسے مجبور کردو کہ وہ یہ سب کچھ کرے۔ میں یہیں مقیم ہوں میری زندگی کا اولین مقصد خزانے کے حصول کی کوشش ہے اور میں اس وقت تک یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا جب تک کہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوجاؤں گا۔ اس دوران تم سے رابطہ رہے گا اور تم مجھے اطلاع دوگی کہ فیروز نعمانی تمہارے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہوا ہے یا نہیں۔“ حمیرا خاقان کسی سوچ میں گم ہوگئی تھی پھر اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ میں آپ سے تعاون کے لئے تیار ہوں۔“ اور جب حاتم پاشا چلا گیا تو حمیرا خاقان نے فیروز نعمانی کے بارے میں سوچا۔ سفید کنپٹیوں والا یہ شخص اپنے اندر ایک پُراسرار شخصیت رکھتا تھا۔ اسے دیکھ کر ایک کشش کا سا احساس ہوتا تھا۔ اس سے انٹرویو کے دوران بہت سی اہم باتیں بھی ہوئیں۔ حمیرا خاقان نے خاصا غور کیا اور اس کے بعد وہ عمل کرنے کے لئے تیار ہوگئی جو اس سے پہلے اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ دوبارہ فیروز نعمانی سے ملی اور نعمانی اسے دیکھ کر مسکرادیا۔ بہت سی باتیں ہوئیں اور اس کے بعد نئی ملاقات کا فیصلہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ چند ملاقاتوں میں فیروز نعمانی حمیرا خاقان سے متاثر ہوگیا۔ ایک ملاقات پر اس نے

کہا۔

"حمیرا ایک بار تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی اور میں نے کہا تھا کہ مجھے ایک غیر معمولی لڑکی کی تلاش ہے۔"

"مجھے یاد ہے۔"

"تو کیا کوئی غیر معمولی لڑکی کبھی میری زندگی میں نہیں آئے گی۔" فیروز نعمانی نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"نہیں تم میری دوست ہو۔ میرے لئے وہ لڑکی تلاش کرو۔"

"ٹھیک ہے آپ نے یہ بات کہی ہے مسٹر نعمانی تو میں یہ کوشش کروں گی۔" کئی ملاقاتیں ہوئیں اور ایک بار پھر فیروز نعمانی نے حمیرا خاقان کو اپنی ضرورت کے بارے میں بتایا تو اس نے سر جھکا کر کہا۔

"مسٹر فیروز نعمانی درحقیقت میں ایک سچ کا اعتراف کروں گی۔ میں نے آپ کے لئے کبھی کوئی لڑکی تلاش نہیں کی کیونکہ میں خود وہ غیر معمولی لڑکی بننا چاہتی ہوں۔"

"تو پھر انتظار کیوں کیا تم نے اتنے دن۔ میں بھی تمہیں ایک سچ ہی بتا رہا ہوں۔ تمہیں پہلی بار دیکھ کر میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ وہ غیر معمولی لڑکی تم ہو لیکن میں اس خیال سے مغموم ہو جاتا تھا کہ تمہیں پانے کا کوئی ذریعہ میرے پاس نہیں ہے۔" اور اس کے بعد الفاظ کے بند ٹوٹ گئے جو زبان کہنا چاہتی تھی وہ اس نے کہا اور ساری باتیں ایک دوسرے سے کر لی گئیں اور اسی گفتگو کے دوران حمیرا خاقان نے اس خزانے کا تذکرہ کر دیا جس کا حصول اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ فیروز نعمانی نے کہا۔

"نہیں حمیرا......... خزانے عذاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی چمک دمک انسان سے عقل چھین لیتی ہے۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ وہ دور میری زندگی کا کتنا بھیانک دور تھا۔"

"میں زندگی کے ہر چیلنج کو قبول کرنا چاہتی ہوں۔" حمیرا خاقان نے کہا۔

"لیکن میں اس ہستی کو کھونا نہیں چاہتا جو ایک طویل انتظار کے بعد میری زندگی میں آئی ہے۔"

"نہیں فیروز تم......... اس مہم سے انکار کر کے مجھے کھو رہے ہو۔"

"کیا.........؟" فیروز نے حیران لہجے میں پوچھا۔

"ہاں......... ہم عام زندگی نہیں گزارنا چاہتے۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گے تو مجھے دکھ ہوگا۔"

"لیکن کسی مہم جوئی کے لئے میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ہم دو آدمی بھلا اتنا بڑا مسئلہ کیسے حل کر سکیں گے۔"

"تیسرا آدمی میرے علم میں ہے۔"

"کون؟"

"حاتم پاشا۔" حمیرہ خاقان نے حاتم پاشا کے بارے میں ساری تفصیلات فیروز نعمانی کو بتائیں اور فیروز نعمانی گردن جھکا کر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر حاتم پاشا کے ساتھ پہلی میٹنگ ہوئی دوسری اور تیسری میٹنگ ہوئی اور فیروز نعمانی نے یہ بات تسلیم کی کہ حاتم پاشا ایک نفیس انسان ہے۔

اگلی میٹنگ دو دن کے بعد طے پائی اور اس میٹنگ میں ایک چوتھی شخصیت کو بھی شریک کیا گیا۔ یہ ڈاکٹر فرہاد تھے۔ ایک انتہائی مہذب اور شائستہ آدمی۔ ویسے حمیرا خاقان اور فیروز نعمانی پہلے سے ان سے واقف تھے۔ اس چوتھے شخص کو خصوصاً ضرورتوں کے لئے ساتھی بنایا گیا تھا۔ اس کے بعد باقی ساری چیزیں بعد میں طے ہوئیں اور بالآخر تمام تیاریاں حاتم پاشا اور ڈاکٹر فرہاد نے مکمل کیں اور اس کے بعد مہم کا آغاز ہو گیا۔ فیروز نعمانی اس گروہ میں وہ واحد فرد تھا جس کے دل میں خزانے کی کوئی طلب نہیں تھی۔ وہ تو صرف حمیرا خاقان کی محبت کا اسیر تھا اور اسی کے ساتھ بندھا ہوا بلندیوں کی جانب سفر کرنے لگا تھا۔ بارونا کے علاقے میں پہنچ کر مزدوروں کو اکٹھا کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ انہوں نے بارہ مزدوروں کا انتخاب کیا جو بے حد مضبوط اور محنتی معلوم ہوتے تھے۔ البتہ انہوں نے یہاں اپنے آپ کو سائنس دان بتایا تھا جو تجربات کے لئے آلات اور بہت سا سامان تھیلوں میں لے کر بلند چوٹیوں کی جانب روانہ ہو رہے تھے اور وہاں جا کر کچھ سائنسی کام کرنا چاہتے تھے۔ ان تمام تیاریوں کے بعد بالآخر میزل بارونا کی خونریز پہاڑیوں پر چڑھائی کا آغاز ہو گیا۔ بلندی کی طرف اس سفر میں ڈاکٹر فرہاد تو مشقت کی زندگی کا عادی نہیں تھا حمیرا خاقان صرف لڑکی تھی۔ تاہم اسے فیروز نعمانی نے سنبھال رکھا تھا۔ فیروز نعمانی آج بھی اپنے آپ کو پندرہ سال پہلے ہی کی طرح چاق و چوبند اور مستعد محسوس کر رہا تھا اور جہاں تک معاملہ حاتم پاشا کا تھا تو

اسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ پہاڑی بلندیاں اس کے لئے ایک خوبصورت سپاٹ راستہ ہو جس پر چڑھنے میں اسے کوئی دقت ہی نہ محسوس ہوتی ہو۔ بس خاص قسم کے سہاروں کے ساتھ وہ بلندیوں کا سفر طے کر رہے تھے اور مزدور ان کے ساتھ وزنی تھیلے اٹھائے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ پہلے ہفتے کے سفر کے بعد بالآخر ایک دن دوپہر کو فیروز نعمانی ایک جگہ رک گیا اور اچھی طرح گردو پیش کا جائزہ لینے کے بعد بولا۔

"یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم نے آخری کیمپ لگایا تھا۔" اسی مقام پر ایک بار پھر کیمپ لگا دیا گیا۔ کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ حاتم پاشا نے کہا۔

"مسٹر نعمانی آپ نے اپنی داستان میں بتایا تھا کہ مسٹر آئزک گراہم اور آپ بھٹکنے کے بعد کئی دن تک مصروف سفر رہے تھے لیکن آپ کا واپسی کا سفر مختصر تھا اور آپ آسانی سے کیمپ تک پہنچ گئے تھے۔" فیروز نعمانی کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے آہستہ کہا۔

"ہاں مسٹر حاتم پاشا' اتفاق سے میں اس وقت اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ آپ نے اگر میری کہانی بغور پڑھی ہے تو آپ کو علم ہوگا کہ اس وقت میں بینائی سے محروم ہو چکا تھا اور بس یونہی بے دھیانی میں سفر کرتا ہوا واپس کیمپ تک پہنچ گیا تھا۔" حاتم پاشا پُراسرار انداز میں مسکرانے لگا پھر بولا۔

"میں یہی سوچ رہا تھا۔ راستے تلاش کرنے کے لئے ہمیں یہیں سے اپنے سفر کا آغاز کرنا ہوگا لیکن کیمپ اسی جگہ قائم رہنے دیا جائے اور آپ اپنے طور پر کوشش کریں۔" معاملات طے ہوگئے اور اس کے بعد ڈاکٹر فرہاد کو کیمپ میں مزدوروں کے ساتھ نگرانی کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ ویسے بھی وہ مشقت کرنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ البتہ دوسرے معاملات میں وہ ان لوگوں کے بہترین ساتھی تھے۔

حمیرا خاقان ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جنہیں اس نے ایک کہانی کی صورت میں لکھا تھا۔ فیروز نعمانی ان کی رہنمائی کر رہا تھا لیکن چھ دن کے مسلسل سفر کے باوجود ان غاروں تک جانے کا راستہ نہیں مل سکا اور انہیں واپس آنا پڑا تھا۔

"ممکن ہے زلزلے نے علاقے کی شکل بدل دی ہو اور وہ چٹانیں کسی اور طرف

کھسک گئی ہوں۔" ڈاکٹر فرہاد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"کچھ بھی ہو ہمیں یہ تلاش تو جاری رکھنی ہے۔"

"اور اب میں اپنی آخری کوشش اور کرنا چاہتا ہوں۔ مسٹر حاتم پاشا میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان راستوں کو تلاش کروں گا ہو سکتا ہے میری کوئی حس اس سلسلے میں کارآمد رہے۔ آپ لوگوں کو بس میرے سفر میں میری نگرانی کرنا ہوگی کیونکہ میری کہانی میں برف کے ان غاروں کا بھی تذکرہ ہے جس میں مسٹر آئزک کے ساتھی گم ہوگئے تھے۔"

یہ تجویز بھی آخری مراحل سے گزر گئی اور اس کے بعد یہ لوگ پھر سے روانہ ہوگئے۔ ضروری سازوسامان ساتھ لے لیا گیا تھا۔ حاتم پاشا کے ہاتھ میں اس وقت بھی اس کی وہی مخصوص چھڑی موجود تھی جسے وہ اپنے ساتھ ہر لمحہ رکھتا تھا۔ فیروز نعمانی نے حمیرا خاقان کے لئے اپنے آپ کو ایک بار پھر سے نابینا بنا لیا اور اپنی ذہنی قوتوں کے سہارے اس سفر کا آغاز کیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد وہ کچھ نہ کچھ پوچھ لیتا تھا۔ مثلاً کیا یہاں ایک ایسا تودہ موجود ہے جسے تکونا کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہاں سے ایک تنگ سی دراڑ اوپر کو جا رہی ہے؟ کیا میرے آس پاس درخت ہیں؟ اگر اسے جواب اس کی خواہش کے مطابق نہ ملتا تو وہ راستہ بدل لیتا۔ حاتم پاشا اور حمیرا خاقان نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ فیروز نعمانی کے چہرے پر جوش کے آثار نمودار ہوتے جا رہے ہیں۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے کہا۔

"براہ کرم اب بالکل خاموشی اختیار کی جائے اور مجھے مخاطب نہ کیا جائے۔ آپ دونوں جہاں تک بھی ممکن ہو سکے بے آواز میرے ساتھ چلیں۔" حاتم پاشا اور حمیرا خاقان دبے پاؤں اس کے پیچھے چلنے لگے۔ وہ اندھوں ہی کی مانند چل رہا تھا لیکن اس کی ہیجانی کیفیت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کسی کی مدد کے بغیر بہت سے دشوار گزار مقامات سے بھی گزر گیا۔ پھر ایک جگہ وہ بے تابانہ انداز میں تیز تیز چلنے لگا۔ اس کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا اور سانس بہت تیز چل رہی تھی۔ اس نے اندھوں کی طرح چاروں طرف ہاتھ پاؤں چلائے پھر اضطراری انداز میں اپنی آنکھوں سے پٹی کھینچ لی اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہا۔ "کیا آپ ایک مدھم سی سرسراہٹ سن رہے ہیں؟"

دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ "ہاں۔ کہیں دور سے بہت مدھم سی آواز

سنائی تو دے رہی ہے۔"

"میں نے ان غاروں میں یہی آواز واضح طور سے سنی تھی اور میں نے محسوس کیا تھا کہ غاروں کے اوپر شاید کوئی آبشار وغیرہ گزر رہا ہے۔ ہمیں اسی آواز کی سمت بڑھنا ہے۔" شام تک وہ اس آواز کی سمت کو تلاش کرتے رہے لیکن کئی بار انہیں راستے بدلنے پڑے کیونکہ کبھی یہ آواز خاصی واضح ہو جاتی اور کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے بہت دور چلی گئی ہو بالآخر ایک مقام پر پہنچ کر فیروز نعمانی کی صلاحیتوں میں پھر کچھ تبدیلیاں رُونما ہوئیں۔ سرسراہٹ کی آواز یہاں واضح سنائی دے رہی تھی لیکن کوئی نالہ وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی آبشار گرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ چاروں طرف برف کے ویرانے بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"یقیناً مسٹر حاتم پاشا یقیناً اس غار کا دہانہ یہیں کہیں ہونا چاہئے۔ ہو سکتا ہے زلزلے نے اس کی ساخت بدل دی ہو۔ آیئے ذرا برف کے اس انبار کو ہٹا کر دیکھیں۔" وہ ایک جگہ سے برف ہٹانے لگے۔ کافی دیر کے بعد جب وہ مشقت سے چُور ہو کر اپنی کوشش ترک کرنے لگے تھے تو انہیں وہ دہانہ نظر آ گیا۔ بیتابی سے انہوں نے وہ باقی برف اٹھائی اور فیروز نعمانی کے منہ سے لرزتی ہوئی آواز ابھری۔

"یہی ہے۔ خدا کی قسم یہی ہے۔ یہی ہے وہ غار!" تینوں سانس درست کرنے کے لئے دہانے کے قریب بیٹھ گئے۔ بالآخر حاتم پاشا نے کہا۔

"اور اب ہمیں بہت تیزی سے کام کرنا ہوگا۔ اب تم یوں کرو کہ واپس جا کر ڈاکٹر فرہاد اور سارے مزدوروں کو بلا لاؤ۔"

"جی!" نعمانی نے چونک کر حاتم پاشا کو دیکھا اور پھر بولا۔

"لیکن میرا یہاں رہنا ضروری ہے۔ ان لوگوں کو بلا کر لانے کی زحمت آپ ہی کو کرنا ہوگی۔" حاتم پاشا کسی سوچ میں ڈوب گیا پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں ہی چلا جاتا ہوں لیکن سنو میری عدم موجودگی میں تم دونوں غار میں داخل ہونے کی کوشش مت کرنا اور ہاں یہاں کوئی ایسا نشان ضرور باندھ دو جس سے میری واپسی میں بھٹکنے کے امکانات کم ہو جائیں۔"

"اطمینان رکھیں۔ ہم لوگ آپ کا انتظار کریں گے۔"

"اور میں رات کو واپسی کا سفر نہیں کروں گا۔ اب کل ہی آؤں گا میں۔" حاتم پاشا نے کہا اور اس بات پر بھی فیروز نعمانی نے آمادگی کا اظہار کر دیا۔

فیروز نعمانی نے آہستہ سے حمیرا خاقان سے کہا۔

"دیکھا تم نے عدم اعتماد کی فضا پیدا ہو گئی۔ حاتم پاشا کی بدلی ہوئی آنکھوں کا اندازہ لگا سکتی ہو تم۔ یہ خزانہ ایسی ہی چیز ہے حمیرا۔"

"مگر ہمارے دل میں کھوٹ نہیں ہے۔ حاتم پاشا کو ایسا ہونا تو نہیں چاہئے۔"

"ہونا تو بہت کچھ نہیں چاہئے۔ بہرحال دیکھتے ہیں وقت نے کیا کہانی طے کی ہے لیکن حمیرا ایک بات میں تمہیں اس وقت بھی بتاتا ہوں۔ جی چاہے جیسی قسم لے لو۔ مجھے خزانوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں محض تمہاری خواہش پر یہاں چلا آیا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔" حمیرا خاقان نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

رات آہستہ آہستہ گزر گئی۔ صبح سورج کی روشنی پوری طرح پھیلی بھی نہیں تھی کہ حاتم پاشا ڈاکٹر فرہاد اور مزدوروں کو لے کر آ پہنچا۔ مزدوروں کو واپس کیمپ بھجوا دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ ان کی ضرورت ہوگی تو انہیں بلا لیا جائے گا۔ ان کے جانے کے بعد کینوس کے تھیلے خالی کئے گئے۔ دیگر ساز و سامان کا جائزہ لیا گیا اور پھر ناشتا وغیرہ کر کے تازہ دم ہونے کے بعد وہ لوگ غاروں کے اس عظیم الشان سلسلے میں داخل ہو گئے۔ دیواروں پر وہ روشن تحریریں اب بھی اسی طرح چمک رہی تھیں لیکن آگے پہنچ کر فیروز نعمانی نے دیکھا کہ غاروں کی ساخت کافی حد تک بدل گئی تھی۔ پانی اندر اتر آیا تھا اور ان کے راستے سے گزرتا ہوا ایک بڑے سے شگاف میں گر رہا تھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ انہوں نے یہ راستہ عبور کیا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی اس لئے برقی لیمپ روشن کر لئے گئے تھے۔ اس سے آگے سرنگ نما علاقہ تھا جس کی دیواروں سے پتھر نوکیلے خنجروں کی طرح نکل آئے تھے۔ ان سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے وہ اس راستے سے گزرتے گئے۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ ایک وقت میں ایک ہی انسان گزر سکتا تھا۔ جب وہ چاروں اس حصے کو بھی عبور کر چکے تو انہیں احساس ہوا کہ جیسے ان کے لیمپ کچھ زیادہ ہی روشنی دینے لگے ہوں۔ پھر انہیں دوسرا احساس ہوا کہ یہ روشنی لیمپ کی نہیں بلکہ کہیں اور سے آ رہی ہے۔ وہ اسی سمت میں آگے بڑھتے رہے اور کچھ دیر کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو گنبد نما حصے میں پایا۔ حمیرا خاقان کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں کیونکہ ان کے قدموں میں نادر روزگار ہیرے پڑے ہوئے تھے اور انہی کی چمک سے وہ حصہ منور ہو رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ فیروز نعمانی نے جس

صندوق کا تالاتوڑا تھا وہ چٹانوں کی ردوبدل سے ٹوٹ گیا تھا اور زیورات اور جواہرات فرش پر بکھر گئے تھے۔ ان لوگوں پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ دیر تک وہ دیوانگی کے عالم میں کھڑے ان ہیروں کو دیکھتے رہے جو بے قیمت پتھروں کی طرح زمین پر بکھرے پڑے تھے اور پھر یہ دیوانگی عروج پر پہنچ گئی انہوں نے باقی صندوقوں کے تالے بھی توڑ دیئے۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی اور ان کے جسموں میں تشنجی کیفیت نظر آرہی تھی۔ صرف ایک فیروز نعمانی تھا جو پُرسکون کھڑا ہوا ان سب کو دیکھ رہا تھا۔ بالآخر خزانہ انہیں حاصل ہوگیا۔ کینوس کے بڑے بڑے تھیلے موجود تھے اور ان تھیلوں میں خزانے کو بھر کر غار کے دہانے تک پہنچانا انتہائی مشکل کام تھا لیکن دیوانگی ہر کام کی تکمیل کرلیتی ہے اور یہ سب اس کام میں مصروف ہوگئے۔ فیروز نعمانی اپنے طور پر صرف حمیرا خاقان کی ذمہ داریاں پوری کررہا تھا۔

شام ہوچکی تھی اور موسم کے تیور بدل رہے تھے۔ اس لئے وقت سے کچھ پہلے ہی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ تھیلے انہوں نے انتہائی مضبوطی سے بند کرکے دہانے کے قریب رکھے اور وہیں جگہ صاف کرکے اپنے قیام کا بندوبست کیا اس دوران برف باری شروع ہوچکی تھی۔ انہوں نے خشک خوراک سے پیٹ بھرا اور برفانی علاقوں میں شب خوابی کے لئے استعمال ہونے والے تھیلوں میں بند ہوکر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب حاتم پاشا نے اپنے تھیلے کا منہ کھول کر باہر جھانکا برف باری ابھی جاری تھی۔ ڈاکٹر فرہاد کچھ فاصلے پر اپنے تھیلے میں موجود تھا۔ حاتم پاشا آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اس نے اپنا تھیلا ڈاکٹر فرہاد کے تھیلے سے ملالیا۔

"ڈاکٹر مجھے یقین ہے کہ میری طرح تم بھی جاگ رہے ہوگے۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"کیا بات ہے۔" ڈاکٹر فرہاد کے تھیلے سے گھٹی گھٹی سرگوشی ابھری۔

"تم جانتے ہو ڈاکٹر فرہاد کہ میرا اور تمہارا قدیم ساتھ ہے میں تم سے اسی سلسلے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے بہتر موقع ہمیں اور کوئی نہیں ملے گا۔ ان دونوں کو راستے سے ہٹایا جاسکتا ہے۔ یہ شیریں فرہاد کی جوڑی خواہ مخواہ آدھا خزانہ لے جائے گی اور یہ گدھا جس کا نام فیروز نعمانی ہے اور جو صرف ایک فوٹو گرافر ہے اس کے عشق میں پاگل ہوکر اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ شاید تم اس بات پر یقین نہ کرو کہ

میں نے ہی اس لڑکی کو سمجھا بجھا کر اس سے جھوٹی محبت جتانے پر تیار کیا تھا۔ مگر یہ احمق سنجیدگی سے موت کے منہ میں کود پڑا۔ کیا خیال ہے ڈاکٹر فرہاد ہم اس سے چھٹکارا حاصل کیے لیتے ہیں۔ مزدوروں سے کہہ دیں گے کہ کسی حادثے کا شکار ہوگئے۔"
ڈاکٹر فرہاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے تھیلے کے اندر کچھ سوچ میں ڈوب گیا تھا۔

"فیصلہ جلدی کرنا ہے ڈاکٹر اس سے اچھا موقع ملنا مشکل ہے۔" حاتم پاشا بے چینی سے بولا اور ڈاکٹر فرہاد اپنے تھیلے سے باہر نکل آیا حاتم پاشا دہشت سے سکڑ کر رہ گیا تھا کیونکہ تھیلے سے برآمد ہونے والا فیروز نعمانی تھا۔

"آپ غلط تھیلے کے قریب آگئے حاتم پاشا۔ اب ہونا یہ چاہئے کہ آپ کے ارادے سے واقف ہوکر میں خود آپ کو قتل کردوں لیکن آپ نے ایک انکشاف بھی کیا ہے۔ ایک بار پھر میں سچ سننا چاہتا ہوں۔ یہی سچ آپ کو زندگی دے گا ورنہ میں آپ کو قتل کردوں گا۔"

حاتم پاشا کا لہو خشک ہوچکا تھا۔ اس نے نادم لہجے میں کہا۔

"ہاں حمیرا خاقان میرے ایما پر ہی تمہاری طرف متوجہ ہوئی تھی۔"

"شکریہ۔ میں کسی اور کی ذمے داری قبول نہیں کرتا لیکن میں آپ کو اپنے اس خزانے سے دست برداری کی مبارکباد پیش کرتا ہوں اجازت چاہتا ہوں۔" حاتم پاشا کا منہ کھلا اور پھر بند ہوگیا۔ پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فیروز نعمانی کو اپنے سامان کے ساتھ تاریکی میں گم ہوتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے حمیرا اور ڈاکٹر فرہاد کو جھنجھوڑنا شروع کردیا۔ دونوں گھبرا کر تھیلوں سے باہر نکل آئے۔

"فیروز......... نعمانی......... چلا گیا۔" حاتم پاشا نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چلا گیا۔ کہاں؟" حمیرا گھبرا کر بولی اور حاتم پاشا نے پوری کہانی سنادی۔ حمیرا ساکت رہ گئی تھی پھر دیوانہ وار دوڑی لیکن فرہاد اور حاتم نے اسے پکڑ لیا تھا۔ حمیرا خاقان بلک بلک کر رو رہی تھی اور پھر اس نے حاتم پاشا کو پیٹنا شروع کردیا۔

حاتم پاشا نے کہا۔

"لالچ نے مجھے پاگل کردیا تھا مجھ سے غلطی ہوئی ہے تم لوگ مجھے سزا دے سکتے ہو لیکن سزا انہیں صبح کو ملی مزدوروں کا پورا گروہ ان پر ٹوٹ پڑا تھا ان میں ایک لیڈر بن

گیا تھا اور وہ ان سے خزانے کا پتہ پوچھ رہا تھا اور انہوں نے انہیں زخمی کر کے مجبور کر دیا کہ وہ انہیں خزانے تک لے جائیں۔ اس کے بعد خزانے پر انہوں نے قبضہ کر لیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں اب اگر ان کا سایہ بھی دیکھا گیا تو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ زندگی خزانے سے زیادہ قیمتی تھی اور وہ واپس چل پڑے۔

کچھ عرصے کے بعد حمیرا خاقان نعمانی کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئی تو وہ اطمینان سے اپنے کام میں مصروف تھا۔

"مس خاقان۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہئے۔ اب تو آپ اس ملک کی سب سے امیر عورت ہوں گی۔ ویسے اس کا امکان تو نہیں ہے کیونکہ میں لیمز دوروں کو خزانے کے بارے میں بتا دیا تھا۔"

اس خزانے کے نہ ملنے کا مجھے افسوس نہیں لیکن میں ایک بہت بڑا خزانہ کھو چکی ہوں۔ میری زندگی کا یہ بڑا گناہ تم معاف کر سکتے ہو نعمانی۔"

"نہیں مس خاقان۔ کیونکہ میں ایک غیر معمولی انسان ہوں اور آپ ایک معمولی لڑکی۔ وہی کار بنگلہ زیور اور دولت کی خواہش مند۔ سوری اگر مجھ سے کوئی اور کام نہ ہو تو آپ جا سکتی ہیں میں مصروف ہوں۔" وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

☆======ختم شد======☆